6
جلد ششم
کلیات
خواجہ احمد عباس

کلیات خواجہ احمد عباس

(جلد ششم)

ناول

مرتب

ارتضیٰ کریم

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

پہلی اشاعت	:	2017
تعداد	:	550
قیمت	:	-/200 روپئے
قیمت سیٹ	:	-/1935 روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	1965

Kulliyat-e-khwaja Ahmad abbas (Vol.VI)

Compiler: Prof.Irteza Karim

ISBN No :978-93-87510-29-6

Set ISBN: 978-81-934243-9-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن،
دہلی۔110033

اس کتاب کی چھپائی میں 80GSM_Natural Color کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

خواجہ احمد عباس اردو کے اہم اور منفرد ادیب رہے ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے اور مضامین بھی۔ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے فلمیں لکھیں، ڈائریکٹ بھی کیں، کئی اسکرپٹ بھی لکھے علاوہ ازیں مضامین، سفرنامے اور سوانح بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصر ادیبوں میں ان کا قد نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ راقم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ کلیات آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی، دوسری اور تیسری جلد خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں ان کے افسانوی مجموعے 'ایک لڑکی'، 'پاؤں میں پھول'، 'زعفران کے پھول'، 'میں کون ہوں'، 'کہتے ہیں جس کو عشق'، 'گیہوں اور گلاب'، 'دیا جلے ساری رات'، 'نئی دھرتی نئے آسمان'، 'نیلی ساڑی' اور 'سونے چاندی کے بت' کے افسانے شامل ہیں۔

'سونے چاندی کے بت' خواجہ احمد عباس کا دسواں افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں کل نو کہانیاں دس خاکے اور چھ شخصی مضامین شامل ہیں۔ چنانچہ دوسری جلد میں صرف نو کہانیوں کو ہی

شامل کیا گیا ہے۔ خاکے اور مضامین کو آٹھویں جلد میں شریک کیا گیا ہے۔

تیسری جلد میں خواجہ احمد عباس کی وہ انتالیس کہانیاں شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں شریک نہیں ہیں اور پہلی بار کتابی شکل میں سامنے آ رہی ہیں۔ ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ جیسے اس انتخاب میں ایک کہانی ''اچھن کا عاشق'' بھی شامل ہے۔ جو ہندی میں ''شونیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے حوالے سے یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے کئی افسانوں کے عنوان بدل کر ہندی میں بھی شائع کرایا ہے۔ اس ضمن میں ''کولڈ ویو رسرد لہر'' مایا نگری ر پنچھی، پنجرہ اور اڑان، ہاتھ کا میل ر بھکارن، اسپرٹ رلسی، چمتکار رمعجزہ۔ بعض کہانیاں مثلاً ''ہاتھ کا میل'' اور ''بھکارن'' متن کے اعتبار سے بھی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ متن کی یہ تبدیلی آیا خواجہ احمد عباس نے کی ہے یا اردو سے ہندی ترجمہ کرتے وقت یہ آزادی مترجم نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانی ''ہاتھ کا میل ر بھکارن'' اپنے دو مختلف متون کے ساتھ یہاں شریک کر لی گئی ہے۔ تاکہ قارئین کو اس کے اختلاف متن کا اندازہ ہو سکے۔ نیز تحقیق کے طالب علموں کو اس سے کچھ رہنمائی حاصل ہو سکے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلد ان کے ناولوں پر محیط ہے: چار دل چار راہیں، شیشے کی دیواریں، بمبئی رات کی بانہوں میں، اندھیرا اجالا، انقلاب، دو بوند پانی، فاصلہ، تین پہیے، ساحل اور سمندر، چار یار۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ناول ''چار یار'' ماہنامہ بیسویں صدی دہلی میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اب اس شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور ناول جو 'ایک اور پریم کہانی'، 'ساحل اور سمندر'، 'ہیلو مس مالتی' جیسے مختلف عنوان سے بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ ناول بھی پہلی بار اس کلیات میں شامل ہوا ہے۔ ایک جاسوسی ناول جس کی پہلی قسط طبی دنیا دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کلیات میں شریک ہے۔ اس کی وضاحت بھی مقدمے میں کر دی گئی ہے۔

ساتویں جلد سوانح اور سفرنامے پر مشتمل ہے جس میں: مسولینی فاشیت اور جنگ حبش، مولانا محمد علی، خروشچیف کیا چاہتا ہے؟ فلمیں کیسے بنتی ہیں؟ جیسی تحریریں شامل ہیں۔ خواجہ احمد

عباس کے چین، جاپان اور دوسرے ممالک کے سفر کی روداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس سفرنامہ کچھ اس اسلوب میں لکھتے ہیں کہ قاری بھی ان کا شریک سفر ہو جاتا ہے۔

آٹھویں جلد میں ان کے ڈرامے 'زبیدہ'، 'اناس' اور 'ایٹم بم' وغیرہ شامل ہیں۔ کئی ڈراموں کی اشاعت اور اسٹیج ہونے کی خبر بھی اس زمانے کے رسائل اور جرائد میں نظر آتی ہے۔۔ مگر تحقیق کے طالب علم کو اس کی دستیابی میں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ مثلاً ڈراما 'یہ امرت ہے' یا 'پرچم' تک رسائی نہ ہو سکی۔ ''لال گلاب کی واپسی''، بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور اس شکل میں پہلی بار سامنے آرہا ہے۔ ان ڈراموں کے مضامین بھی متنوع رہے ہیں۔ فلمی دنیا سے لے کر ادبی شخصیات پر انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کو بھی اس کلیات میں شامل کرلیا گیا ہے۔

میں یہاں قومی اردو کونسل کے جملہ ممبران اور اراکین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی سبیل پیدا کی۔ ڈاکٹر شمس اقبال جو قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ہیں۔ انھوں نے بطور خاص اس کلیات بلکہ ضخیم کلیات کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ہر چند کہ میں اس کے لیے راضی نہیں تھا کہ یہ کلیات قومی کونسل سے شائع ہو لیکن ان کا یہ اصرار کہ آپ صرف قومی کونسل کے ڈائریکٹر نہیں ہیں بلکہ آپ کی بنیادی حیثیت اردو کے ایک محقق اور تنقید نگار کی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کلیات کی اشاعت کا سب سے زیادہ حق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی محبت کے طفیل کلیات خواجہ احمد عباس کی یہ آٹھ جلدیں آپ کے مطالعے کے لیے حاضر ہیں۔

اگر اس کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی نشان دہی فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں اسے دور کیا جاسکے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

اعتذار

خواجہ احمد عباس اپنے موضوعات، اسلوب اور آہنگ کے باوصف اردو کے منفرد فکشن نگار (افسانہ نگار، ناول نویس، ڈراما نگار) ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ ان کے فکشن کے سرمایے کے تجزیے کے لئے اردو فکشن کی تنقید کو نئے محاورے کی ضرورت پیش آئے گی کیوں کہ ان کا ''سرمایۂ فکشن'' اپنے معاصرین کے فکشن سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔

خواجہ احمد عباس کو اس بات کا احساس تھا کہ:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں

چنانچہ اپنی تخلیقات کے حوالے سے مفتیان اردو ادب یا اپنے نکتہ چینوں کی رائے انہوں نے بار بار نقل کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

''ادیب اور نقاد کہتے ہیں: خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے، ادب کی تخلیق اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ فلم والے کہتے ہیں: اس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومنٹری ہوتے ہیں۔ وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے۔

آرٹ کی تخلیق نہیں۔ اور خواجہ احمد عباس خود کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے: مجھے کچھ کہنا ہے...اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں کبھی بلٹز میں'' آخری صفحہ'' (Last Page) اور '' آزاد قلم'' لکھ کر، کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر، کبھی افسانے کی شکل میں، کبھی ناول کی، کبھی ڈاکومنٹری فلم بنا کر، کبھی دوسروں کی فلموں کی کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر، کبھی کبھی خود اپنی فلم ڈائرکٹ کر کے۔

اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہی ہے کہ انسان کی اندرونی زندگی، اس کے ذاتی نفسیاتی مسائل اور اس کی بیرونی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے جو کچھ دنیا میں اس کے اپنے ملک اور اس کے سماج میں ہوتا ہے، اس کا اثر اس کے اپنے کردار پر اور اس کے افعال پر پڑتا ہے، جیسے جیسے دنیا، سماج، ملک کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اسی طرح انسان بھی بدلتے رہتے ہیں۔''

(خواجہ احمد عباس نمبر، ایوان اردو دہلی، دسمبر 1987ء، ص:66)

خواجہ احمد عباس کی تحریریں اور تخلیقات، عوامی ادب کا بہترین اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ عوامی ادب، ممکن ہے ادب عالیہ کا حصہ کبھی نہ بنے لیکن ادب عالیہ کو حیات بخشنے، اسے اعتبار اور اعتماد بخشنے میں اس کا اساسی کردار ہوتا ہے۔ عوامی ادب نہ ہو تو ادب عالیہ کے سوتے خشک پڑ جائیں گے۔ کمال یہ ہے کہ عوامی ادب اگر لامحدود ہوتا ہے تو ادب عالیہ کے قارئین بہت محدود بلکہ مخصوص ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر بھی سماج کی تبدیلی اور تعمیر میں بہت کم ہوتا ہے۔

میر نے کہا بھی ہے کہ:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

خواجہ احمد عباس بھی عوام سے ہو کر خواص تک اپنی بات پہنچانا چاہتے تھے اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے—

خواجہ احمد عباس نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں، جتنا لکھا ہے ان کو پڑھنے کے لئے وقت

درکار ہے۔ پھر یہ لکھنا اگر محض قلم سے لکھنا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضامین، تبصرے، کالم، خاکے کے علاوہ سیلولائڈ، گویا قلم سے کام نہ بنا، یا مطمئن نہ ہوئے تو "فلم" کا سہارا لیا۔ غالب کو تو صرف غزل ہی سے شکایت تھی۔

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مگر خواجہ احمد عباس کاغذ اور قلم پر بھی قناعت نہ کر سکے اور سماج کی تنگی دامانی کے علاج کے لئے "اظہار کے مختلف پیرائے" کا سہارا لیا۔ خواجہ احمد عباس کی ادبی فتوحات کے اتنے رنگ ہیں کہ کسی ایک مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر اجمالاً تو کیا مفصل گفتگو بھی ممکن نہیں ہے۔ تادم تحریر خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی قلمی اور فلمی خدمات کا ایماندارانہ جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے۔ ان پر لکھی جانے والی زیادہ تر کتابیں تشنہ ہیں۔

●

خواجہ احمد عباس جو ایک متوسط طبقے کے ہر نوجوان کی طرح پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے اور خود ان کے والدین کی بھی یہی خواہش اور کوشش تھی۔ لیکن علی گڑھ میں ان کے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین کی ایک تقریر نے ان کے نہ صرف زاویہ نظر کو بدل دیا بلکہ زندگی کا رخ بھی موڑ دیا۔ انھوں نے اسی پل یہ فیصلہ لے لیا کہ انھیں اپنے بھائی جان کی طرح صحافی ہی بننا ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ہی الفاظ ہیں:

> "1925 کا ذکر ہے... کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام، ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے، اپنی سیاسی تنظیم علاحدہ نہیں کرنی چاہیے۔" یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی... اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ

دیا.. اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا... اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔"

(غبارِ کارواں، آجکل جولائی 1971)

یہ ایک طویل مضمون کا حصہ ہے جسے میں نے ادھر اُدھر سے حذف کر کے آپ کے سامنے اس لیے رکھا ہے کہ میری بات کو تقویت ملے۔ کوئی چاہے تو تفصیل کے لیے ان کی انگریزی میں موجود سوانح "I am not an Island" سے بھی رجوع کر سکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے زمانہ طالب علمی میں ہی علی گڑھ سے ہی ایک اخبار Aligarh Opinion کے نام سے جاری کیا، جسے آج بھی کسی یونی ورسٹی کے طالب علموں کا پہلا ہفتہ وار اخبار کہا جا سکتا ہے۔ Aligarh Opinion نکالنے کی پاداش میں اس زمانے کے نائب شیخ الجامعہ نے انھیں یونی ورسٹی سے اخراج کی دھمکی بھی دی تھی۔ مگر اقبال کے اس شعر:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے، بہت اونچا، حد پرواز سے

کے مصداق دوران تعلیم ہی انھوں نے 'ہندوستان ٹائمز' اور 'بمبئی کرانیکل' کے لیے نامہ نگار کی خدمات انجام دیں۔ بی اے کے فوراً بعد دہلی کے ایک اخبار 'National Call' کے دفتر میں تین مہینے بحیثیت کارآموز (apprentice) کام کیا۔ خواجہ احمد عباس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

Let me record here that three months period in the
'National Call' really made me into a journalist

(I am not an Island: P 72)

خواجہ احمد عباس بنیادی طور پر ایک صحافی تھے مگر ایک ایسے صحافی جو باکردار تھے، جو کسی کے استحصال یا کسی کو استعمال کرنے کے پیش نظر قلم نہیں اٹھاتے تھے بلکہ حق اور سچائی کی آواز بلند کرنے کے لیے، نہایت بے باک انداز میں اپنی بات کہتے تھے۔ صحافت کے راستے سے ہی وہ فلم کی دنیا میں داخل ہوئے تھے، یعنی پہلے پہل وہ فلم پر تبصرہ لکھتے تھے اور اپنی بے باک رائے کی بنیاد پر ہی انھوں نے 'فلم مبصر' کا ایک معتبر مقام حاصل کر لیا تھا۔ قلم سے فلم تک کا ان کا سفر نہایت دلچسپ رہا ہے۔ وہ خود یہ بات کہتے تھے کہ میں نے اپنا سفر دو نقطے سے شروع کیا تھا اور 'ایک

نقطے پر مکمل کیا۔ اگر چہ اس میں ان کو مالی اعتبار سے نقصان ہی اٹھانا پڑا، لیکن ان کی تشفی اس امر میں تھی کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ صحافت اور فلم میں کچھ وصف قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے یعنی دونوں کا سروکار ہمارا عصری سماج، ہمارا اپنا زمانہ ہوتا ہے، نیز دونوں کی رسائی عام انسان تک ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کی تحریروں کا تعلق اسی لیے عام سماج کے عام آدمی سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد حیات بھی یہی تھا کہ ان کی بات، ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، اس حوالے سے ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی— بلٹز کا آزاد قلم/ رجحان ساز اور عہد ساز کالم کہا جاسکتا ہے— 'بلٹز' سے زیادہ قارئین کو اس کے آخری صفحے پر شائع کالم' آزاد قلم' کا انتظار رہتا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ کہتی ہے کہ کالم نگاری کے حوالے سے یہ سب سے طویل عرصے تک لکھا جانے والا کالم تھا۔ 'بلٹز' میں انھوں نے کم وبیش 40 برسوں تک 'آزاد قلم' لکھا اور انھوں نے بہ وقت تقرری ہی یہ بات انتظامیہ کے پیش نظر رکھ دی تھی کہ وہ اپنے نظر اور نظریے کے اعتبار سے جو کچھ لکھیں گے، اسے بلٹز من وعن شائع کرے گا، کسی طرح کی کتر بیونت نہیں ہوگی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ معاوضہ تو کم ہوسکتا ہے مگر میری یہ شرط باقی رہے گی۔ چنانچہ پوری زندگی وہ ملک میں رہے ہوں یا ملک سے باہر— بلٹز کے لیے' آزاد قلم' کا لکھنا، کبھی نہیں بھولے۔ راج نرائن راز جو شاعر بھی تھے اور آجکل کے مدیر بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جب ہفتہ وار اردو بلٹز جاری ہوا، تو وہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے لکھنے لگے۔ آزاد قلم کا آخری صفحہ بلٹز کے لاسٹ پیج کا ترجمہ نہیں بلکہ جداگانہ کالم ہوا کرتا تھا، ہندی اور اردو میں آزاد قلم کا کالم محض چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ زبان بیشتر سہل ہوا کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ میں: ''گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں جو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اور راجستھان میں پڑھے اور سمجھے جاتے تھے گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔''

لاسٹ پیج، صحافت کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ 39 برس تک ایک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دنیائے صحافت کا سب سے

زیادہ عرصے تک شائع ہونے والا کالم ہے اور شاید یہی بات آزاد قلم کے آخری صفحے
کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔۔۔"

(خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار، ص 230)

یہاں مجھے صرف ایک اضافہ کرنا ہے کہ شاید نہیں بلکہ یقیناً 'آزاد قلم' اردو صحافت کی تاریخ میں لکھا جانے والا 'طویل العمر' یا طویل مدتی کالم ہے۔

بلٹز کے 'آزاد قلم' کا آج اگر تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو کچھ دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ 'آزاد قلم' کا موضوع بالکل آزاد ہوتا تھا۔۔۔ خواجہ احمد عباس نہایت آزادانہ طور پر قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ادبی اور لسانی موضوعات پر بے باکانہ اسلوب میں اظہار خیال کرتے تھے۔ دوسرا اہم پہلو 'آزاد قلم' کا یہ تھا کہ اس کے صفحے کے بائیں ہاتھ کے کونے پر کبھی کسی فلمی ہیرو، ہیروئین یا ادیب کی تصویر ہوتی تھی، اور اس تصویر کے ساتھ کوئی شعر یا کوئی اطلاع ہوتی تھی مثال کے طور پر 'قاضی سلیم' کی تصویر کے ساتھ یہ شعر:

ہر قدم پر لٹا کر متاعِ نظر
میں نے گھر گھر سے آنسو اکٹھے کیے

منفرد شاعر قاضی سلیم جو اب ممبر پارلیامنٹ بھی بن گئے، درج ہے۔"

(بلٹز، 12 جنوری 1980)

پرویز شاہدی کی تصویر کے ذیل میں یہ عبارت درج ہے:

"رقص حیات اور تثلیث حیات کے خالق، جن کی شاعری میں مخدوم اور جاں نثار اختر کی طرح تخلیقی صلاحیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔"

(بلٹز، 10 مئی 1980)

بلٹز کے آزاد قلم کا مطالعہ ہمارے سامنے ہندوستان کے عوامی اور عام مسائل کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے اس عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ملی اور ادبی صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے یہاں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی نیز معلومات عامہ پر ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ یہاں بلٹز کے 'آزاد قلم' کے چند

عناوین بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کرتا ہوں کہ لفافے سے بھی مضمون تک پہنچا جاسکتا ہے:

''کیا کوئی کلچر اور زبان مرسکتی ہے؟''

(بلٹز10 مئی 1980)

''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: گاندھی جی کے ساتھی مظہر الحق''

(بلٹز24 مئی 1980)

''حیدر آباد کا 'شہر اور سپنا' کب بسایا جائے گا؟

کہاں بسایا جائے گا؟

''کیا اسمبلیوں کے چناؤ دوبارہ ہوں گے''

(بلٹز، 31 مئی 1980)

''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

(بلٹز، 27 مارچ 1965)

''روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ!''

(بلٹز، 17 فروری 1965)

سامراج، سوراج، کامراج، رام راج؟

(بلٹز، 21 فروری 1963)

''رہتا ہے دل وطن میں!''

(بلٹز، 8 فروری 1964)

جھوٹا سچ یا سچا جھوٹ

(بلٹز، 11 مارچ 1964)

''نئی سیتا، نئی زلیخا، نئی مریم''

(بلٹز، 14 مارچ 1964)

ایسے کئی مضمون کے عنوان یہاں نقل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر آخری عنوان سے لکھے جانے والے کالم کی چند سطریں، آپ ملاحظہ فرمائیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کیا 1964 کے

ہندوستان اور 2014 کے ہندوستان کی تصویر بدلی ہے؟؟ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

''آج وہ سب باہر نکل آئی تھیں اور بمبئی کی سڑکوں پر کندھے سے کندھا ملا کر مارچ کر رہی تھیں۔

سیتا، ساوتری، عائشہ، خدیجہ، میری

سلمہ، سوبنی، جولیٹ، پدمنی

لیلیٰ، لیلا، للّی

موہنی، محمودہ، مارگریٹ

ملوں میں کام کرنے والی نوگز کی ساڑی پہننے والی مہاراشٹری عورتیں...

دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں، اسٹینوگرافر، ٹائپسٹ گرلز، کلرک، پلاسٹک کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں۔

دواؤں کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں، بیڑی بنانے والیاں، بسکٹ بنانے والیاں...

ساڑیاں، فراک، شلوار، لمبی چوٹیاں، کٹے ہوئے بال۔ کسی کے ماتھے پر بندی، کسی کے ہونٹوں پر لپ اسٹک، کسی کے ہاتھوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں، کسی کی انگلی پر شادی یا منگنی کی انگوٹھی، کسی کی گود میں بچہ، مگر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک انقلابی سرخ پھریرا— ہر ایک کے دل میں ایک نئی امنگ، ایک نیا جوش، ہر ایک کی زبان پر ہندوستان کی کام کرنے والی نئی عورتوں کے نعرے—

''مہنگائی کا خاتمہ کرو!

کام کرنے والی عورتوں کو برابر کے حقوق دو

چولہا جلانے والی گیس کی قیمت کم کرو، تیل کی کمپنیوں کو عوام کی ملکیت بناؤ،

کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بال گھر Creche بناؤ—

شادی شدہ کام کرنے والیوں پر سے پابندیاں ہٹاؤ۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کی فکر کیا تھی؟ ان کے

تیور کیا تھے؟ ان کی نگاہ کتنی دوررس تھی؟ وہ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظرنامے پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے؟ دراصل خواجہ احمد عباس اپنے انھیں موضوعات اور اسلوب کے اسی بے باکانہ انداز کی بنیاد پر صحافت اور ادب کی تاریخ میں ایک الگ عنوان کے تحت یاد کیے جاتے رہیں گے۔

افسانہ

خواجہ احمد عباس کا پہلا افسانہ 'ابابیل' تھا، (اس افسانے کی سنہ اشاعت کے سلسلے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ راقم السطور نے اسی لیے رسالہ جامعہ کے مشمولات کا عکسی صفحہ پہلی جلد میں شامل کر دیا ہے تاکہ کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔) گویا یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ تادم تحریر حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے کل کتنے افسانے لکھے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً سوا سو کہانیاں ہونی چاہئیں۔ لیکن ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد دس ہی ہے۔ بقیہ افسانوی مجموعے انہیں دس مجموعوں کی بنیاد پر اردو کے پبلشرز اپنے اپنے طور پر تیار کرتے رہے اور بازار میں لاتے رہے، جنہیں جعلی ایڈیشن بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان مجموعوں میں بھی بعض افسانے اشاعت مکرر کی حیثیت رکھتے ہیں، کچھ میں کہانیوں کے علاوہ خاکے، مضامین اور دیگر نوعیت کی تحریریں بھی شریک کردی گئی ہیں۔ اس سے ہمارے ناقدین کو مغالطہ بھی ہوا ہے کہ وہ ان کے بعض مضامین کو افسانہ تصور کرتے ہوئے افسانے کے زمرے میں شریک کر لیتے ہیں۔ رام لعل نے اپنی کتاب ''خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے'' میں ''آئینہ خانہ میں'' کو افسانے کے زمرے میں شامل کردیا ہے۔ یہی سہو پروفیسر صغریٰ مہدی کی مرتبہ کتاب ''اگر مجھ سے ملنا ہے'' (خواجہ احمد عباس کے افسانے) میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ افسانہ نہیں بلکہ مضمون ہے۔ 'آئینہ خانہ میں' ادبی تحریر کا ایسا سلسلہ ہے۔ جس کے تحت ماہنامہ ''افکار'' کراچی میں کرشن چندر، بیدی، اور دوسرے قلم کاروں نے اپنی شخصیت اور فکر و فن پر خود روشنی ڈالی تھی۔ خواجہ احمد عباس کا یہ سوانحی مضمون افکار (دسمبر 1963ء) میں شائع ہوا تھا۔

ان کے بعض افسانوں کو عنوانات بدل بدل کر بھی شائع کیا گیا ہے۔ الف لیلیٰ 1956/الف لیلیٰ 1980، الف لیلیٰ 1952، مسوری 1952/مسوری 1953، پنجرہ/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، آج کے

لیلیٰ مجنوں ربیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں، اجنتا راجنتا کی اُور، کیپٹن سلمٰی ربھوپال کی کیپٹن سلمٰی، ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام ربچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام، رفیق رمیجر رفیق مارا گیا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایسے کچھ افسانے بھی ہیں جو کسی مجموعے میں نہیں ملتے بلکہ اردو رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔

اردو کی طرح ہندی والوں نے بھی خواجہ احمد عباس کی تحریروں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ جس پبلشر نے جیسے مناسب سمجھا، ان کی کہانیوں اور ناولوں کو شائع کیا اور اپنی تجارت کو فروغ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی اور ہے کہ خواجہ احمد عباس کی تحریریں اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کی بنیاد پر عوام میں خوب مقبول ہیں اور تھیں۔ اردو کی کہانیوں کا اگر سخت سے سخت انتخاب بھی کیا جائے تو خواجہ احمد عباس کی کہانیاں ان میں جگہ بنالیں گی۔ ان کے افسانوں کے انفراد پر آئندہ سطور میں گفتگو ہوگی۔ سردست ان کے افسانوں کے مجموعوں کی تفصیل حاضر ہے۔

پہلا افسانہ '**ابابیل**' رسالہ: جامعہ، جلد 26، شمارہ 6 جون 1936

ایک: پہلا افسانوی مجموعہ: **ایک لڑکی** (1942)

مشمولات: (1) فیصلہ (2) ایک لڑکی (3) سرکشی (4) ناگن (5) پہلا پتھر (6) ابابیل (7) تین عورتیں (8) داروغا اور لڑکی (9) معمار (10) رادھا۔

دو: پاؤں میں پھول (1948)

مشمولات: (1) پاؤں میں پھول (2) چڑھاؤ اتار (3) بارہ گھنٹے (4) ایک پائلی چاول (5) ماں (6) آزادی کا دن (7) میں اور وہ (8) موت کی شکست۔

نوٹ: تعارف کے طور پر کرشن چندر کی تحریر شامل ہے۔

تین: زعفران کے پھول: (مارچ۔1948) کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی

مشمولات: (1) زعفران کے پھول (2) اجنتا (3) اندھیرا اور اجالا۔

چار: میں کون ہوں، (1949)، نو ہند پبلشرز لمیٹڈ، ممبئی۔

مشمولات: (1) چڑیا چڑے کی کہانی (2) دھوئیں کی زنجیر (3) جاگتے رہو (4) رفیق

(5) میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی (6) میرے بچے (7) میری موت (8) ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام (9) انتقام (10) شاعر کی آواز (11) میں کون ہوں؟

نوٹ: کہانی کی کہانی کے عنوان سے ایک مضمون بھی شامل ہے۔

پانچ: کہتے ہیں جس کو عشق، (1953)، پروین بک ڈپو، الہ آباد۔

مشمولات: (1) کہتے ہیں جس کو عشق (2) شکر اللہ کا (3) مسوری 1952

چھ: گیہوں اور گلاب، (1955)، ایشیا پبلشرز، دلی۔

مشمولات: (1) گیہوں اور گلاب (2) میرا بیٹا میرا دشمن (3) آسمانی تلوار (4) لال پیلا (5) نئی برسات (6) معجزہ (7) مونتاژ۔

سات: دیا جلے ساری رات، (1959)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی۔

مشمولات: (1) دیا جلے ساری رات (2) روپے آنے پائی (3) چراغ تلے اندھیرا (4) بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام (5) کچی کچی (6) تین تصویریں (7) ڈیڈ لیٹر (8) الف لیلیٰ 1956۔

نوٹ: اس مجموعے میں کرشن چندر کی یہ تحریر بھی شامل ہے: کرشن چندر اور احمد عباس کا آپس کا مقدمہ۔

آٹھ: نئی دھرتی نئے انسان، (1977)، مکتبہ جامعہ، دہلی۔

مشمولات: (1) نیا شوالہ (2) ہنومان جی کا ہاتھ (3) سبز موٹر کار (4) ٹڈی (5) بھولی (6) نئی جنگ (7) تین بھنگی (8) پانی کی پھانسی (9) تیسرا دریا (10) سونے کی چار چوڑیاں (11) یہ بھی تاج محل (12) میری لین کی پتلون (13) چٹان اور سپنا (14) خزانہ (15) دو ہاتھ (16) ایک لڑکی۔ سات دیوانے۔

نوٹ: اس مجموعے میں ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے ایک تحریر شامل ہے۔

نو: نیلی ساڑی، دسمبر (1982)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔

مشمولات: (1) ایک کہانی کا سوال ہے (2) تین مائیں ایک بچہ (3) سردی گرمی (4) بھوک (5) فین (6) نیا انتقام (7) نیلی ساری۔

دس: سونے چاندی کے بت، (1986)، کلاسیک انٹرنیشنل، بمبئی۔

اس کتاب میں فلمی شخصیات پر دس خاکے اور چھ ایسے مضامین شامل ہیں جن کا تعلق فلمی دنیا سے ہے ان کے علاوہ درج ذیل نو کہانیاں شریک کتاب ہیں۔

(1) ماں کا دل (2) فلمی شگون (3) پرنیتا کماری کے پان (4) دو پرچھائیاں (5) کایا کلپ (6) الجھن کا عاشق (7) رین مشین (8) ایک لڑکی تین چہرے (9) ایکٹریس۔

ان کے علاوہ جو افسانوی مجموعے ہیں انہیں مندرجہ بالا افسانوی مجموعوں کا BY PRODUCT کہا جانا چاہئے۔ الّا یہ کہ کسی نے کسی رسالے میں شائع شدہ کوئی افسانہ شریک کر دیا ہو۔ چند مجموعے جو درج ذیل عنوانات سے شائع ہوئے ہیں:

(1) پیرس کی ایک شام (2) بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں (3) چراغ تلے (4) اداس دیواریں (5) پھول اور دوسری کہانیاں (6) اندھیرا اجالا (7) اگر مجھ سے ملنا ہے (مرتبہ: صغریٰ مہدی) (8) خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے (مرتبہ: رام لال)

خواجہ احمد عباس کو میں ''اسکرین پلے فکشن نگار'' تصور کرتا ہوں۔ اپنے خیال کو تقویت بخشنے اور آپ کو مطمئن کرنے کی خاطر ان کی ہی تحریر حاضر ہے۔

> امر، جو کنٹرکٹر کا کلرک تھا، روپے کی گنتی کر رہا تھا۔ پھر گوپال کے اوور ٹائم کے روپے دیتے ہوئے، ذرا تعجب ظاہر کرتے ہوئے بولا، 'ارے بھائی، تم اتنی سخت محنت کیوں کرتے ہو؟'
>
> ''امر بھیا، ساری محنت میں اس لیے کرتا ہوں کیونکہ میں امیر آدمی کا بیٹا نہیں ہوں لیکن مجھے غریبوں جیسی زندگی گزارنا اچھا نہیں لگتا۔ آج میں نے اُوور ٹائم اس لیے کیا ہے کہ 'سیلر بوائے' بار اور نائٹ کلب میں پینے کا مزا لینا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ حساب کتاب کا رجسٹر پھینکو اور مزے اڑاؤ۔ میں کہتا ہوں تم ایک بار بھی روزی کو دیکھ لوگے تو تمھارے جیسا دھرماتما بھی پھسل پڑے گا۔''

اس سلسلے میں ایک دو مثالیں اور بھی ان کے ہی ناول/افسانے سے پیش کی جا سکتی ہیں:

''.....آؤ میں تمہاری قمیض کو سی دوں گی۔ روزی ناچ گانے کے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے سے سوئی دھاگا اٹھاتی ہے اور گوپال کی پھٹی ہوئی قمیض کو سینے لگتی ہے......''

یہاں کہانی جس اسلوب میں بڑھائی جا رہی ہے وہ واضح طور پر ''اسکرین پلے'' سے قربت رکھتا ہے۔

ناول

(1) چار دل چار راہیں (2) شیشے کی دیواریں (3) بمبئی رات کی بانہوں میں (4) اندھیرا اجالا (5) انقلاب (6) دو بوند پانی (7) فاصلہ (8) تین پیسے (9) ساحل اور سمندر (10) چار یار۔

تاریخی ترتیب سے ''چار دل چار راہیں'' جسے کتابستان الہ آباد نے 1959 میں شائع کیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ناول ''انقلاب'' جو بوجوہ نیا سنسار بمبئی سے 1975 میں شائع ہوا۔ ناول کے سلسلے سے اسے پہلی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خود انہوں نے اپنے کئی مضامین میں اردو میں اس کے تاخیر سے چھپنے کی وجہ بتائی ہے۔ آجکل اپریل 1985 کے شمارے میں ''من کہ......'' کے تحت انہوں نے لکھا ہے:

> ''سب سے مشہور ناول اردو میں ''انقلاب'' تھا، جس کو پندرہ برس کے بعد جب اس کا روسی ایڈیشن ''سن آف انڈیا'' (فرزند ہند) کے نام سے 90000 کی تعداد میں بک گیا، تب بھی جب کوئی پبلشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کو تیار نہیں تھا، تب میں نے خود گیارہ سو کی تعداد میں اس کو اپنے خرچ سے چھاپا اور بیچنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے اجرا کی رسم اپنے ہی گھر پر کی۔ کوئی پچاس ساٹھ اردو کے ادیب، ایڈیٹر، شاعر، جرنلسٹ وغیرہ اکٹھے کیے۔ ہر ایک کو تحفتاً ایک ایک جلد دی۔ امید تھی کہ کچھ تو ان میں سے کچھ ''اچھا یا برا اس کے بارے میں لکھیں گے، مگر جب وہ لوگ لنچ کھا کر میرے گھر سے رخصت ہوئے تو (اس واقعہ کو سات برس گزر چکے ہیں) آج تک کوئی ریویو بھی کسی نے نہیں لکھا۔ میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اردو میں زیادہ ناول کیوں نہیں چھپتے۔''

میں خواجہ احمد عباس کی تحریروں کی تلاش کر ہی رہا تھا کہ اس درمیان ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا ایک مضمون ''جوالا مکھی'': خواجہ احمد عباس کا گم شدہ ناول' 'ایوان اردو' دہلی کے فروری 2015 کے شمارے میں منظرِ عام پر آیا۔ جس سے ایک نئی حقیقت سامنے آئی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ خواجہ احمد عباس کی پہلی کہانی اگر 1936 میں شائع ہوئی تو ان کی ناول نگاری کا سفر بھی اسی سال شروع ہوتا ہے۔ میں یہاں مذکورہ مضمون کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں تا کہ صورت حال سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہوا جا سکے۔ یحییٰ نشیط لکھتے ہیں:

> میرے پیشِ نظر اس وقت ''طبی دنیا'' دہلی کا ستمبر 1963ء کا ایک شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ نمبر 11 سے 61 تک خواجہ احمد عباس کے ناول کی پہلی قسط طبی دنیا کے مدیر نے اپنی رائے کے ساتھ شائع کی ہے۔ مدیر کی رائے حسب ذیل ہے۔
>
> ''ایک پر اسرار ناول جو ''طبی دنیا'' میں ہر ماہ قسط وار شائع ہوگا۔
>
> ''ہم اپنے نوجوان عزیز خواجہ احمد عباس کے شکر گزار اور دعا گو ہیں کہ ''طبی دنیا'' میں ادبی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ہمیں اپنا یہ پہلا شاہکار بھیجا۔ عزیز موصوف ایک ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ مغربی علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ملازمت کی پابندیوں کے حوالے نہیں کیا، جس میں ان کے لیے زندگی کی کامیابیوں کا ایسا میدان تھا، جو ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے شاید کسی ایک ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کے خدا داد ادبی ذوق اور شوقِ مطالعہ اور قابلِ قدر جذبۂ ایثار نے ان کے سامنے جو راہِ خدمت پیش کی، انھوں نے اسے اختیار کر لیا۔ آسمانِ صحافت پر یہ ایک نئی صبح کا ظہور ہوا ہے اور خدا نے چاہا تو لوگ دیکھیں گے کہ مولانا حالؔی کے مطلع خاندان سے ان کے بعد ایک اور روشن تارہ نکلا ہے!''
>
> اس اداریے کے بعد مدیر نے ''جوالا مکھی'' کا پہلا باب شائع کیا ہے۔ عنوانِ باب کی جلی سرخیوں کے ساتھ جزدی سرخیوں کو بھی مدیر نے قدرے روشن کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی زندگی میں جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں، جتنی بھی فلمیں بنائی ہیں، جتنے اسکرپٹ اور جتنے ناول لکھے ہیں، ان تمام سے مختلف یہ تخلیق ہے۔ پتہ نہیں کیوں، پھر اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ''طبی دنیا'' ایک غیرادبی جریدہ ہے۔ محققین بھلا ادب کا میدان چھوڑ کر طبی جریدے کی ورق گردانی کیوں کرنے لگیں۔ اسی سردلوحی اور عدم توجہی کا نتیجہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی اولین کوشش سے آج ہم بے خبر ہیں۔

میں نے اپنی بساط بھر کوشش کر لی ہے کہ اس رسالے کے باقی ماندہ شماروں کو بھی حاصل کروں، اس دوران مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دو ماہ ٹھہرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا تھا اور میں نے اس ضمن میں کوشش بھی کی مگر طبی دنیا کے وہ قدیم شمارے مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔''

اس کے بعد انہوں نے اس جاسوسی ناول کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے اور پہلی قسط بھی۔ جو اس کلیات میں ناول کے باب میں شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''یہ ناول خواجہ احمد عباس کی ابتدائی کاوش ہے اس لیے اس میں وہ پختگی اور فن کی کہنگی دکھائی نہیں دیتی۔ اس میں ان کا مبتدیانہ پن صاف دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ان کی اس اولین تخلیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں شروع ہی سے ترقی پسند افکار پنپنے لگے تھے۔ ان کے اس ناول کی تخلیق اس زمانے میں ہوئی تھی جب ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس انجمن کے قیام سے قبل 1932 میں چند نوجوانوں نے ''انگارے'' کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کر دیا تھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے انہی افسانوں سے متاثر ہو کر یہ ناول لکھا ہو اور ''انگارے'' کی مناسبت سے اپنے ناول کا نام ''جوالا مکھی'' رکھا۔ اس ناول کی پہلی قسط ہی میں مصنف کے خیالات اور جذبات میں اشتراکیت کا اثر نمایاں ہے۔ مالداروں اور غریبوں کے درمیان دولت کی خلیج کی وجہ سے بڑھتے ہوئے فاصلوں کا ادراک خواجہ

احمد عباس کو شروع ہی سے تھا۔ اس افتراق کو ختم کرنے کا وہ انقلابی نعرہ ابھی ہندوستان میں لگایا نہیں گیا تھا۔ اس لیے انقلاب کی زیریں لہریں ہی ان کے یہاں نظر آتی ہیں۔

اس ناول کی پہلی قسط ستمبر 1936ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا تھا۔ لکھنؤ میں ہوئے اس اجلاس کے بعد سے گویا اس انجمن کو تحریک ملی، پھر بھیونڈی اور ممبئی میں اس کے جلسے ہوتے گئے اور ادب میں ایک مضبوط تحریک کے طور پر وہ کام کرنے لگی۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، علی سردار جعفری، عزیز احمد، سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی وغیرہ فعال ادیبوں کے دم سے اس انجمن کی خوب ترقی ہوئی، مگر ''جوالا مکھی'' لکھتے وقت خواجہ احمد عباس اکیلے تھے، ان کا کوئی ہم نوا تھا نہ کوئی ہمسر۔ یہی ایک ناول تھا جس میں اشتراکیت کی مدھم سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس اعتبار سے بھی ''جوالا مکھی'' کی کلیدی اور بنیادی اہمیت کو اردو ادب میں تسلیم کیے بغیر مفر نہیں۔

ان تمام خصوصیات کے سبب خواجہ احمد عباس کے ناول ''جوالا مکھی'' کو اردو کا پہلا ترقی پسند ناول کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے گمشدہ ابواب کی بازیافت کے لیے کوشش کی جائے اور اسے مکمل صورت میں سامنے لانے کے جتن کیے جائیں۔''

راقم نے بھی اس ناول کے حوالے سے تحقیق کی لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ چونکہ طبی دنیا کے شمارے کسی بھی لائبریری میں دستیاب نہ ہو سکے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ''طبی دنیا'' کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہو۔ ممکن ہے خواجہ احمد عباس نے ناول کی شروعات کی ہو لیکن وہ اسے جاری نہ رکھ سکے۔ ایسا ان کی کئی کتابوں کے ساتھ ہوا ہے کہ اعلانات تو کئے گئے مگر اس عنوان سے ان کی کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ مثلاً ''یہ امرت ہے''، ''پرچم'' یا ''چار دانوں کی کہانی''۔ آخری الذکر کی آخری قسط بھی دستیاب نہیں ہو سکی۔

خواجہ احمد کے ناولوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ اندھیرا اجالا، شیشے کی دیواریں،

دو بوند پانی، چار دل چار راہیں، بمبئی رات کی بانہوں میں، سات ہندوستانی، ایک پرانا خواب اور دنیا بھر کا کچرا، فاصلہ وغیرہ۔ یہاں حتمی طور پر ان ناولوں کی سنہ اشاعت نہیں دی جا سکتی۔ چونکہ زیادہ تر ناولوں پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اصلاً یہ ناول فلم کے لئے لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں وہ ادبی شان نہیں ملتی، جو ادبی ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے ان ناولوں پر ہماری تنقید مہر بہ لب نظر آتی ہے۔ آخر ان میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری یا ناول کے فن کے باب میں کتنے آنچ کی کسر رہ گئی ہے؟ اس پر بات تو ہونی ہی چاہئے تھی تا کہ ان کی فنی کمزوریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا مگر ہمارے ناقدین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے انقلاب کا ذکر مندرجہ بالا سطر میں دانستہ نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ ناول ان ناولوں سے مختلف ہے اور یہاں فنی اعتبار سے خواجہ احمد عباس زیادہ بامراد بھی رہے ہیں۔ اگر چہ انقلاب کے حوالے سے بھی ہمارے ناقدین نے بخل سے کام لیا ہے۔

ڈرامے

خواجہ احمد عباس کا تعلق IPTA سے بہت گہرا رہا ہے اور انہوں نے اس کے لئے کئی ڈرامے لکھے اور اسٹیج بھی کئے۔ مثلاً: (1) زبیدہ (2) اناس اور ایٹم بم (3) یہ امرت ہے (دستیاب نہیں ہوسکا) (4) بارہ بج کر پانچ منٹ (5) لال گلاب کی واپسی (6) پرچم۔ (دستیاب نہیں ہوسکا)

ان ڈراموں کے موضوعات مختلف بھی ہیں اور متنوع بھی۔ لیکن ایک عام روح جو ان تمام ڈراموں میں جاری ہے، وہ انسان دوستی، رواداری اور عصری منظر نامے کی ہے۔ ڈراما ''بارہ بج کر پانچ منٹ'' کا موضوع بالکل آج کا موضوع ہے، یعنی صحافت جو سیاست، سماج اور ملک کا مقدر بدل سکتی تھی اس نے بھی تجارت کی شکل لے لی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان ڈراموں کو کامیاب کوشش کہا جائے گا۔

صحافتی تحریریں

اوپر ذکر آچکا ہے اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ خواجہ احمد عباس کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ اسی لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ صحافتی مضامین لکھے بلکہ درج ذیل صحافتی نوعیت کی

کتابیں بھی لکھیں جن کے نام یہ ہیں: (1) سولینی فاشیت اور جنگِ حبش (2) مولانا محمد علی (3) خروشچیف کیا چاہتا ہے؟ (4) فلمیں کیسے بنتی ہیں؟

فلم اسکرپٹ اور کہانیاں

(1) میرا نام جوکر (2) سات ہندوستانی (3) دھرتی کا لال (4) بابی (5) شہر اور سپنا (6) آسمان محل (7) ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی (8) راہی (9) آوارہ (10) شری 420 (11) خون کا رشتہ۔

سفر نامہ: (1) مسافر کی ڈائری (2) سرخ زمین اور پانچ ستارے

تادمِ تحریر خواجہ احمد عباس کی اُردو میں مندرجہ بالا کتابیں دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی میں بھی تقریباً باون (52) تصانیف ہیں (ان میں بعض کتابیں اُردو کہانیوں کا ترجمہ ہیں)۔ اس تعداد میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو کتابیں کم ہو جائیں لیکن کم و بیش خواجہ احمد عباس اسّی کتابوں کے مصنف کہے جا سکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس ہندی میں براہِ راست نہیں لکھتے تھے، ان کی جو کتابیں ہندی میں موجود ہیں ان میں سے زیادہ تر اُردو یا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک کتاب ہندی میں ''آدھا انسان'' کے نام سے ملتی ہے جسے نیلا بھ پرکاشن، الہ آباد نے 1953 میں ناول کے نام سے شائع کیا ہے جب کہ یہ ناول نہیں ہے بلکہ خواجہ احمد عباس کا مشہور افسانہ ''مسوری 1952'' ہے جو ان کے طویل افسانوں پر مشتمل مجموعے ''کہتے ہیں جس کو عشق'' میں شریک اشاعت ہے لیکن نام مختلف ہونے کی بنا پر لوگ اسے بھی الگ کتاب شمار کرتے ہیں۔ میں نے خواجہ احمد عباس کے حوالے سے تحقیق و تلاش کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ان کی زیادہ تر تخلیقات کو یکجا طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کی تمام تحریروں کو پا لیا ہے۔ ممکن ہے کل ان کی کوئی اور تحریر سامنے آجائے لیکن سرِ دست میری تحقیق کا حاصل یہی ہے۔

امید ہے خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی تحریروں سے دلچسپی رکھنے والوں کو میری یہ کوشش پسند آئے۔ اتنا بڑا کام جو آپ کے سامنے ہے ظاہری بات ہے یہ اس وقت تک مکمل نہیں

ہوسکتا تھا جب تک ہمیں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ذاکر حسین لائبریری اور ادارۂ ادبیات حیدرآباد سے مدد نہ ملی ہوتی۔ جو افراد اور احباب اس سلسلے میں معاون ثابت ہوئے ہیں ان کا فرداً فرداً نام لینا مشکل تو ہے مگر ضروری بھی۔ اس میں اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کچھ ناموں کا ذکر نہ ہو سکے۔ لیکن پھر بھی فوری طور پر جناب ابوذر ہاشمی کلکتہ، جناب یحییٰ نشیط، جناب صفدر امام قادری، ڈاکٹر زاہدالحق، محترمہ زویا زیدی، جناب مہر ندیم الہی، جناب عطا خورشید، محترمہ نوشین عثمانی، پاکستان کے ہمارے دوست جناب رفاقت علی شاہد وغیرہم کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو مناسب بات نہ ہوگی۔

میں خصوصی طور پر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا سراپا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کلیات خواجہ احمد عباس کی اشاعت کے حقوق راقم کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کیے۔ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا تعلق خواجہ احمد عباس کے خانوادے سے ہے انہوں نے خواجہ احمد عباس میموریل ٹرسٹ بھی قائم کر رکھا ہے اور وہ خود بھی ادب کی بہت اچھی پارکھ رہی ہیں۔ نیز آپ سماجی، سیاسی اور ادبی اعتبار سے نہ صرف بہت فعال ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً جلسوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کا بھی انعقاد کرتی رہتی ہیں۔ وہ پلاننگ کمیشن آف انڈیا کی بہت فعال ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اوپن یونی ورسٹی حیدرآباد کی چانسلر بھی رہ چکی ہیں۔ میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی اجازت کے بغیر اتنا اہم کام شائع نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھے یقین ہے اس کام میں کمیاں ہوں گی مگر یہ بھی توقع ہے کہ اس کام کو دوسرے لوگ بہتر طریقے سے کر سکیں گے۔

مجھ سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب میں نے قدم رکھا یہ خاک داں ویراں تھا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فاصلہ

یہ ناول ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹیڈ جی ٹی روڈ شاہدرا دہلی 32 سے شائع ہوا۔
سنہ اشاعت درج نہیں ہے

فہرست

لال آنکھ۔ پیلی آنکھ۔ ہری آنکھ

(1)

گوتم چندرا کے پاس 'بھگوان کا دیا' یا 'انسان سے لیا' سب کچھ تھا۔

اُس کی جہازی سائز کی وارڈ روب الماری میں پچپن سوٹ تھے۔ ستر ٹیری لین اور ٹیری کاٹ کی بش شرٹس تھیں۔ اکتالیس پتلونیں تھیں۔ تیس سوٹ کے ساتھ پہننے والی سلک کی قمیضیں تھیں۔ ایک سو دس ٹائیاں تھیں اور صرف اکسٹھ جوڑے جوتے تھے۔

اُس کے بیڈ روم میں پُرانے ڈیزائن کا مگر بہت قیمتی ایرانی قالین بچھا تھا۔ دیواروں پر مشہور مصوّروں کی بنائی ہوئی پینٹنگز لگی تھیں۔ سائڈ بورڈ پر ایک جاپانی وژن سیٹ اور ایک جرمن ٹیپ رکارڈر لگا ہوا تھا۔ ڈبل بیڈ جس پر وہ ابھی تک 'سنگل' ہی سوتا تھا چار ہزار روپے میں خریدا گیا تھا۔ اُس پر ڈنلپ پلّو کا لچک دار گدّا لگا ہوا تھا۔ اور اوپر ٹیپسٹری کا کپڑا لگا ہوا تھا۔ اُس پر ہلکے نیلے رنگ کی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی جس کے کناروں پر 'گوتم' کی 'G' کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ ایسا ہی مونوگرام اُن دو ریشمی ہلکے نیلے رنگ کے تکیوں پر بنا ہوا تھا جو سرہانے رکھے ہوئے تھے۔ پلنگ پر ایک پلش کا نرم مخملی کمبل پڑا ہوا تھا۔ چادر مسلی ہوئی تھی، کمبل گول مول ہو چکا تھا، تکیے ٹیڑھے بانکے پڑے ہوئے تھے اور تکیوں کے اوپر ایک پرانا اور پرانے ڈیزائن کا بچّوں کا منہ

سے بجانے والا باجا پڑا ہوا تھا۔ جو اس امیرانہ ماحول میں اتنا ہی بے موقعہ اور مہمل لگتا تھا جیسے بکنگھم پیلیس میں کوئی بھکاری گھس آیا ہو۔

(2)

باہر کے دروازے کی گھنٹی بجی تو منی فراک پہنے نوکرانی لوسی ڈی سوزا نے دروازہ کھولا۔ باہر کسی فلورسٹ کا آدمی (پھولوں کا) ایک بہت بڑا گلدستہ لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس نے گلدستہ جو لال ریشمی فیتے سے بندھا تھا لوسی کے حوالے کیا۔ لوسی نوجوان تھی، بدصورت نہیں تھی، خاصی سانولی سلونی تھی، منی فراک میں سے نکلی ہوئی اُس کی ٹانگیں سڈول تھیں مگر وہ جانتی تھی کہ یہ ہدیۂ محبت اُس کے اپنے لیے نہیں ہے۔ اُس نے رسید پر دستخط کیے، دروازہ بند کیا، کولھے مٹکاتی، اپنے منی فراک کو جھولا جھلاتی، عالیشان ڈرائنگ روم میں سے ہوتی ہوئی، سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر اپنی سینڈلز سے کھٹ کھٹ کرتی اوپر چڑھتی چلی گئی۔

وہ گھر کی مُنہ چڑھی ملازمہ تھی، جس کمرے میں چاہے جاسکتی تھی، گوتم کے بیڈ روم کے باہر ایک پَل کے لیے رُکی۔ مسٹر گوتم، سر'' کی آواز لگائی اور کسی جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلی گئی۔

اِدھر اُدھر نگاہ کرنے پر اُس کو معلوم ہوا کہ گوتم کمرے میں نہیں ہے۔ برابر کے ڈریسنگ روم میں سے گنگنانے کی آواز آئی تو وہ سمجھ گئی کہ صاحب شاید کپڑے بدل رہا ہے۔ 'مسٹر گوتم سر' ایک بار پھر اُس نے پکارا۔ مگر اس بار اُس نے ''کم اِن لوسی'' کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر وہ پردہ ہٹا کر اندر گئی اور وہاں جو دکھائی دیا اُس کو دیکھ کر لوسی کے منہ سے ایک بے اختیار چیخ نکل گئی۔

اُس نے دیکھا کہ گوتم صاحب ایک بہت بڑا کھلا چاقو لیے اُس سے اپنا گلا کاٹ رہا ہے۔ کم سے کم اُسے لگا ایسا ہی۔ دراصل وہ نہ چاقو تھا نہ چھری بلکہ پُرانی وضع کا اُسترا تھا۔ جس سے گوتم آئینے کے سامنے کھڑا ہوا شیو کر رہا تھا۔ وہ سلک کے سلیپنگ سوٹ کا صرف پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ کوٹ اُتار کر کرسی پر ڈال رکھا تھا۔ پاجامے کے اوپر صرف ایک بے آستینوں کا بنیان پہنے ہوئے تھا۔ وہ چوبیس پچیس برس کا نوجوان تھا۔ جو نہ بہت خوب صورت تھا نہ بدصورت۔ قد درمیانہ تھا۔ نہ بہت لمبا نہ بہت چھوٹا۔ مگر اُس کے صابن لگے چہرے پر بھولے پن کی ایک دلکش جھلک تھی۔ موٹے موٹے پپوٹوں میں سے بڑی بڑی کالی چمکدار آنکھیں حیرت سے لوسی کی

طرف دیکھ رہی تھیں اور اُسترا ٹھوڑی کے نیچے کے بال کاٹتا کاٹتا ہوا رُک گیا تھا۔

''ارے لوسی، کیا ہوا؟''

اب جا کر لوسی کی جان میں جان آئی۔ ''سوری، سر۔ میں سمجھی آپ اپنا گلا کاٹ رہے ہیں۔''

''سلی گرل!'' گوتم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ کانونٹ اسکول اور کرسچین کالج کا پڑھا ہوا تھا اور انگریزی الفاظ کا استعمال اُس کی عادت بن چکی تھی۔ 'کیا تم نے کبھی کسی کو کٹ تھروٹ ریزر سے شیو کرتے نہیں دیکھا؟'' لوسی ایک بار پھر ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ جب گوتم نے بالکل پاس آ کر ریزر سے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ تو دادا جی کا ریزر ہے!'' جہاں اپنے دادا سے گوتم کو، مل فیکٹریاں، بلڈنگیں، ہر قسم کی دولت ورثے میں ملی تھی وہاں یہ پرانا اور پرانی چال کا ریزر بھی ملا تھا اور اُس سے اپنی داڑھی گھستے ہوئے وہ اپنے سورگباشی دادا جی کے بہت قریب محسوس کرتا تھا حالانکہ اُن کا دیہانت تو اُس کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور اُس کو اُن کی شکل بھی یاد نہیں تھی مگر گھر کی ہر دیوار پر اُن کی کوئی پینٹنگ یا کوئی فوٹو ہر وقت اُس کو اُن کی صورت یاد دلاتی رہتی تھی۔

اب اُس نے لوسی کی گود میں ایک بہت خوب صورت اور بڑا گلدستہ دیکھا۔ ''ارے یہ پھول کس نے بھیجے ہیں۔''

''اوہ میں تو بھول ہی گئی۔ یہ مس مایا رانی کی طرف سے فلورسٹ کا آدمی دے گیا ہے۔''

پھر اُس نے وہ گلدستہ اور ساتھ میں آیا ہوا ایک چھوٹا سا خوب صورت سا لفافہ گوتم صاحب کی طرف بڑھایا اور ''اچھا صاحب'' کہہ کر وہاں سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی بھاگ گئی۔

اب گوتم نے پھولوں کو اپنے صابن لگے ہوئے گالوں سے لگایا، بڑے پیار سے اُن کی خوشبو کو سونگھا اور لفافے میں سے کارڈ نکال کر اُسے پڑھا "WITH LOVE FROM MAYA" اور اُسے ایسا لگا جیسے وہ ایک گلدستہ نہیں ہے مایا کا پھولوں جیسے مہکتا ہوا چہرہ ہے جسے وہ چوم رہا تھا۔

(3)

مایا کے بھیجے ہوئے پھولوں کو ــ یا خیال میں مایا کو ــ چومتے ہی گوتم کے شریر میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔

آنکھوں سے نیند اور کل رات کی پی ہوئی وہسکی کا نشہ غائب ہو گیا سنگ مرمر کے ٹب کے خوشبودار اور گرم پانی میں نہا کر جب ٹھنڈے پانی کے فوارے کے نیچے کھڑا ہوا تو سارے بدن کی اُکتاہٹ دور ہو کر چستی آ گئی۔

اب اُس نے الماری میں لٹکے ہوئے بُش شرٹوں اور قمیضوں کی فوج میں سے ایک چیختے ہوئے سُرخ رنگ کی قمیض پسند کی، ایک نئے فیشن کی دھاری دار پتلون، پیلے رنگ کی ٹائی اور ایک بھورے رنگ کا کوٹ اور دو رنگوں کا موٹے پنجے کا جوتا جو آج کل کے فیشن کے عین مطابق تھا۔

اُس کا ملازم رامو جو اُس کو رنگ برنگے کپڑے پہنا رہا تھا مگر خود سفید یونیفارم کا کوٹ اور پتلون پہنے تھا۔ اُس نے جوتے کے فیتے باندھتے ہوئے سوچا۔ ''میں کب تک گوتم صاحب کے جوتوں میں پڑا رہوں گا؟ آخر مجھ میں اور اُن میں فرق بھی کیا ہے؟'' اور کوٹ پہناتے وقت اُس نے مونڈھوں پر سے سلوٹیں دور کرنے کے بہانے سے دو ہلکی ہلکی تھپکیاں دیں جو اُس کے خیال میں دو زناٹے دار طمانچے تھے۔ تیار ہو کر گوتم بیڈ روم سے باہر نکل رہا تھا کہ اُس کے دادا جی کی تصویر نے اپنی خاموش نگاہوں سے اُس کو اپنی طرف بُلایا۔

گوتم اب دادا کی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ کہتے تھے دادا اور پوتے کی صورت بالکل ایک جیسی تھی لیکن یہ مشابہت، آج تک گوتم کو نہیں دکھائی دی تھی۔ اُس کے دادا کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک، ایک عجیب بھوک، ایک عجیب پیاس، ایک عجیب تلاش تھی جو گوتم کو کبھی شیشہ دیکھ کر اپنی آنکھوں میں نظر نہیں آتی تھی۔ چڑھی ہوئی موٹی موٹی مونچھوں کے نیچے اُن کے موٹے موٹے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسے اُن کو نہ صرف دُنیا بھر کی دولت مل گئی ہو بلکہ دنیا بھر کی طاقت اور دبدبہ بھی حاصل ہو گیا ہو اور کیوں نہ ہو (گوتم اپنے دادا کے بارے میں اکثر سوچتا) آخر انھوں نے کروڑوں کی دولت پیدا کی، سوسائٹی میں عزّت پائی، برٹش سرکار سے 'سر' کا خطاب پایا جس کا تمغہ تصویر میں بھی اُن کے سینے پر آج تک چمک رہا تھا۔ ''سر اُتم چندر روڈ'' کا بورڈ جب بھی اپنی موٹر میں آتے جاتے دیکھتا تو گوتم کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا اور وہ سوچتا'' کاش میں بھی اپنے دادا کی طرح نام کما سکتا!''

آج جب وہ تصویر کے سامنے کھڑا ہوا اور اپنے دادا کی تصویر کی آنکھوں میں جھانکا تو اُس کو وہ ہنستی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اُن کی آتما بھی آج بہت خوش ہوگی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کو شردھا سے جوڑ کر کہا۔ ''نمستے دادا جی۔'' یہ اُس کا صبح کا معمول تھا۔ مگر آج اُس نے نمستے کرنے کے بعد کہا۔ ''میں آج پچیس برس کا ہو گیا ہوں۔ مجھے آشیرواد دیجیے، دادا جی۔'' اور اُس دم اُسے ایسا لگا کہ اُس کے دادا کی آتما نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے آشیرواد دے دیا ہو اور وہ خوش خوش گیت گنگناتا ہوا، کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اُترتا ہوا چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں اُس کی پھوپھی رادھا بائی لمبی چوڑی ڈائننگ ٹیبل کے ایک طرف بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں۔ دوسری طرف گوتم کے لیے پلیٹیں رکھی تھیں۔ بہترین چینی کے اور کٹ گلاس کے برتن۔ چاندی کا چائے کا سیٹ، سائڈ بورڈ پر بجلی کا ٹوسٹر رکھا ہوا تھا جس کے پاس کھڑی لوسی توس سینک رہی تھی۔

''گڈ مارننگ، آنٹی'' گوتم نے اپنی پھوپھی کو نمستے کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو گوتم'' آنٹی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''سالگرہ مبارک ہو۔''

گوتم نے فرض کے طور پر اپنا سر جھکا دیا۔ آنٹی نے بھتیجے کا گال ہلکے سے چوم لیا مگر اس پیار میں دونوں طرف سے کوئی خاص جوش کا اظہار نہیں تھا۔

گوتم میز کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور آواز دی۔ ''انکل جانی۔''

''کمنگ سر'' کچن سے آواز آئی اور اگلے لمحے ایک ادھیڑ عمر کا بیرا ایک چاندی کی ٹرے پر رکھی ہوئی چاندی کی انڈے دانیوں میں دو انڈے رکھ کر لے آیا۔

انڈوں کو چاندی کے چمچے سے توڑتے ہوئے گوتم نے آنٹی کی طرف دیکھا جو میز اور کمرے کے دوسرے کنارے پر بیٹھی ہوئی سیب چھیل کر کھا رہی تھی۔ صبح سویرے بال کالے کرنے سے پہلے اُس کی آنٹی کشمیری ڈریسنگ گاؤن پہنے ایک ادھیڑ عمر کی خاصی خوب صورت عورت لگتی تھی۔ جس کے سر کے بال سفید نہیں تو کھچڑی تو ہو ہی گئے تھے لیکن ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ اپنے کمرے سے سنگھار کر کے نکلتی تھی تو ایک فیشن ایبل قسم کی ایک نقلی سفید لکیر کے علاوہ اُس کے بال کالے اور چمکدار ہو جاتے تھے۔ چہرے کی سب جھرّیاں غائب ہو جاتی تھیں اور وہ

مشکل سے بتیس برس کی جوان عورت لگتی تھی مگر اس وقت تو (گوتم نے دل ہی دل میں سوچا) ہماری آنٹی اچھی خاصی بڑھیا دکھائی دیتی ہے۔

آنٹی نے گوتم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" گوتم آج تمھاری برتھ ڈے ہے۔ کون سی کار لے جاؤ گے؟"

گوتم نے اپنے دادا کی بڑی روغنی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جس کے نیچے سائڈ بورڈ تھا جس پر سب موٹروں کی چابیاں رہتی تھیں۔" آنٹی جی۔ میں سوچتا ہوں آج تو سفید امپالا لے جاؤں تو اچھا رہے گا۔"

(4)

گوتم چندرا جب بھی اپنی چار موٹروں میں سے کوئی موٹر خود چلاتا تھا تو سڑک پر دوڑتی ہوئی دوسری موٹروں کو دیکھ کر سب سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ تیز رفتاری سے موٹر چلانا اُس کو بہت پسند تھا۔ چھت کھلی ہوئی موٹر میں تیز چلتی ہوئی ہوا کے نرم نرم تھپیڑے لگتے اور اُس کی رگوں میں جوان خون اور تیزی سے گردش کرنے لگتا۔ دوسری موٹروں کا کارواں جس کو وہ پیچھے چھوڑتا جاتا تھا کتنا دلکش لگتا تھا۔

مچھلیوں کی طرح سڈول کاریں۔

پرندوں کی طرح پنکھ پھیلائے کاریں۔

ہوائی جہازوں کی طرح تیز رفتار کاریں۔

اور گوتم اپنی موٹر دوڑاتے ہوئے سوچتا کہ خوش حالی اور دولت اور صنعتی ترقی کا یہ کارواں اس کا ثبوت ہے کہ ہندوستان میں بھی مشین نے انسان کو جانوروں کی طرح محنت کرنے سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا ہے۔

وہ یہ سوچتا اور سب موٹروں کو پیچھے چھوڑتا جاتا۔

موٹریں جو مچھلیوں کی طرح سڈول تھیں، پرندوں کی طرح پنکھ پھیلائے تھیں، ہوائی جہازوں کی طرح تیز رفتار تھیں......

اور اُن سب میں اُس کی کار سب سے نمایاں تھی۔ مچھلی کی طرح سڈول، پرند کی طرح پنکھ

پھیلائے، ہوائی جہاز کی طرح تیز رفتار— اور اس کار کو قابو میں رکھنے سے اُس کو وہی خوشی ہوتی تھی جو کسی عاشق کو اپنی خوب صورت معشوقہ سے محبت کرنے میں ہوتی ہے۔ ایسی ہی جیسی اُسے مایا جیسی خوب صورت لڑکی سے مل کر ہوتی تھی۔

مہالکشمی کے مندر کے قریب ٹریفک سگنل نے اپنی لال لال آنکھ کھولی اور یہ کارواں کا سارا کارواں ٹھہر گیا۔ سب سے آگے گوتم کی کار ہی تھی۔

جیسے ہی کار رُکی گوتم کا ہاتھ آپ سے آپ اپنی جیب میں گیا۔ جہاں وہ پُرانا باجا پڑا ہوا تھا۔ اُسے نکال کر اُس نے ہونٹوں سے لگایا اور ایک دُھن بجانے لگا۔ وہ اس باجے پر آج سے نہیں نہ جانے کب سے ہمیشہ یہی دُھن بجاتا آیا تھا۔ کوئی دوسری دُھن اُس کو آتی ہی نہیں تھی۔ یہ باجا اُس کا پرانا ساتھی تھا اور یہ دُھن بجا کر اُس کے من کو ایک عجیب خوشی محسوس ہوتی تھی۔ ایک عجیب خوشی، ایک عجیب اطمینان، یہ کیا ہوتا تھا؟ یہ کیوں ہوتا تھا؟ یہ اُسے معلوم نہ تھا نہ اس کی پرواہ ہی تھی۔ مگر ہوتا تھا ضرور اور اُسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ دُھن بجا کر اُس کی روحانی پیاس کو تسکین مل گئی ہو۔

وہ یہ باجا بجا ہی رہا تھا (اور دوسری کاروں میں بیٹھے ہوئے لوگ حیرت سے یہ انوکھا نظارہ دیکھ رہے تھے) کہ ایک میلا سا، کالا سا، سوکھا سا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا۔

ایک بھکاری چھوکرا تھا اور وہ گڑگڑاتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ”صاحب یہ مجھے دیدو۔ اسے بجا کر دو پیسے کماؤں گا۔“ یہ کہہ کر اُس چھوکرے نے اپنا ہاتھ اور آگے بڑھایا۔

یہ کالا سا، سوکھا سا، میلا سا گندا ہاتھ اپنے پیارے باجے کی طرف بڑھتے دیکھ کر گوتم چندرا کے نرم شفاف چہرے پر ایک بدلی سی چھا گئی اور وہ ایک دم چلاّ پڑا۔ ”اے سالا۔ پیسہ چاہیے یا میرا باجا چھیننا چاہتا ہے؟“

پھر اُس نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے اپنی جیب میں سے چمکیلے چمڑے کا بٹوہ نکالا جس پر سنہری حاشیہ بنا ہوا تھا۔ اُس میں کئی سو روپے کے نوٹ تھے۔ اُس میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اُس نے بھکاری کی طرف بڑھایا۔ ”یہ لے......“

اگلے لمحے ٹریفک سگنل کی لال آنکھ پہلے پیلی اور پھر سبز ہوگئی۔ گوتم کی زندگی ان ہی آنکھوں کے اشاروں پر چلتی تھی۔ لال آنکھ۔ پیلی آنکھ۔ ہری آنکھ— لال آنکھ کہتی تھی ٹھہرو۔ پیلی آنکھ کہتی

بھی تیار ہو جاؤ۔ ہری آنکھ کہتی تھی جاؤ۔

موٹروں کا کارواں پھر روانہ ہو گیا۔ گوتم چندرا کی موٹر سب سے آگے تھی پیڈر روڈ کے چڑھاؤ پر آرام سے چڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اور بھکاری چھوکرا سوچ رہا تھا کہ اس صاحب نے دو روپے کا پرانا باجا مانگنے پر اتنا غصہ کیا مگر اُس کے بجائے دس روپے کا نوٹ دے دیا۔ ''یہ صاحب پاگل ہے کیا؟''

○

اور ہیرے ہنستے رہے!

سفید موٹر کار! جو مچھلی کی طرح سڈول تھی، پرندے کی طرح پنکھ پھیلائے تھی اور ہوائی جہاز کی طرح تیز رفتار تھی۔ نریمن پوائنٹ کے ایک تیس منزلہ ''اسکائی اسکریپر'' کے سامنے آ کے رُک گئی۔ بڑے ادب سے کار کا دروازہ ایک دربان نے کھولا۔ گوتم چندرالا پرواہی کی شان سے اُترا، کار کی چابیاں دربان کی طرف اُچھالیں تاکہ وہ کار کو اُس کی جگہ لے جا کر 'پارک' کر دے پھر وہ اپنے باجے کو اُچھالتا ہوا، بلڈنگ کے اندر چلا گیا۔

اندر بارہ لفٹ قطار میں لگے ہوئے تھے۔ حسب معمول تیسرے نمبر کے لفٹ چلانے والے نے سلام کیا۔ لفٹ کا آٹومیٹک دروازہ کھول کر رکھا اور گوتم لفٹ میں داخل ہو گیا۔ دروازہ آپ سے آپ بند ہو گیا اور لفٹ نہایت خاموش تیز رفتاری سے اوپر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گوتم نے لفٹ کے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ دیکھ کر مسکرا دیا۔ سوچا میری صورت تو بُری نہیں ہے۔ مگر مجھ سے بھی خوب صورت نوجوان موجود ہیں۔ معلوم نہیں مایا مجھ سے ہی کیوں اتنی خصوصیت برتتی ہے۔ آج اُس نے بڑے خوب صورت اور خوشبودار پھول بھیجے۔'' پھر اُس نے اوپر کی جیب سے چاندی منڈھا ہوا ایک کنگھا نکالا اور بال جو موٹر میں ہوا سے پریشان ہو گئے تھے اُن کو سنوارا۔ آئینے میں اس نے یہ بھی دیکھا کہ آنکھوں کے نیچے حلقے کالے اور گہرے ہو گئے تھے۔ اُس نے

سوچا ''ضرورت سے زیادہ وہسکی اور روز دو بجے رات تک جاگنے کا نتیجہ'' کان پکڑ کر اُس نے دل ہی دل میں وعدہ کیا۔ آج سے روز رات کو گیارہ بجے سو جایا کروں گا اور تین پیگ سے زیادہ وہسکی نہیں۔''

اتنے میں لفٹ کے دروازے کھلنے کی آواز آئی اور لفٹ والے نے کہا: ''سر چوبیسواں مالا آ گیا۔''

گوتم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک دس روپے کا نوٹ نکالا اُسے لفٹ والے کو دیتے ہوئے کہا: ''آج ہماری پچیسویں سالگرہ ہے۔''

سلام کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ ''مبارک ہو، صاحب'' اور پھر گوتم لفٹ سے نکل کر اپنے دفتر کے سنگ مَرمَر کے برآمدے میں آ گیا۔

سامنے شیشے کے دروازے پر سنہری حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ CHANDARA ENTERPRISES ESTABLISHED 1940 آج پھر اُسے یاد آیا کہ اُس کے پیدا ہونے سے پورے دس برس پہلے اُس کے دادا سر اُتّم چندر نے یہ کمپنی قائم کی تھی۔ اُس نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے ''چپراسیوں کے سلاموں کا سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے سوچا۔''

''واقعی میرے دادا بہت بڑے آدمی تھے! مجھے اُن کا پوتا ہونے پر فخر کرنا چاہیے۔''

دفتر کے کوریڈر میں جتنے چپراسی، کلرک، ہیڈ کلرک دکھائی دیے سب نے باری باری اُدب سے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''سلام صاحب۔''

''گڈ مارننگ سر۔''

نمستے سیٹھ صاحب۔''

گوتم نے اُن کے سلاموں کا حسب معمول سر کے ایک اشارے سے چلتے چلتے جواب دیا۔ اُس کی چال میں ذرا بھی فرق نہیں تھا۔

لیکن جب وہ ٹیلی فون آپریٹر مس لیگی فرنانڈیز کے پاس سے گزرا اور اُس پَرکَٹی نمکین رنگت کی اسمارٹ لڑکی نے 'گڈ مارننگ سر' کہا تو گوتم نے مسکرا کر جواب دیا۔ 'گڈ مارننگ لیگی'۔

اُس کے اپنے کمرے کے باہر اُس کی نوجوان اور خوب صورت پارسی سکریٹری مسز شراف

کی ٹیبل لگی ہوئی تھی جو اُس وقت ٹائپ کر رہی تھی۔ ٹائپ رائٹر سے نظر اُٹھا کر اُس نے ایئر ہوسٹس والی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا: ''گڈ مارننگ سر۔''

''گڈ مارننگ۔'' گوتم نے جواب دیا۔

اُس کا آفس بوائے بھولو دروازہ کھولے کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن گوتم نے اندر جانے سے پہلے انتظار کیا جب تک مسز شراف نے اُسے "MANY HAPPY RETURUS OF THE DAY" کہہ کر سال گرہ کی مبارکباد نہیں دی پھر 'تھینک یو' کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑا۔

گوتم کا دفتر بھی بڑا انوکھا تھا۔ بہت بڑی میز۔ بہت بڑھیا کرسی جو گول گول گھومتی بھی تھی اور جس کی پیٹھ پیچھے بھی ڈھلک جاتی تھی۔ میز پر بہت بڑھیا قلم رکھے تھے۔ درجنوں پنسلیں ایک بڑھیا گلاس میں رکھی تھیں۔ ایک جہازی سائز کا لمبا چوڑا بلاٹنگ پیڈ تھا جس کی بلاٹنگ پر کسی قسم کی لکھائی آج تک 'بلاٹ' نہ کی گئی تھی اور جو آج تک اتنا ہی نیا اور گلابی نظر آتا تھا جیسا کہ پہلے دن تھا۔ تین ٹیلی فون لگے ہوئے تھے۔ چھ چھوٹی چھوٹی بونوں کی شکل کی گڑیاں کھڑی تھیں جن کے سر ہوا کے جھونکے سے ہلنے لگتے تھے۔ پیچھے ایر کنڈیشنر لگا ہوا تھا۔ سامنے ملاقاتیوں کے لیے تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک بہت بڑھیا صوفہ لگا ہوا تھا لیکن ساری میز پر بلکہ سارے کمرے میں کوئی فائل کوئی کتاب بلکہ کسی کاغذ کا بھی نام ونشان نہیں تھا۔ البتہ سامنے دیوار پر اُس کے دادا کی ایک بہت بڑی تصویر لگی ہوئی تھی اور تصویر کے سنہری فریم میں سے سر اُتم چندر کی کالی چمکدار اور بھوکی آنکھیں اُس کو گھور رہی تھیں۔

جیسے وہ دادا کی تصویر نہ ہو بلکہ خود اُس کے دادا ہوں۔ گوتم نے میز کے پاس آتے ہی نمستے دادا جی'' کہہ کر اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

پھر اُس نے اپنا کوٹ اُتارا۔ اس لاپرواہی کے ساتھ کہ آستینوں کا اور اندر کا ریشمی استر باہر نکل آیا اور اُسے بھولا کی طرف پھینکا۔ آفس بوائے نے اُڑتا ہوا کوٹ کرکٹ بال کی طرح ہوا میں 'کیچ' کر لیا اور اُسے ہینگر میں لٹکا کر الماری میں لٹکانے چلا۔

'سلام صاحب' بھولا نے سیلوٹ مارا اور باہر چلا گیا۔ مگر اس انداز سے پیچھے دیکھتے ہوئے جیسے کہ اُس کو بھروسہ نہ ہو کہ اب اُس کا 'صاحب' کیا عجیب حرکت کر بیٹھے گا۔

اور باہر سے دروازہ بند کرتے ہی بھولا نے چابی کے سوراخ پر آنکھ جما دی۔

اُسے نظر آیا کہ اندر گوتم صاحب اپنی کرسی پر بیٹھا اُسے گول گول گھمار رہا ہے۔

بھولا نے دفتر کے دوسرے چپراسیوں کو بلا کر دکھایا۔

اب گوتم صاحب وہ بچّوں والا باجا بجا رہا تھا۔

ساتھ میں وہ بونوں کی شکلوں کی جو گڑیاں تھیں اُن کے ہلتے ہوئے سروں پر بچّوں کی طرح پیانو بجا رہا تھا۔

پھر انھوں نے دیکھا کہ اُس کی کرسی دوبارہ لٹو کی طرح گھوم رہی ہے۔

ایک چپراسی نے مسکرا کر خاموشی سے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہے۔ ''ہمارا صاحب تو نرا پاگل ہے۔''

گوتم کی گھومتی ہوئی کرسی ٹھہر گئی۔ جب برابر میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ فون براہ راست دیوندر شرما کے کمرے سے ملا ہوا تھا جو چندرا انٹر پرائزز کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ ڈرے ہوئے بچے کی طرح گوتم نے ٹیلی فون اُٹھایا۔ جیسے اُس کو ڈر ہو کہ مسٹر شرما نے کہیں اُسے کرسی گھماتے نہ دیکھ لیا ہو۔

''ہیلو۔''

دوسری طرف بڑی بڑی چڑھی ہوئی خضاب لگی مونچھوں والے گنجے سر والے، واسکٹ سمیت ولایتی سوٹ پہنے، مسٹر شرما نے ٹیلی فون پر بڑے رعب داب سے کہا۔

''ہیلو، مائی بوائے۔'' پھر انھوں نے انگریزی میں سالگرہ کی مبارکباد دی۔ "MANY HAPPY RETURNS OF THE DAY" تھینک تھینک یو، سر'' گوتم نے جواب دیا۔

''کہو کیا حال ہے؟''

''فرسٹ کلاس۔'' گوتم نے فون کے ذریعے کہا۔ ''کہیے بزنس کا کیا حال ہے؟''

''وہ بھی فرسٹ کلاس۔'' مسٹر شرما (جو مسٹر شرما ہی کہلاتے تھے اور شرما صاحب یا شرما جی کہلانے سے بہت چڑتے تھے) نے بڑی شان سے جواب دیا اور پھر اُن کی نگاہوں میں ایک خاص چمک آ گئی۔ ''تمھیں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جو ہیں تمھارے کاروبار کی دیکھ

بھال کرنے کے لیے۔'' اور پھر جیسے کوئی مہربان ماسٹر اپنے چہیتے شاگرد سے کہتا ہے۔'' آج تم چھٹی مناؤ۔ اپنی برتھ ڈے CELEBRATE کرو اور جتنے روپے کی ضرورت ہو کیشئیر سے لے لو۔''

''تھینک یو، تھینک یو، مسٹر شرما۔'' گوتم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اور پھر جھجک کر'' کیا میں ایک ہیرے کی انگوٹھی خرید سکتا ہوں؟'' بالکل جیسے بچہ ڈر کر باپ سے نئی بال خریدنے کے لیے کہتا ہے۔

''ایک انگوٹھی؟'' مسٹر شرما نے اپنی کائیاں آنکھوں کو سکوڑتے ہوئے کہا۔'' تم ہیرے کی سو انگوٹھیاں خرید سکتے ہو'' اور پھر اُن کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ اُبھر آئی۔'' مگر تمھیں تو صرف ایک لڑکی کے لیے ایک ہی انگوٹھی ملنا چاہیے نا؟ رائٹ؟''

یس سر۔ جلدی سے گوتم نے کہا اور ٹیلی فون کا چونگا اُٹھا کر رکھ دیا اور دوسری طرف مسٹر شرما نے فون رکھتے ہوئے کہا'' جاؤ بیٹا۔ مزے اڑاؤ۔''

اور ان کے چہرے پر ایک ایسی فتح مندانہ مسکراہٹ تھی جیسی شکاری کے چہرے پر کامیابی سے نشانہ لگانے کے بعد ہوتی ہے۔

''گوتم سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے کہ اُس کے دوسرے فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو'' اُس نے فون اٹھاتے ہوئے کہا اور دوسری طرف سے آواز آنے پر اُس کا چہرہ اُتر گیا۔'' اوہ۔ آنٹی جی آپ ہیں۔''

دوسری طرف' رادھا بائی اپنے بیڈ روم میں' سنگھار میز کے سامنے بیٹھی لوسی سے اپنے کھچڑی رنگ کے بال خضاب سے کالے کروا رہی تھیں اور ساتھ میں ٹیلی فون پر بات کرتی جا رہی تھیں۔

''گوتم بیٹا۔'' انہوں نے ریاکارانہ ملائمیت سے کہا۔

''یس آنٹی۔'' گوتم نے ایک مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ اس کو معلوم تھا کہ اب کیا کہا جائے گا۔ کیوں کہ یہ روز کہا جاتا تھا۔

''گوتم۔ گیارہ بج گئے ہیں۔''

''جی آنٹی۔''

''دروازہ کھولو۔ لڑکا دودھ کا گلاس لیے کھڑا ہے۔''

''بہت اچھا۔'' گوتم نے جواب دیا۔'' میں ابھی پیتا ہوں۔'' اور اُس نے تنگ آ کر فون رکھ

دیا۔ جیسے اس سے زہر پینے کو کہا گیا ہو۔

اب اُس نے پاس دیوار پر لگے ہوئے بٹنوں میں سے ایک کو دبایا اور آپ سے آپ دروازہ کھل گیا۔ باہر بیچ بیچ بھولو دودھ کا گلاس ایک چاندی کی تھالی میں لیے ہوئے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ گیا۔

''کیوں بھولو۔''

''جی صاحب۔''

''دودھ اچھا ہے؟''

''جی صاحب۔''

''میٹھا ہے۔''

''لو اسے پی جاؤ۔''

''جی صاحب؟''

''نہیں صاحب مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ سوال جواب میکانیکی طریقے سے ہو رہے تھے جیسے یہ روز کا معمول ہو۔ اس ڈرامے کے دونوں ایکٹروں کو معلوم تھا کہ کیا کہنا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔

گوتم نے دروازہ کھولا۔ وہاں سے اپنا قیمتی بٹوہ نکالا۔ اُس میں سے ایک پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر بھولو کی طرف بڑھایا۔ بچے نے وہ نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''اب؟'' گوتم نے سوال کیا۔

''اب اچھا لگتا ہے۔'' بھولو نے جواب دیا اور دودھ کا گلاس اُٹھا کر ایک سانس میں غٹ غٹ پی گیا (تب ہی تو وہ اتنا موٹا تازہ تھا) پھر اُس نے سلام کیا۔ گلاس ٹرے میں واپس رکھا، ٹرے اُٹھائی اور وہاں سے چلتا بنا۔

دروازہ بند ہوا تو گوتم نے اطمینان کا سانس لیا۔ روز صبح کا کام ہو گیا تھا۔ مسٹر شرما سے فون پر بات چیت اور آنٹی کو تسلی ہو گئی کہ دودھ کا گلاس پی لیا گیا۔ نہ جانے کیوں یہ دونوں آج تک اُسے بچہ ہی سمجھتے تھے۔ بجائے اس سوال پر غور کرنے کے گوتم نے فون اُٹھایا اور ٹیلی فون آپریٹر سے کہا۔

''لیگی!''

''یس سر!''

پھر اُس نے نمبر ملانے کے لیے کہا۔'' تھری۔سیون۔ڈبل ٹو۔فائیو ایٹ۔''

لیگی نے مسکرا کر کہا۔'' یس سر۔ اُف کورس سر۔ اِن اے منٹ سر۔'' اس کو معلوم تھا کہ یہ کس کا نمبر ہے دل ہی دل میں اُس نے سوچا'' مایا کتنی خوش قسمت لڑکی ہے؟''

ایک شاندار فلیٹ کے ایک سجے ہوئے بیڈ روم میں خوب صورت جسم والی مایا سونا چند گیارہ بجے کے بعد ابھی ابھی سو کر اُٹھی تھی۔ لیٹے لیٹے اُس نے لال رنگ کا ٹیلی فون اُٹھایا اور بولی۔ ''ہیلو۔'' دوسری طرف کی آواز سن کر ہی اُس کے چہرے پر خوشی اور مسکراہٹ پھیل گئی۔'' ہائے! ڈارلنگ!۔ہپی برتھ ڈے!''

''تھینک یو، مایا۔'' گوتم اپنی کرسی پر لیٹا ہوا کہہ رہا تھا۔'' میں تو اپنے آپ کو پچیس برس کا بڑھا محسوس کر رہا ہوں۔''

''نان سنس۔'' مایا نے منہ بناتے ہوئے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔' کہو میرے بھیجے ہوئے پھول ملے؟''

''صبح سویرے ہی ملے۔'' گوتم نے جواب دیا اور پھر کرسی سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔'' جانتی ہو اُن میں سے کیسی خوشبو آ رہی تھی؟''

مایا نے اپنے گھنے مگر چھوٹے کٹے ہوئے بالوں کو بڑے انداز کے ساتھ ایک ہاتھ سے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔'' بھلا کیسی؟''

''تمھارے پیار کی؟'' گوتم نے بڑے خلوص سے کہا۔

''واہ ڈارلنگ!'' مایا نے فون سے کہا۔'' تم کتنی خوب صورت باتیں کرتے ہو؟ اچھا۔اب بتاؤ۔آج کا پروگرام کیا ہے؟ تمھاری سالگرہ کیسے منائی جائے؟''

گوتم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔'' اُو برائے شیراٹن ہوٹل میں لنچ، رات کو ڈنر اور ڈانس مگر سب سے پہلے۔A PLUNGE IN THE POOL

جس تالاب میں چھلانگ لگانے کا ذکر گوتم نے مایا سے کیا تھا وہ بمبئی کے اوبرائے شیرائن ہوٹل کی چوتھی منزل پر آسمان کے نیچے تھا۔ ایک طرف سڑک پار سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا دوسری طرف نریمن پوائنٹ کی تیس تیس منزلہ عمارتیں تھیں جن میں وہ بھی تھی۔ جہاں گوتم کا اپنا دفتر تھا۔ سمندر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی میرین ڈرائیو کی سڑک اور اُس کا لمبا چوڑا فٹ پاتھ جو کمان کی طرح بل کھاتا ہوا چوپاٹی تک پہنچ جاتا تھا۔ چوپاٹی سے پرے مالا بار ہل تھی۔ جہاں نئے بنے ہوئے اسکائی اسکریپر جو پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے تھے۔ دور سے ہی نریمن پوائنٹ والی بلڈنگوں کا منہ چڑا رہے تھے۔

لنچ سے پہلے گھنٹہ بھر تک گوتم اور مایا اس تالاب کے صاف پانی میں (جو نیلا لگتا تھا کیوں کہ تلی میں نیلے ٹائل لگے ہوئے تھے) تیرتے رہے۔ مایا کا جسم لال رنگ کی BIKINI کے دو چیتھڑوں میں کتنا سڈول اور شفاف لگتا تھا کہ نظر اس کے خوب صورت چہرے سے ہوکر، سینے کے دلکش ابھاروں اور اُس کے سپاٹ سفید پیٹ سے ہوتی ہوئی اُس کی ٹانگوں پر سے پھسلتی ہوئی، اُس کے سڈول ٹخنوں اور پیروں تک پہنچ جاتی تھی۔ پانی میں سے جھلکتی ہوئی وہ جل پری لگتی تھی۔ تیرتی بھی تھی مچھلی کی طرح۔ گوتم خود بھی غوطہ لگانے اور تیرنے دونوں میں ماہر تھا لیکن مایا کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

وہ دونوں پانی کے اوپر تیرے، پانی کے اندر تیرے، ڈبکیاں لگائیں، دوڑیں لگائیں۔ ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑائے۔ غرض بچوں کی طرح کھیلتے رہے یہاں تک کہ تھک کر مایا نے کہا:

''چلو گوتم۔ آج سوئمنگ بہت ہوگئی۔''

''آؤ۔ کھانا کھانے سے پہلے DRINKS ہوجائے۔''

میز پر گوتم کے سامنے بیئر کی خالی بوتل اور بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔

مایا کے سامنے ایک نازک سے جام میں گملٹ GIMLET (جن اور لائم جوس) دھری ہوئی تھی۔

''ذکر بھی شراب کا ہو رہا تھا۔

''ڈارلنگ'' مایا کہہ رہی تھی۔ ''کل رات تم نے بہت وہسکی پی لی تھی مگر پارٹی میں بڑا مزا آیا۔''

گوتم مایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہا تھا۔'' مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ تم بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ سب لوگوں کی نظریں تم پر ہی تھیں اور میں جلن کے مارے مرا جا رہا تھا۔''

"ARE YOU VERY JEALOUS GAUTAM?"

"YOU, MAYA VERY JEALOUS!" گوتم نے بڑی صفائی اور شدت سے اقرار کیا۔

'' مجھے تو کسی کا تم سے ہنس کر بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا اور وہ داڑھی والا لنگور جو تمھارے ساتھ ڈانس کر رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اُسے مار مار کے حلوا بنا دیتا۔'' اور گوتم کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ واقعی اُس کا ارادہ بہت خوفناک تھا۔

اب مایا بڑا بھولا منہ بنا کر پوچھ رہی تھی: '' کیا تم مجھے خرید لینا چاہتے ہو؟''

'' ارادہ تو ایسا ہی ہے۔''

'' کیا قیمت دو گے؟'' مایا نے ہنس کر پوچھا۔

مگر گوتم کے جواب میں ہنسی بالکل نہیں تھی۔ وہ از حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔'' کیا قیمت دوں گا۔؟ اپنی محبت، اپنا پیار، اپنا گھر، اپنا نام اور پھر مایا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر'' مایا اِسے ہنسی میں مت اڑا دینا۔ میں اس سودے کے لیے بہت سیریس ہوں کچھ پیشگی چاہیے تو یہ حاضر ہے۔'' اس نے مخمل کی ڈبیہ کھولی۔

اندر ایک ہیرے کی جڑی ہوئی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

انگوٹھی کو دیکھ کر مایا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

'' ڈارلنگ یہ انگوٹھی تو انمول ہے۔''

اور گوتم نے کہا۔ مایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔'' جس کے لیے ہے وہ بھی تو انمول ہے پہن کر تو دیکھو۔''

مایا نے اپنے ہاتھ کی پتلی لمبی گوری انگلیاں میز پر پھیلا دیں۔

گوتم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بیچ کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی اور انگوٹھی کے ہیرے سورج کی روشنی میں جھلملاتے رہے، شاید کھلکھلا کر ہنستے رہے۔

O

انسانیت کا ننگا ناچ

رات کو سارے کا سارا اوبرائے شیراٹن ہوٹل جگمگا اُٹھتا ہے۔

برسات میں بڑی بڑی کاروں کا کارواں آتا رہتا ہے، جاتا رہتا ہے۔ ایک بڑھیا موٹر جاتی ہے تو دوسری آتی ہے۔

سفید ڈنر جیکٹ۔ کالی ڈنر جیکٹ نیلے سوٹ۔ عورتوں کے فراک اور ڈریس جو بدن کو ڈھکتے کم ہیں اور ظاہر زیادہ کرتے ہیں۔ جگمگاتی ہوئی، بدن پر چپکی ہوئی ساڑیاں جو کسی ناگن کی کینچلی معلوم ہوتی ہیں۔ بغیر آستینوں، بغیر کمر کی چولیاں جن کا کام چھاتیوں کے اُبھاروں کو ڈھانکنے کے بجائے اُن کو نمایاں کرنا ہے۔ ساتھ میں آج کل کے فیشن کے کپڑے پہنے ہوئے لا اُبالی نوجوان جن کے بال لمبے ہیں وہ لڑکے ہیں جن کے بال چھوٹے ہیں وہ لڑکیاں ہیں۔ لڑکیاں پتلونیں پہنے ہیں۔ لڑکے غرارے نما بیل باٹم پہنے ہیں۔ لڑکیاں ملیٹری ٹائپ کی قمیصیں پہنے ہیں۔ لڑکے رنگ برنگی چھپی ہوئی بش شرٹیں یا رنگین چکن کے کُرتے۔

کسی کو نہیں معلوم کہ یہ کون ہیں، یہ کہاں سے آئے ہیں؟ یہ کہاں جا رہے ہیں؟

ایک موٹر سے دو جوڑے دو مرد اور دو عورتیں اُترے۔ یہ موٹر گئی تو ایک لمبی چوڑی لال رنگ کی موٹر تیز رفتاری سے آئی، دفعتاً بریک لگانے کی آواز آئی۔ موٹر نے ایک خاموش جھٹکا کھایا اور رُک گئی۔

لمبے چوڑے داڑھی والے دربان نے بڑھ کر موٹر کا دروازہ کھولا۔ اندر سے نیلی سلک کی کامدانی کے کام کی جھلملاتی ہوئی ساڑی پہنے مایا اُتری۔ دوسری طرف سے سیاہ پتلون اور کالے پیٹینٹ لیدر کے جوتوں کے اوپر سفید کمخواب کا ڈنر جیکٹ اور لال رنگ کی بوٹائی لگائے گوتم اُترا۔

دربان نے مایا کو ''گڈ ایوننگ، میڈم'' گوتم کو ''سلام'' گوتم صاحب'' کہا۔ گوتم نے کار کی چابیاں اُس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''کہو گوربخش سنگھ کیسے ہو؟'' دربان نے شیشے کے بھاری دروازے کے کواڑ کھولے اور پہلے مایا پھر گوتم ہوٹل کے لاؤنج میں داخل ہو گئے۔

لاؤنج بوری بندر اسٹیشن کے تھرڈ کلاس ویٹنگ ہال سے بڑا تھا۔ لمبائی میں ہوٹل کے مختلف کاؤنٹر تھے۔ یہ انکوائری کا، ریسپشن کا، یہ رجسٹریشن کا۔ پھر آدھی درجن لفٹ تھے۔ دوسری طرف اونچی اونچی کھڑکیاں تھیں۔ جن کے شیشوں میں سے سمندر کے کنارے کی سڑک کا اور سمندر کا نظارہ ہو سکتا تھا۔ چوڑائی میں دونوں طرف زمین سے اونچی چھت تک ایک بین الاقوامی شہرت کے ہندوستانی آرٹسٹ کے دو ''مورل'' اسپاٹ دیوار پر رنگوں سے پینٹ نہیں کیے گئے تھے بلکہ اُبھرے ہوئے تھے۔ کہیں ہندی کا V بنا ہوا تھا، کہیں انگریزی کا A، کہیں عجیب و غریب شکلیں، لائنیں، دائرے، تکونیں بنی ہوئی تھیں، اُبھری ہوئی تھیں۔ آرٹ کا بڑا بھاری بھرکم فولادی، وزنی، سنگین اور پیچیدہ مظاہرہ تھا۔ یہ دیکھنے والے، آرٹ کے اس مظاہرے کو دیکھ کر بہت مرعوب ہوتے تھے کچھ لوگ تعریف بھی کرتے تھے لیکن کوئی اس کا مطلب سمجھ نہ پاتا تھا، شاید اس عظیم آرٹسٹ نے سرمایہ دارانہ سماج (جس کا مظہر یہ عظیم الشان ہوٹل تھا) کے ساتھ ایک عملی مذاق کیا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ صرف روپے کی مدد سے آرٹ کا A یا V تمھاری سمجھ بوجھ کے باہر ہے!

مگر گوتم اور مایا اتنی بار اس ہوٹل میں آئے تھے اور ایک پھسلتی ہوئی نظر ڈالنے کے سوا انھوں نے آج تک اس آرٹ کو نہ سمجھا تھا، نہ سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اُن کے لیے یہ ہوٹل کی شان بڑھانے کے لیے کوئی آرائش کی چیز تھی۔ جیسے جناتی جھاڑ فانوس، چھت سے لٹکے ہوئے تھے جن کے سائز کو دیکھ کر ہی ہوٹل کی عظمت کا رعب پڑ جاتا ہے۔ آج رات تو وہ دونوں ایک دوسرے میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ اُنہیں کچھ نظر ہی نہ آ سکتا تھا۔ اگر دوست اُن کو آواز دے کر نہ روکتے تو شاید گوتم اُن کی طرف بھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا۔

'ہیلو گوتم۔ ہائے مایا۔'

ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ خوب صورت، خوش پوشاک — شاید دونوں فلم اسٹار تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔

''کہو بھائی۔ تم لوگوں کی ENGAGEMENT پارٹی کب ہو رہی ہے۔''

''جلدی ہی ہو جائے گا۔'' گوتم نے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔

''مایا کے ڈیڈی ممی او۔ ٹی گئے ہوئے ہیں اُن کی واپسی کا انتظار ہے۔''

''دیکھو مایا۔ ہمیں انوائٹ کرنا نہ بھولنا۔''

''یاد رکھنا، گوتم۔ میں دوستوں کی شادی میں صرف شامپین پیتا ہوں۔''

''ڈونو، فکر کیوں کرتے ہو۔'' گوتم نے ہنس کر کہا۔ ''تمھیں تو شامپین کے ٹب میں ڈبو دوں گا۔''

''ہم تو ڈوبیں گے صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔''

اور سب ہنس پڑے۔ یہ بمبئی کی خوش باش، خوش پوشاک سوسائٹی تھی جس میں ایسے مذاق چلتے ہی رہتے تھے۔ دو باتیں کیں، دو مذاق کیے، دو پیگ وہسکی کے پیے۔ پھر تمھارا یہ راستہ ہمارا وہ راستہ۔

''بائی بائی۔''

"SEE YOU"

"DON'T FORGET US"

"DON'T YOU WORRY"

''او کے۔ بائی۔ بائی۔''

اگلے لمحے کو گوتم اور مایا آٹومیٹک لفٹ میں تھے۔ جس میں کوئی لفٹ چلانے والا نہیں ہوتا۔ ابھی دروازہ بند نہیں ہوا تھا کہ گوتم کے بھوکے ہونٹ مایا کے پیاسے ہونٹوں کی طرف بڑھے۔ اُس کے بعد لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا اور اس تیز رفتار لفٹ میں بھی بیسویں منزل تک پہنچتے پہنچتے نہ گوتم کے ہونٹ بھوکے رہے اور نہ مایا کے ہونٹ پیاسے۔

پینٹ پاؤڈر، نقلی بالوں کی وگ، کسے ہوئے بریسیر، تنگ لباس اور چمکتے ہوئے نقلی

جواہرات سے بنی ہوئی' خوب صورت' کیبرے سنگر گا رہی تھی۔

ہاں اُٹھا لے اپنا جام کیا تجھے کسی سے کام
اُس چھلکتے جام میں ڈبو دے اپنے صبح و شام

مگر گوتم اور مایا کو اس دعوت نامے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُن کی سجی ہوئی میز پر (جو خاص طور پر اسٹیج کے بالکل قریب رکھی گئی تھی۔) ایک شامپین کی بوتل برف میں لگی رکھی تھی۔ جس میں سے ویٹر بار باراُن کے جام بھر رہا تھا لیکن وہ خالی کرتے جا رہے تھے۔

حسن بھی خرید لے، عشق بھی خرید لے
روشنی خرید لے، چاندنی خرید لے
زندگی خرید لے۔ جیب میں اگر ہیں دام

گانا اس ماحول کے مطابق تھا جہاں حسن اور عشق، شباب اور شراب ہر چیز خرید کر لی گئی تھی۔ ڈانس فلور پر ادھیڑ اور جوان جوڑے شراب پی کر ایک دوسرے کے ساتھ ناچ رہے تھے۔ اس جگہ آنے کے لیے ان کو تقریباً سو روپے فی کس خرچ کرنا پڑا تھا اور مرد یا لڑکے جن کی جیب سے یہ روپیہ گیا تھا وہ اس کوشش میں تھے کہ اِس رات کے ختم ہونے تک اُس کی پوری قیمت وصول کر لیں۔ اسی لیے وہ اپنی اپنی لڑکی کو اپنی آغوش میں لیے بینڈ کی دھن پر، گانے والی کی ہر لَے پر ناچ رہے تھے، تھرک رہے تھے، پھڑک رہے تھے، پھدک رہے تھے۔ کوئی لڑکی اپنے لڑکے یا مرد کے گلے میں بانہیں ڈالے تھی۔ کوئی مرد لڑکی کو اپنے سینے سے چپکائے ہوئے تھا۔ کچھ مرد، عورت، آنکھیں بند کیے ایک دوسرے کی بانہوں میں ڈول رہے تھے۔

گوتم نے پہلے وہسکی پی تھی۔ پھر دو تین گلاس شامپین کے چڑھائے تھے۔ جب وہ مایا کے ساتھ ڈانس کرنے کھڑا ہوا تو اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اُس وقت اُس نے دیکھا کہ ڈانس فلور کے چاروں طرف شیطان کی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ڈانس کا ماحول رومانی اور ہیجان انگیز بنانے کے لیے روشنی کبھی لال ہوتی تھی کبھی ہری۔ کبھی جل جاتی تھی۔ کبھی بجھ جاتی تھی۔

روشنی۔

اندھیرا۔

لال روشنی۔
سبز روشنی۔
پھر اندھیرا۔
پھر روشنی۔

گوتم مایا کے دھڑکتے ہوئے سینے کو اپنی چھاتی سے لگائے ہوئے ڈانس کر رہا تھا۔ وہ مایا کے سانس کو اور اُس کے دھڑکتے ہوئے دل دونوں کو محسوس کر سکتا تھا۔ مایا کے بدن میں سے کتنی خوشبو آ رہی تھی جیسے وہ پھولوں کی بنی ہوئی ہو۔ کیا یہ کوئی سینٹ تھا جو اُس نے لگا رکھا تھا؟ یا اُس کا پسینہ بھی خوشبودار تھا؟ کیا اُس میں خوشبو کے علاوہ نشہ بھی تھا؟ یا اُس تمام وِسکی اور شامپین کا اثر تھا جو اُس نے پی رکھی تھی؟

کیبرے سنگر آج جو گانا گا رہی تھی وہ کتنا حسب حال تھا۔ پھر وہ نہ صرف اُسے گا رہی تھی، بلکہ اُس گانے کی دُھن پر ناچ بھی رہی تھی، اُس کا ناچ صرف اسٹیج پر نہیں تھا۔ وہ سارے ہال میں گھوم گھوم کر ناچ رہی تھی۔ اپنا پیغام ہر ناچنے والے، ہر ناچنے والی، ہر کھانا کھانے والے، ہر کھانا کھانے والی کے پاس پہنچا رہی تھی۔

جو تجھے بُرا کہیں
پیار کو خطا کہیں
تو بھی میری جاں اُنہیں
دور سے ہی کر سلام

بینڈ کی لے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سب ناچنے والے اب ڈبل رفتار سے ناچ رہے تھے، تھرک رہے تھے، ناچنے والیاں اپنے کولھے مٹکا رہی تھیں، اُن کے سینے کا اُتار چڑھاؤ بھی اب اِسی تیز لے پر چل رہا تھا۔ سب خوش تھے سب نشے میں تھے۔ سب نے دُنیا کو، اس کی تلخ حقیقتوں کو بھلا رکھا تھا، انہوں نے اس وقت اپنے آپ کو بھلا رکھا تھا۔ خود فراموشی ہی اس ڈانس کا اصل مقصد تھا۔ گوتم نے سُنا تھا کہ کسی زمانے میں یا شاید آج کل بھی، یوگا کے 'دھیان' میں دنیا جہان کو بھول کر، یوگی اپنی آتما کو اور اپنے شریر کو آزاد چھوڑ دیتا تھا، روتا تھا، ہنستا تھا، گاتا تھا، ناچتا تھا۔ ایسے ہی قوالی کی مست آور تانیں

سن کر درویش اپنے آپ کو بھلا دیتے تھے! 'حال' میں آجاتے تھے، روحانی نشے سے چور ہو کر ناچنے لگتے تھے۔ کیا ہم سب (اُس نے ناچتے ناچتے سوچا) موجودہ زمانے کے یوگی ہیں، درویش ہیں جو اس طریقے سے اپنے پرماتما کو، خدا کو، اپنی آتما کو، اپنی خودی اور بے خودی کو پانے کے لیے یہ سب حرکتیں کرتے ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ ہم کون ہیں؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اور کیوں؟

لیکن یہ وقت فلسفیانہ نکتے سوچنے کا نہیں تھا۔

کیبرے سنگر چلی گئی تھی۔

بینڈ کی لے اور تیز ہو گئی تھی۔

ناچنے والے مگن ہو کر ناچ رہے تھے۔ تیز اور تیز۔ اور تیز۔

اب ایک اسٹرپ ٹیز ڈانسر اسٹیج پر آچکی تھی۔

وہ بینڈ کی لے پر اپنے کپڑے اُتار رہی تھی۔

تھرک تھرک کر مٹک مٹک کر، انداز دیکھا کر۔

ہال میں اس تیز لے پر ہر کوئی ناچ رہا تھا۔

ڈانسر اپنے کپڑے اُتار رہی تھی۔

ناگن اپنی کینچلی اُتار رہی تھی۔

کیا ہماری یہ تہذیب، یہ کلچر، یہ آرٹ، یہ ناچ، یہ گانا بھی ایک زہریلی ناگن ہے؟

گوتم کے نشے اور ناچ سے مدہوش دماغ نے سوچا کہ یہ ایک بھدے بدن کی عورت نہیں ہے جو اپنے کپڑے اُتار رہی ہے بلکہ یہ ہماری دُنیا ہے، ہماری تہذیب ہے، جو آج ہمارے سامنے ننگی ہو رہی ہے اور ہم ناچ رہے ہیں، تالیاں بجا رہے ہیں ہنس رہے ہیں۔

انسان ہنس رہے ہیں۔

دیواروں پر بنے ہوئے شیطان ہنس رہے ہیں۔

اپنے ہیبت ناک دانت دکھا رہے ہیں۔

کیا وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں؟ (گوتم نے سوچا)

کیا وہ ہم سب پر ہنس رہے ہیں؟

کیا وہ انسانیت کے اس ننگے ناچ پر ہنس رہے ہیں؟

انسانیت کا ننگا ناچ۔

جو اور تیز ہو رہا تھا۔

اور تیز۔

اور تیز۔

اب ناچنے والے خوش ہی نہیں تھے۔

اب ناچنے والے مدہوش ہی نہیں تھے۔

اب ناچنے والے اور ناچنے والیاں پاگل ہو چکے تھے۔

اور اُن کی حرکتوں کو دیکھ کر دُنیا کے سارے شیطان ہنس رہے تھے۔

پھر ڈانس ہال کی روشنیاں ایک دم بجھ گئیں۔

اور گوتم کے لیے صرف ایک اصلیت، صرف ایک نشہ، صرف ایک فلسفہ، صرف ایک زندگی، صرف ایک موت رہ گئی۔

اور وہ تھی مایا جو اُس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور جو اس اندھیرے میں بھی خوب صورت لگتی تھی مایا جو انسان تھی، مایا جو شیطان تھی۔

رات کے سناٹے میں دور گھڑیال دو بجا رہا تھا۔ مگر رادھا بائی گوتم کے انتظار میں اب تک جاگ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کے ایک بڑے لیمپ کی روشنی میں صوفے پر بیٹھی کوئی امریکن میگزین پڑھ رہی تھی۔

موٹر کے تیز رفتاری سے آنے کی، جھٹکا لگ کر رُکنے کی آواز آئی۔ انجن کی دھڑ دھڑاہٹ بند ہوگئی۔ گوتم کے قدموں کی آواز صدر دروازے تک آئی پھر گوتم اور اُس کے نوکر رامو کی آوازیں، جب تک کہ گوتم آ کر سو نہ جائے رامو بیچارے کو بھی جاگنا پڑتا تھا۔

''صاحب'' رامو کہہ رہا تھا۔ آپ کدھر جا رہے ہیں؟ اِدھر آیئے۔ آپ گر رہے جا رہے ہیں!

اور پھر گوتم کی آواز جو نشے میں لڑکھڑا رہی تھی۔ ''ارے بدّھو جانی کہیں کے!''

''صاحب۔ میں جانی نہیں رامو ہوں لگتا ہے آج آپ نے بہت زیادہ پی لی ہے۔''

گوتم جس کا سفید کمخواب کا کوٹ کندھے پر تھا، جس کی لال بوٹائی کالر میں لٹکی ہوئی تھی اور جس کے سفید سلک کے قمیض پر لپ اسٹک کے نشان بنے ہوئے تھے، رامو کے سہارے بھی لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ جب رادھا بائی وہاں پہنچی۔ گوتم کہہ رہا تھا۔ ''کون کہتا ہے میں نے شراب پی ہے؟ ارے یہ مستی شراب کی نہیں خوشی کی ہے۔''

رادھا بائی نے دیکھتے ہی ڈانٹ پلائی۔ ''گوتم، یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پھر پی کر آئے ہو؟''

گوتم نے اپنی نشیلی آنکھیں اُٹھا کر اپنی پھوپھی کی طرف دیکھا۔ ''نہیں...... مائی ڈیئر آنٹی۔ میں پیے ہوئے نہیں ہوں۔ میں بہت خوش ہوں۔'

آنٹی نے سفید قمیض پر لال لال ہونٹوں کے نشانوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ہاں وہ تو مجھے نظر آ رہا ہے۔ کون ہے وہ لڑکی؟''

'وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے، آنٹی۔ گوتم نے جواب دیا۔ اور پھر سرگوشی کے انداز میں جیسے بہت بڑا راز بتا رہا ہو۔ ''وہ تو مایا ہے۔ میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

مایا کا نام سُن کر رادھا بائی کو اطمینان ہو گیا۔ ''مایا اچھی لڑکی ہے۔ باپ کے پاس زیادہ روپیہ تو نہیں پھر بھی دس بارہ لاکھ تو ہوگا ہی۔ مایا اسمارٹ بھی ہے۔ بزنس میں تمھارا ہاتھ بٹائے گی۔''

اپنی پھوپھی کی زبان سے مایا کی تعریف سُن کر گوتم کے چہرے پر نشے کی حالت میں بھی ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''تو مائی ڈیئر آنٹی۔ تم اُس کی ممی ڈیڈی سے ملنے جاؤ گی نا؟''

''اچھا بابا، جاؤں گی۔'' رادھا بائی نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

''مگر اب تم جا کر سو جاؤ۔'' پھر رامو سے۔ ''جا رامو لے جا اسے۔''

سیڑھیوں پر گوتم کو سہارا دیتے ہوئے رامو نے کہا 'چلیے صاحب۔ اب آپ آرام سے سو جائیے۔''

آہستہ آہستہ، لڑکھڑاتا، نشے میں اول فول بکتا، گوتم سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور رادھا بائی کے چہرے پر عجیب و غریب جذبات کے آثار اُبھرتے آ رہے تھے۔ اپنے شرابی بھتیجے کے لیے حقارت اور ایک گہری نفرت اور ساتھ میں ایک عجیب اطمینان اور فاتحانہ احساس کی ہلکی سی مسکراہٹ جیسے اُس کو یقین ہو چلا ہو کہ اُس کی برسوں کی محنت بیکار نہیں گئی۔

○

ہیلو، ڈارلنگ

اگلے دن گوتم چندرا اپنے دفتر میں پہنچا تو کلرکوں، چپراسیوں، ٹیلیفون آپریٹر سب نے دیکھا کہ وہ آج بہت خوش معلوم ہوتا ہے۔

ٹیلی فون آپریٹر نے کہا: ''گڈ مارننگ سر۔''

گوتم نے مسکرا کر کہا: ''گڈ مارننگ لیگی۔''

''آفس بوائے نے کہا: ''سلام صاحب۔''

'گوتم نے اُس کا پھولا ہوا گال تھپتھپا کر کہا۔ ''کہو بھولو کیسے ہو؟''

اس کی سکریٹری مسز شراف نے کہا۔''گڈ مارننگ سر۔''

گوتم نے اپنے دروازے کے سامنے ٹھہر کر کہا: ''گڈ مارننگ مسز شراف ایک منٹ کے لیے ذرا اندر آنا۔''

''او۔کے'' سکریٹری نے کہا اور گوتم کے پیچھے وہ اپنے منی فراک میں سے نکلی ہوئی گوری ٹانگوں کی نمائش کرتے ہوئے اندر پہنچ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک فائل تھا۔

''سٹ ڈاؤن۔سِٹ ڈاؤن SEAT DOWN۔'' گوتم نے کہا۔ جب کہ وہ خود اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا۔

بیٹھتے ہوئے سکریٹری نے کہا:''سر۔آج آپ بہت خوش نظر آتے ہیں۔''

''میں آج سچ مچ بہت خوش ہوں، کہو کوئی ضروری خط ہے؟''

'اوہ،نو،سر USUAL PARTIES کے USUAL INVITATIONS ہیں۔بس۔''

''سب کو میری طرف سے THANKS اور REGRETS لکھ دو۔'' گوتم نے جلدی سے کہا کہ کہیں مسز شراف دعوت ناموں کو پڑھنا نہ شروع کر دے۔''اگلے دنوں میں بہت BUSY رہوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ بے صبری سے اُٹھ کر کھڑا ہوا۔

مسز شراف مالک کو اٹھتا دیکھ کر ادب کے مارے اُٹھنے لگی۔

گوتم نے اُس کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کے لیے کہا۔

"NO,ME, YOU KEEP SITTING. I AM A BIT EXCITED TODAY."

''اور پھر انگریزی چھوڑ کر ہندوستانی میں کہا۔'' جانتی ہو میں شادی کرنے والا ہوں۔''

سکریٹری نے شیک ہینڈ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"CONGRATULATIONS,SIR"

اب گوتم میز کے کنارے پر بیٹھ گیا تھا:''اچھا یہ تو بتاؤ شادی کر کے کیسا محسوس ہوتا ہے؟''

مسز شراف اس سوال کے لیے تیار نہیں تھی۔کسی قدر بوکھلا سی گئی۔اب یہ کہنا تو بڑا DIFFICULT ہے،سر۔''

''مگر تم دونوں خوش تو ہو۔''

''یس سر۔بہت خوش ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ خوش بھی تھی اور شرما بھی رہی تھی۔

''کتنے بچے ہیں؟''

''مسز شراف نے سر جھکا کر کہا۔''ابھی تو بس ایک ہی ہے۔''

گوتم نے جوش میں آ کر کہا:'' ہمارے دو بچے ہوں گے اور کوشش کریں گے کہ دونوں جڑواں ہوں'' پھر یہ سوچ کر کہ شاید مسز شراف کو ہندوستانی کے لفظ جڑواں کے معنی نہ معلوم ہوں۔

اُس نے انگریزی میں بھی ترجمہ کر دیا"TWINS,YOU KNOW" ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔''

اور پھر ہنستے ہوئے فیملی پلاننگ کے پوسٹروں کا نعرہ دہرا دیا۔ ''ہم دو اور ہمارے دو۔ کیوں مسز شراف۔ کیا خیال ہے؟''

''مسز شراف بے چاری کمپنی کے مالک سے اور کیا کہتی؟ "VERY GOOD IDEA SIR"

''تھینک یو مسز شراف'' گوتم نے پھر اپنی بے صبری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ '' اچھا اب تم جا سکتی ہو۔ مجھے ایک ٹیلی فون کرنا ہے۔ " A VERY PERSONAL CALL"

سکریٹری اُٹھ کر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ ''ضرور کیجیے۔ میں جاتی ہوں۔ گڈ لک سر۔''

جیسے ہی دروازہ بند ہوا گوتم نے ٹیلی فون اُٹھایا۔

''لیگی!''

''لیس سر'' آپریٹر کی آواز آئی۔

'تھری۔ سیون۔ ڈبل ٹو۔ فائیو۔ ایٹ۔'' گوتم نے نمبر بتایا۔

لیگی کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اُسے معلوم تھا یہ کس کا نمبر ہے'' لیس سر۔ آف کورس، سر۔ ان اے منٹ، سر۔''

مایا کے فلیٹ میں باہر ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون بجا تو اُس کی ایک موٹی تازی آیا نے اُٹھایا۔

''ہیلو ڈارلنگ۔'' گوتم کی آواز آئی۔

'' آیا یہ سن کر بوکھلا سی گئی۔ ''ارے یہ ڈارلنگ ڈارلنگ کیا کرتا رے؟''

''گوتم آیا کی آواز پہچان گیا۔'' کون؟ جمنا بائی؟ ہم گوتم صاحب بولتے ہیں۔''

آیا شرمندہ ہو گئی'' اوہ۔ سلام صاحب۔ معاف کرنا صاحب۔''

'اچھا۔ اچھا۔ اپنی میم صاحب کو فون دو۔''

''وہ تو ابھی سو رہی ہیں صاحب، کہیے تو اُٹھا دوں؟''

''نہیں نہیں۔'' گوتم نے کہا۔ ''اُنہیں سونے دو۔ وہ اُٹھیں تو کہنا ہمارا فون آیا تھا۔''

مایا سے بات نہ ہو سکی۔ مایوس ہو کر گوتم نے فون نیچے رکھا ہی تھا کہ دفتر کے اندرونی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو''

''ہیلو، گوتم۔ مائی بوائے۔'' مسٹر شرما کی آواز آئی۔'' کہو کیسے ہو؟''

گوتم نے ان کے الفاظ ہی دہرا دیے:'فرسٹ کلاس سر'

''تم مجھے سر سر کیا کہتے ہو؟ ان سب کمپنیوں کے تم چیئر مین ہو۔ مسز شرما نے جھوٹی چاپلوسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔'' سچ پوچھو تو مالک ہو اور ہم تمھارے نوکر ہیں۔''

مگر گوتم جھوٹی کسر نفسی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ حقیقت کا اظہار کر رہا تھا۔ مسٹر شرما، سر۔ آپ ہی تو یہ سب کمپنیاں چلاتے ہیں۔ میں بزنس وزنس کیا جانوں؟''

اب مسٹر شرما نے فون کرنے کی اصل وجہ بتائی۔'' مگر اتنا ضرور جانتے ہو کہ آج شام کو چھ بجے بورڈ آف ڈائریکٹرس کی میٹنگ ہے۔''

''اوہ میں تو بھول ہی گیا تھا، سر۔ آئی مین مسٹر شرما۔'' گوتم گڑ بڑا کر بولا۔ میں نے تو مایا کو انوائٹ کیا ہوا ہے۔''

''مایا کو کل انوائٹ کر سکتے ہو۔'' مسٹر شرما نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔'' یہ میٹنگ بہت IMPORTANT ہے۔ اب تم پچیس برس کے ہو گئے ہو۔ تمھیں ہی PRESIDE کرنا ہوگا۔''

گوتم نے آج تک بورڈ کی کسی میٹنگ میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ نہ اُسے کبھی دلچسپی دلائی گئی تھی۔ اُس نے بددلی سے پوچھا۔'' میٹنگ دیر تک تو نہیں چلے گی؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' مسٹر شرما نے جواب دیا۔'' کبھی کبھی بڑی لمبی بک بک چلتی ہے۔ میری مانو تو یہ اپائنمنٹ کینسل کر دو۔''

''اچھا، مسٹر شرما۔'' گوتم نے بے دلی سے مردہ سی آواز میں کہا۔

اور فون نیچے رکھ دیا اور فکر مند منہ بنا کر سوچ میں بیٹھ گیا۔

مگر گوتم ہنس رہا تھا۔ کم سے کم اُس کی تصویر ہنس رہی تھی۔ وہ تصویر جو مایا کے بیڈ روم میں اُس کے پلنگ کے پاس ایک تپائی پر رکھی تھی۔

مایا نے کروٹ لے کر آنکھیں کھولیں اور آواز دی۔'' آیا!''

''جی مس صاحب'' کالی موٹی آیا نے دروازے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

''ہمارا کوئی فون آیا تھا کیا؟''

'جی۔وہ۔گوتم صاحب کا ٹیلی فون آیا تھا۔''

''اچھا تم جاؤ۔''

''سلام میم صاحب'' اور مایا نے سنترے کے جوس کا گلاس رکھ کر ٹیلی فون اُٹھالیا۔

''مسٹر گوتم چندر پلیز۔'' مایا نے نمبر ملا کر کہا۔

یس، مس مایا۔ ٹیلی فون آپریٹر نے کہا اور اُسے بتایا کہ گوتم صاحب بڑی دیر سے اُس کے فون کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں ابھی کنکشن ملاتی ہوں۔

گوتم نے فون اُٹھایا تو پہلے تو بے تعلقی اور بے رُخی کے انداز میں ہیلو کہا اور اگلے پل میں اُس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

''ڈارلنگ۔ میں ابھی سو کر اُٹھی ہوں۔''

گوتم نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔''اور میں اتنی وہسکی اور شامپین پی کے بھی نہیں سو سکا۔ رات بھر میں تمھارے اور اپنے بارے میں سوچتا رہا۔ کیوں مایا، لنچ ساتھ کھائیں۔''

"I WOULD LOVE TO, DARLING" مایا نے منہ بنا کر جلدی سے کہا۔'' مگر دو گھنٹے تو مجھے تیار ہونے میں لگیں گے۔''

گوتم کے پاس دوسری بھی تجویز موجود تھی۔''تو چار بجے چائے پئیں۔ کیوں؟''

'اوہ ہو۔ڈارلنگ۔آئی ایم سوری۔ چار بجے تو میرا ہیر ڈریسر سے اپائنٹمنٹ ہے

"I WANT TO LOOK MY BEST WHEN I SEE YOU TO NIGHT"

اب تو گوتم کو صاف بات کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔'' مایا بات یہ ہے کہ وہ ڈنر تو آج کینسل کرنا پڑے گا۔ بورڈ آف ڈائریکٹرس کی میٹنگ ہے آج شام کو، نہ جانے کب ختم ہوگی۔''

مایا روکھی ہو کر بولی:''اس کا مطلب ہے تم مجھ سے آج ملنا ہی نہیں چاہتے۔''

"DONT BE SILLY, MAYA" میں ضرور ملنا چاہتا ہوں مگر کبھی کبھی کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

کل صبح جہاں کہو وہاں ملیں گے۔

"OH THEN, LUCNH AT THE TAJ" مایا نے تجویز پیش کی۔

''او۔ کے'' گوتم نے بڑے جوش سے حامی بھری۔ پھر کہا: ''مگر آج شام کیا کروگی؟''

''تمھیں یاد کروں گی۔'' مایا نے سوچے بغیر جلدی سے جواب دیا'' یا شاید کتاب پڑھوں گی اور تمھیں یاد کروں گی اور شاید جلدی سو جاؤں اور سپنے میں تمھیں دیکھوں گی۔''

''جانتی ہو، مایا۔'' گوتم بات ٹیلی فون پر کر رہا تھا مگر دیکھ رہا تھا مایا کی تصویر کی طرف جو اُس کی میز پر رکھی تھی اور جس میں مایا مسکرا رہی تھی۔'' جانتی ہو، مایا، ساری دنیا میں سب سے سندر، سب سے پیاری، سب سے بھولی بھالی لڑکی کون ہے؟''

''کون ہے؟'' مایا نے بھولی بنتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ تم ہو، مایا۔ تم ہو۔''

اب بھولی لڑکی نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں، ڈارلنگ۔''

''بائی بائی۔''

''او کے۔ بائی۔ بائی۔''

مایا نے فون اُٹھا کر رکھ دیا۔ سگریٹ کا ایک کش لیا۔ کچھ سوچا۔ پھر فون دوبارہ اُٹھایا اور کسی کا نمبر گھمانا شروع کیا۔

مگر یہ نمبر گوتم چندرا کا نہیں تھا!

سر اُتم چندرا کی قدِ آدم آئیل پینٹنگ OIL PAINTING دیوار پر ٹنگی ہوئی بورڈ آف ڈائریکٹرس کی میٹنگ کی نگرانی کر رہی تھی۔

گوتم میز کے ایک کنارے پریسیڈنٹ کی کُرسی پر بیٹھا تھا۔ مگر اُس کے سامنے میز خالی تھی۔ صرف ایک پانی کا گلاس اور ایش ٹرے۔

اُس کے دائیں مسٹر شرما بیٹھے تھے اور سب کاغذات فائل وغیرہ سب اُن کے سامنے ہی رکھے تھے۔ اُن کے پیچھے کمیٹی کا سکریٹری بیٹھا ایک سبز رنگ کے رجسٹر میں میٹنگ کی کارروائی لکھ

رہا تھا مگر ہر بات مسٹر شرما سے پوچھ پوچھ کر۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ کمپنی کو کون چلاتا ہے۔

اس کے بائیں، اُس کی آنٹی رادھابائی بیٹھی اپنے موٹے موٹے شیشوں کی عینک میں سے ایجنڈا کے کاغذات پڑھ رہی تھیں۔

چھ کرسیوں پر باقی ڈائریکٹر بیٹھے تھے۔ کوئی دُبلا، کوئی داڑھی والا، کوئی مارواڑی سیٹھ، کوئی پارسی بزنس مین، سب کھاتے پیتے مالدار دکھائی دیتے تھے۔ سب کی آنکھوں میں بیوپاری چالاکی۔ سب کی مسکراہٹیں کمپنی کے چیرمین گوتم چندرا کو ایک بیوقوف بچّہ سمجھ رہی تھیں۔

مسٹر شرما کہہ رہے تھے: ''جینٹلمین، میں یہ ریزولیوشن پیش کر رہا ہوں جو میں نے خود ڈرافٹ کیے ہیں۔ اُمید ہے آپ سب نے پڑھ لیے ہوں گے۔''

''ہاں، مسٹر شرما۔ سب نے پڑھ لیے ہیں۔''

ایک داڑھی والے سوٹ پہنے ڈائریکٹر نے کہا۔ ''میں سو فی صدی اتفاق کرتا ہوں۔''

''ایک موٹے سے ڈائریکٹر نے کہا۔ ''EXACTLY

رادھابائی نے ہاتھ اُٹھا دیا۔

اُن کو دیکھ کر سب نے ہاتھ اُٹھا دیے۔ یہاں تک کہ گوتم نے بھی۔

مسٹر شرما نے چپکے سے گوتم کے کان میں کہا۔ تمھیں ہاتھ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ JUST RELAX

اور پھر سب ڈائریکٹروں سے مخاطب ہو کر ''ہاں تو میں آپ لوگوں سے DEBENTURES کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ حالانکہ بازار کے بھاؤ اوپر جا رہے ہیں۔''

اس کے بعد مسٹر شرما نے کیا کہا یہ گوتم نے کچھ نہیں سُنا۔

وہ میٹنگ میں ضرور بیٹھا تھا مگر اس کا دماغ اور اُس کا دل کہیں اور تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ وہاں بیٹھے ہوئے ڈائریکٹروں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اُن کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ ڈانس بینڈ کا سنگیت سُن رہا تھا۔ وہ سپنا دیکھا رہا تھا اور اس سپنے میں اُسے صاف نظر آ رہا تھا کہ سامنے لگی سَر اُتم چندرا کی تصویر کے شیشے میں وہ خود اور مایا ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ڈانس کر رہے ہیں۔

وہ بیوپار کی دُنیا سے دور کسی اور ہی رومانی دُنیا میں کھویا ہوا تھا!

دفعتاً تالیاں بجنے کی آواز آئی۔ سنگیت بند ہو گیا۔ تصویر کے شیشے میں دکھائی دیتی ہوئی اُس کی اور مایا کی شکلیں دھیمی پڑتی گئیں۔

اب وہ پھر میٹنگ میں تھا۔ سب تالیاں بجا رہے تھے۔

گھبرا کر گوتم نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کیا ہوا مسٹر شرما؟''

مسٹر شرما نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''کچھ نہیں۔ ہم نے ابھی چیرمین صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایک ریزولیوشن پاس کیا ہے۔''

''کیوں میں نے کیا کیا؟''

''اگر سب کمپنیوں کے چیرمین آپ کی طرح ہوں تو ڈائریکٹروں کو چننا کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''میٹنگ اتنی جلدی ختم ہو گئی۔'' گوتم نے خوش ہو کر کہا اور پھر مسٹر شرما سے پوچھا۔ ''تو اب میں جا سکتا ہوں مایا سے ملنے؟''

○

خون کی لکیر

گوتم خوشی کے ساتویں آسمان پر تھا۔

پہلے اُس نے سوچا فوراً مایا کو ٹیلی فون کرنا چاہیے۔ اپنے کمرے میں جا کر فون گھمایا۔ تھری، سیون، ڈبل ٹو، فائیو، ایٹ۔

آخری نمبر گھما رہا تھا کہ اُسے خیال آیا کہ بغیر اطلاع کے جاؤں تو مایا کتنی خوش ہو جائے گی وہ بیچاری بیٹھی بور ہو رہی ہو گی۔ اچانک میں پہنچ جاؤں گا تو وہ کھل ہی تو اُٹھے گی۔ دوڑ کر مجھ سے لپٹ جائے گی۔

فون چھوڑ کر اُس نے کار نکالی۔

میرین ڈرائیو کے سب سے اچھے اور مہنگے فلورسٹ کی دُکان پر رُکا۔ اُس سے کہا کہ جلدی سے ایک (پھولوں کا؟) گلدستہ بنا دو۔ لال گلاب ہوں۔ للی آف دی ویلی ہو، نرگس اور بوگن ویلا ہوں۔ ''سب بڑھیا پھول ہونے چاہییں کیونکہ یہ گلدستہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی کے لیے ہے'' اور دل میں اُس نے سوچا۔ سب سے خوب صورت اور سب سے پیاری۔

موٹر کو آرام سے چلاتا ہوا وہ ورلی کے سمندر کے کنارے مایا کی بلڈنگ میں پہنچا۔ کار نیچے پارک کر کے لفٹ میں اوپر گیا۔ دروازے پر گھنٹی بجائی۔ شاید مایا خود ہی دروازہ کھولے اُس نے

سوچا۔ ''میں اُسے ٹھوکر کے ڈراؤں گا آج۔''

مگر دروازہ کالی موٹی آیا نے کھولا۔ گوتم کو دیکھ کر وہ بھوچکا رہ گئی۔ مشکل سے دو لفظ زبان سے نکلے۔ ''صاحب؟ صاحب؟۔ آپ؟'' اور پھر وہ آواز پر قابو پا کر بولی۔ ''صاحب اور میم صاحب تو ادٹی گئے ہوئے ہیں۔''

گوتم حیران تھا کہ آج یہ آیا اُس کا راستہ کیوں روک رہی ہے۔ مگر اُس نے سوچا کہ یہ اس غلط فہمی میں ہے کہ میں مایا کے ممی ڈیڈی سے ملنے آیا ہوں۔ بولا: صاحب اور میم صاحب سے تو ہماری آنٹی ملیں گی۔ ہمیں تو مس صاحب سے ملنا ہے۔ اور وہ آیا کو راستے سے ہٹا کر اندر ڈرائنگ روم میں آیا۔ اُس کو خالی پا کر سوچا، مایا بیڈ روم میں ہوگی۔ ''وہیں اُسے SURPRISE دیتا ہوں۔''

''صاحب صاحب'' آیا اب تک گڑبڑا کر کہے جا رہی تھی۔ '' آپ یہاں بیٹھئے میں مس صاحب کو بُلا کر لاتی ہوں۔''

''رہنے دو میں آپ ہی مل لیتا ہوں۔''

آیا کہہ رہی تھی۔ ''صاحب، صاحب سُنیے تو۔'' جب گوتم نے مایا کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ کاش اُس نے نہ کھولا ہوتا۔

اندر کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ اس کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ ایک مردانہ کوٹ پلنگ پر پڑا ہے۔ پاس کے صوفے پر مایا بیٹھی ہے اور اُس کے پاس قالین پر وہی داڑھی والا لنگور صورت لمبا چوڑا اکھڑا آدمی مایا کی ٹانگوں سے لگا بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کو اچانک دیکھ کر مایا صوفے پر ذرا کھسک کر بیٹھ گئی۔ اپنے اور لنگور کے درمیان فاصلہ بڑھانے کے لیے سامنے میز پر وہسکی کی بوتل رکھی تھی۔ مایا اور لنگور دونوں کے ہاتھوں میں وہسکی کے گلاس تھے۔

اس نظارے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو حیران یا پریشان کرنے والی ہو۔ امیر گھرانوں کی جن لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی، اُن کے دو دو چار چار دوست تو ہوتے ہی ہیں، جن کے ساتھ وہ باری باری یا ایک ساتھ ملتی جلتی ہیں، ڈانس کرتی ہیں پارٹیوں اور پک نک پر جاتی ہیں۔ ہوٹل میں یا گھر میں بیٹھ کر شراب پیتی ہیں۔ اس میں کوئی معیوب اور بداخلاق بات نہیں سمجھی جاتی۔

لیکن گوتم کے دل کی کوئی کمانی اُس وقت ٹوٹ گئی اُس کے دماغ میں بار بار مایا کے وہ

الفاظ گونج رہے تھے۔

''تمھیں یاد کروں گی۔

''شاید کتاب پڑھوں گی اور تمھیں یاد کروں گی۔

''شاید جلدی سو جاؤں اور تمھیں سپنے میں دیکھوں گی۔

''تمھیں یاد کروں گی۔

''تمھیں سپنے میں دیکھوں گی۔''

'تمھیں یاد کروں گی۔ تمھیں یاد کروں گی۔''

یہ سب ایک پل میں گوتم کے دماغ میں اور دل میں گھوم گیا۔

''ہیلو گوتم۔'' مایا نے اس انداز سے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

''تمھاری میٹنگ بڑی جلدی ختم ہو گئی۔؟''

''جلدی ختم نہ ہوئی ہوتی تو اِس لنگور کو میں یہاں بیٹھا کیسے دیکھ سکتا تھا!'' گوتم نے یہ کہا نہیں۔صرف سوچا اور خاموش اُن دونوں کو گھورتا رہا۔

''اوہ گوتم! یہ گوپال ہے۔ میرا بہت پُرانا دوست اسے پیار سے ہم ''گوگی'' کہتے ہیں اور پھر داڑھی والے لمبے چوڑے تگڑے آدمی سے مخاطب ہو کر'' گوگی، یہ ہیں گوتم آف چندرا انٹر پرائزز۔''

داڑھی والے گوگی نے وہسکی کا ایک گھونٹ لیا پھر سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا:

"HI GAUTAM! JOIN US FOR A DRINKS "

اور مایا نے ہاں میں ہاں ملائی۔خفت مٹانے کے لیے کہا۔

"COME ON, GAUTAM, LETS HAVE SOME FUN

گوتم کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

وہ جواب میں ایک لفظ نہ بول سکا۔

وہ اُن کو خاموشی سے گھورتا رہا۔

اُس نے سوچا۔ کاش میرے پاس اس وقت اپنا ریوالور ہوتا اور ایک دم ریوالور اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔

''اُس نے ریوالور اٹھایا۔ داڑھی والے گوگی کی طرف نشانہ لگایا۔
گوگی مُسکرا کر سگریٹ کا دھواں نکالتا رہا۔
گوتم نے ریوالور کا گھوڑا دبایا۔
ایک دھماکہ ہوا اور پلنگ پر دھڑام سے داڑھی والے گوگی کی لاش آن گری۔
مایا کو یہ دھماکہ شاید نہیں سُنائی دیا۔ وہ گوتم کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔
گوتم نے پھر ریوالور کا گھوڑا دبایا۔
اور ایک دھماکہ ہوا۔
قالین پر مایا کی لاش آن گری
اب گوتم نے ریوالور کی نالی کا رُخ اپنی کنپٹی کی طرف کیا۔ پھر ریوالور کا گھوڑا دبایا۔
تیسرا دھماکہ ہوا۔
اور قالین پر اُس کی اپنی لاش بھی آن گری۔
مگر یہ تینوں دھماکے اُس کے اپنے دماغ میں ہوئے تھے۔ اپنے خیال میں اُس نے تینوں کو مار ڈالا تھا۔

داڑھی والے گوگی کی آواز نے اُس کو چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ مایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے دوست نے ایک دو نہیں تین تین بھوت دیکھے ہیں۔

اس پر وہ دونوں ہنس پڑے۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' گوگی نے وہسکی کا گھونٹ پیتے ہوئے حیرانی سے گوتم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بڑا بھولا ہے بیچارہ گوتم!'' مایا نے اپنی طرف سے گوتم کی خاموشی کے لیے صفائی پیش کی۔

مگر گوگی ہنستا رہا۔ وہسکی پیتا رہا اور سگریٹ پیتا رہا اور ہنستا رہا گوتم کی طرف دیکھتا رہا اور ہنستا رہا۔

دفعتاً گوتم کو محسوس ہوا کہ اگر ایک منٹ بھی وہ وہاں اور ٹھہرا تو پاگل ہو جائے گا۔
وہ مڑا اور لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا اور ساتھ میں دروازے کو دھڑ سے بند کرتا گیا۔

اور اب اسی طرح دھڑ سے اُس نے اپنی موٹر کا دروازہ بند کیا اور فرانے کے ساتھ موٹر بھگاتا ہوا مایا کی بلڈنگ سے نکل گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بھوت — وہ تینوں بھوت جن کا ذکر گوگی نے کیا تھا اُس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

پہلے وہ کار کو چلاتا تھا۔

اس وقت اُسے لگ رہا تھا کہ کار اُسے چلا رہی ہے۔ اُسے دوڑا رہی ہے۔ کار اُسے مایا سے دور لے جا رہی ہے۔

دور، بہت دور۔

ایک نئی منزل کی طرف۔

بلا کسی مقصد یا منزل کے وہ کار کو رات میں جگمگاتی سڑکوں پر دوڑاتا رہا یا کار اُسے دوڑاتی رہی۔

اُسے نہیں معلوم تھا وہ کدھر جا رہا ہے۔

مگر کار کو شاید معلوم تھا کہ وہ اُسے کدھر لے جا رہی ہے بہت تیزی کے ساتھ۔

پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ

ساٹھ کلومیٹر گھنٹہ

ستر کلومیٹر

اسی کلومیٹر۔

نوے کلومیٹر۔

اس رفتار پر سامنے 'سڑک بند ہے' کا بورڈ روشنی میں نظر آیا تو اس نے کار کو بائیں کو موڑا۔

تیز رفتار پر کار کو موڑنا کافی خطرناک ہو سکتا ہے۔ دو پہیے ہوا میں اُٹھ گئے۔ مگر گوتم نے کار کو قابو میں کر لیا۔

مگر اب وہ شہر کے کسی انجانے علاقے میں گھس آیا تھا۔

یہاں اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں سڑک کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔

یہاں ہوا کے ساتھ اُڑتی ہوئی بدبو آ رہی تھی۔

یہاں سڑک کے کنارے کنارے جھونپڑیاں تھیں۔ یہ کون لوگ تھے جو یہاں رہنے پر مجبور

تھے؟ ایسے انسان اُس نے تو آج تک نہیں دیکھے تھے۔ اُس کی دُنیا میں ایسے لوگ بستے ہی نہیں تھے۔ آگے جا کر جھونپڑیاں بھی ختم ہو گئیں۔ یہاں لوگ فٹ پاتھ پر سو رہے تھے۔

گٹر کے لمبے چوڑے پائپ پڑے تھے۔ اُن میں لوگ لیٹے تھے۔ کھانا پکا رہے تھے۔ گوتم نے سوچا یہ کون سی دُنیا ہے؟ کیا اس کو جہنم کہتے ہیں۔ یہاں سے دور بھاگنا چاہیے۔

اس نے کار کے ایکسیلیٹر پر پاؤں دبایا ہی تھا کہ اچانک اُس نے کار کے شیشے میں سے دیکھا کہ سامنے ایک بچہ سفید کُرتا پاجامہ پہنے ہاتھ میں کچھ لیے سڑک پار کر رہا ہے۔ پوری کوشش سے اُس نے بریک لگایا لیکن کار بہت تیز رفتار سے جا رہی تھی۔ اور لڑکا بہت قریب تھا۔

کار کے ٹھہرتے ٹھہرتے اُس نے کار کی روشنی میں اس چھوٹے سے بچے کو مڑ کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا اور اُس پل میں وہ معصوم چہرہ اُس کے دماغ پر منجمد ہو کر رہ گیا۔ اُس بچے کے چہرے پر بچپن کا بھولپن تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ موت کا ڈر تھا۔ اور ان سب کے ساتھ ساتھ ایک بھیانک حادثے کا احساس ہی نہیں علم بھی تھا کہ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

موٹر ٹھہراتے ہی گوتم کار کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا مگر جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔

ایک میٹر پہلے بریک لگ جاتا تو وہ بچہ بچ جاتا۔

اب کار کا داہنہ پہیہ اُس کی دونوں ٹانگوں پر سے گزر گیا تھا۔ سڑک پر کانچ کے گلاس کے ٹکڑے بکھر گئے تھے، گلاس میں جو دودھ تھا وہ اب کالی سڑک پر سفیدی پھیلا رہا تھا۔ سفیدی جو اب سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ دودھ کی پتلی دھار میں خون کی ایک دھار بہتی ہوئی آ کر شامل ہوتی جا رہی تھی۔

بچے کی ٹانگیں کُچل گئی تھیں۔ پاجامے کے دونوں پائنچے خون میں لت پت ہو رہے تھے۔ گوتم بچے کو کھینچ کر موٹر کے نیچے سے نکال رہا تھا کہ اُسے موٹر کے کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پھر موٹر کے فولادی جسم پر پتھر پڑنے لگے دو تین پتھر اُس کو بھی لگے مگر اُس وقت اُس کو اپنے سے زیادہ اُس زخمی...... یا شاید مردہ بچے کی فکر تھی۔ کہیں کوئی پتھر بچے کو نہ لگ جائے۔ وہ اپنی بانہوں سے بچے کی حفاظت کرتے ہوئے پیچھے مُڑا تو دیکھا کہ فُٹ پاتھ سے اُٹھ کر، گٹر کے پائپوں سے نکل کر کتنے ہی غریب، بے گھر، گندے آدمی، آنکھوں میں نفرت اور غُصہ ہاتھوں میں پتھر لیے اُس

کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ شاید وہ اُسے پتھر نہیں مار رہے ہیں۔ اُسے اور اُس کی موٹر کو پتھر مار کر اپنا ہزار ہا برس کا بھرا ہوا غصہ اور نفرت نکال رہے ہیں۔

مگر جلد ہی سامنے کی چال سے آٹھ دس آدمی بھاگتے ہوئے آئے اور اب پتھر پڑنے بند ہو گئے۔

"ارے بھیڑ نہ کرو، بچہ مرا نہیں۔"

"یہ تو انیل ہے۔ آشا دیوی کا بھائی۔"

"وہ جو پانچویں مالے پر رہتی ہیں؟"

"ہاں ہاں وہی۔"

اب تک گوتم نے آٹھ نو برس کے بچے کو گود میں اُٹھا لیا تھا۔ ایک آدمی نے اُس سے کہا:

"آیئے میں آپ کو راستہ بتاتا ہوں۔"

آگے آگے وہ بے نام آدمی راستہ دکھاتا ہوا۔ کوئی مل کا مزدور یا چھوٹا موٹا کلرک معلوم ہوتا تھا۔ میلا قمیض اور پتلون پہنے تھا۔

اُس کے پیچھے گوتم، بڑھیا سوٹ پہنے ہوئے، ڈیڑھ سو روپے کے جوتے پیروں میں مگر گود میں زخمی بے ہوش بچہ، جس کا نام سنا تھا انیل ہے جو کسی آشا دیوی کا بھائی تھا۔

اُس کے پیچھے پیچھے آٹھ دس آدمی سیڑھیاں چڑھتے جا رہے تھے۔

راستے میں گوتم نے دیکھا کہ بے گھر لوگ چال کے راستوں میں سیڑھیوں پر بھی سو رہے ہیں۔ کتنے ہی سونے والے اُن کے قدموں کی آواز سے اُٹھ گئے اور اُن کا کارواں بڑھتا گیا۔

گوتم اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ اوپر چڑھتا جا رہا تھا یا نیچے اُترتا جا رہا تھا؟

اور اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ ایک نئی زندگی کے کواڑ اُس کی آنکھوں کے سامنے کھلتے جا رہے تھے۔ یہ زندگی اُس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہاں لوگ زمین پر سوتے ہیں (وہ سوچ رہا تھا) سیڑھیوں پر سوتے ہیں۔ میلے گندے کپڑے پہنتے ہیں۔ ایک ایک کوٹھری میں دس دس آدمی رہتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ گٹر کے پائپ میں رہتے ہیں۔ کیا یہ سب بھی انسان ہیں، اگر یہ سب انسان ہیں تو شاید میں انسان نہیں ہوں؟

پانچویں مالے پر پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ سامنے دروازے پر ایک سفید بورڈ لگا ہے جس پر لال حرفوں میں لکھا ہے۔ "آشا پریم چند"

آشا کرسی پر بیٹھی میز پر ٹائپ رائٹر رکھے ٹائپ کر رہی تھی۔ پیچھے ایک کتابوں کی الماری تھی۔ کتابیں کاغذ اخبار میز پر بکھرے ہوئے تھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو اُس نے مڑے بغیر کہا: "انیل۔ دودھ لے آیا، بھیا؟"

اب اُس نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتے ہی اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان انیل کو اٹھائے لا رہا ہے۔ انیل کا پاجامہ خون میں لت پت ہے۔ پیچھے اُن کی چال کے کتنے ہی آدمی گھس آئے ہیں۔

کمرہ چھوٹا سا ہی تھا۔ دو قدم ہی میں وہ دروازے پر پہنچ گئی اور سہارا دے کر انیل کو ایک ٹوٹے صوفے پر لٹا دیا۔ پھر وہ بولی: "کیا ہوا؟ کیا ہوا میرے انیل کو؟"

ایک پڑوسی نے کہا۔ "موٹر کے نیچے آ گیا۔"

"کس کی؟" آشا نے سوال کیا۔

"ان صاحب کی۔"

اب اس نے پہلی بار گوتم کو غور سے دیکھا اُس نے دیکھا کہ ایک امیر نوجوان ہے۔ بہت بڑھیا سوٹ پہنے ہے۔ جیب میں ضرور سو سو ہزار ہزار کے نوٹوں سے بھرا بٹوہ بھی ہوگا۔ صورت بری نہیں ہے مگر اس وقت اپنے جُرم کے احساس سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ پسینے میں شرابور اُس نے عمر میں پانچ مالے سیڑھیاں کہاں چڑھی ہوں گی۔ اگر اُس نے آشا کے بھائی کو نہ کچلا ہوتا تب بھی آشا ایسے امیر آدمی سے صرف نفرت ہی کر سکتی تھی۔

اور گوتم کی آنکھوں نے دیکھا کہ ایک سیدھی سادی مگر خوب صورت لڑکی ہے کوئی بائیس تئیس برس کی ہوگی۔ بڑی بڑی آنکھیں لمبے لمبے کالے بال۔ معمولی کپڑے کا نیلا سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے۔ ماحول سے پڑھی لکھی ضرور لگتی تھی مگر بیچاری غریب ضرور ہوگی۔ ورنہ اس گندی چال میں کیوں رہتی؟

اُن کو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک پل بھی نہ گذرا ہوگا کہ طوفان کی طرح ایک ادھیڑ عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ اندر آتے ہی اُس نے پوربی لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔ ''تو گھبرا نہیں آسا بٹی۔ تمھارے چاچا ڈاکٹر لینے کے لیے گئے ہیں۔'' اور پھر پڑوسیوں کی بھیڑ کو ڈانٹ کر'' ارے ہٹو ہٹو بھلے مانسو، دور ہٹو۔ ایک تو اتنی گرمی اور اوپر سے تم لوگوں کی بھیڑ۔'' سب پڑوسی اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلے گئے۔ بھلا چاچی کی زبان کے آگے کون رُک سکتا تھا۔ پھر وہ آشا سے بولیں: ''بٹی۔ ہم ابھی ہلدی پیس کر لاتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ جیسے طوفان کی طرح آئی تھیں ویسے ہی آندھی کی طرح چلی گئیں۔

اب گوتم کو آشا سے کچھ کہنے کا موقع ملا: 'آشا جی۔ انیل کو لے کر اسپتال چلیے۔ میری کار حاضر ہے۔'' اِس کے سوا وہ اس حالت میں اور کیا کر سکتا تھا اور کیا کہہ سکتا تھا؟

''انیل کو اگر اسپتال لے جانا ہوگا تو میں لے جاؤں گی۔'' آشا نے بڑے تلخ لہجے میں جواب دیا۔'' آپ کی کار کو جو کام کرنا تھا اُس نے کر دیا۔''

''آشا جی۔'' گوتم نے پھر خفت بھرے لہجے میں کہا۔'' میں بڑا شرمندہ ہوں۔ یقین مانیے مجھے بہت افسوس ہے۔ آپ کے بھائی کو بچانے کے لیے میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر اچھے سے اچھا اسپتال، نرسنگ ہوم، جتنا بھی روپیہ خرچ ہوگا۔''

آشا کی ٹھنڈی طنز بھری آواز نے اُس کی زبان پکڑ لی۔'' اگر آپ کو اسپتال لے جانے کا خیال آیا ہوتا تو آپ خون میں لَت پَت بچّے کو سیدھے اسپتال لے جاتے۔ پانچ مالے اوپر نہ لاتے۔ کیا آپ کو قانون نہیں معلوم؟''

''آشا جی۔'' گوتم نے مجرموں کی طرح اقرار کیا۔'' معاف کیجیے۔ یہ میری زندگی میں پہلا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔''

آشا نے پھر ٹھنڈی نفرت بھری نگاہوں سے اُس ظالم نوجوان کی طرف دیکھا۔ جس نے اپنی موٹر کے نیچے اس کے معصوم انیل کی ٹانگوں کو کچل ڈالا تھا اور صرف اتنا پوچھا۔

''آپ کا نام؟''

''گوتم چندرا۔''

''آپ کی گاڑی کا نمبر؟''

''ایم آر سی۔ چار۔ سات۔ سات۔ پانچ۔''

''پھر اُس نے ایک قطعی لہجے میں کہا۔ جیسے جج فیصلہ سناتا ہے۔''اب آپ جا سکتے ہیں۔''

جب گوتم اپنی جگہ سے نہیں ہلا تو آشا نے اونچی آواز میں دہرایا۔''اب آپ جا سکتے ہیں۔''

گوتم نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس لڑکی کا غصہ حق بجانب تھا۔ اس غصے سے بحث نہیں کی جا سکتی تھی مگر اُس نے نگاہیں جھکاتے جھکاتے بھی دیکھا کہ آشا کی آنکھوں میں سے شعلے نکل رہے تھے مگر تھیں وہ خوب صورت آنکھیں۔

جب وہ مڑ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک پہنچا تو آشا کی آواز آئی۔ ہر لفظ چبا چبا کر ادا کیا گیا تھا۔

''اب آپ سے کورٹ میں ملاقات ہوگی، مسٹر گوتم چندرا۔''

O

قسمت کا فیصلہ

تیسرے پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں صبح سویرے کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے موٹر چلانے کے مقدمے لیے جاتے ہیں۔ جو مالک، ڈرائیور یا ٹیکسی ڈرائیور کوئی صفائی نہیں پیش کرتے، سیدھا سادھا جُرم کا اِقرار کر لیتے ہیں۔ اُن کو دس روپے سے پچاس روپے تک کا جُرمانہ ہو جاتا ہے لیکن جو خود صفائی پیش کرتے ہیں یا کوئی وکیل کرتے ہیں اُن پر جُرمانہ بڑھتا جاتا ہے...... یہاں تک کہ دو چار کو مہینے دو مہینے قید کی سزا بھی ہو جاتی ہے۔

ابھی مجسٹریٹ صاحب نہیں آئے تھے۔ ایک وکیل صاحب، ایک بیچارے کو، مجسٹریٹ صاحب کے فرضی غصہ سے ڈرا رہے تھے۔ ''بڑا ظالم مجسٹریٹ ہے یہ۔ اس کے سامنے کوئی جگرے والا وکیل ہی کھڑا ہو سکتا ہے۔ میرے جیسا......'' اور پھر سرگوشی کے انداز میں۔ ''فیس بیس روپے ہوگی ایک پیشی کی۔''

ایک اور کونے میں دو جونیئر رپورٹر کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے بھانپ لیا تھا کہ عدالت میں نوجوان مِل مالک گوتم چندرا بھی موجود ہے۔ ضرور کوئی مزیدار کیس ہوگا۔ ابھی اس بارے میں انھوں نے بات شروع ہی کی تھی کہ اُن کو آشا پریم چند عدالت کے کمرے میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ اتنی بڑی رپورٹر اس معمولی عدالت میں کیا کر رہی تھی اُنھوں نے حیرت سے آشا کی طرف دیکھا۔

''ہیلو آشا جی۔''

ہیلو کرشنا۔ ہیلو ڈی سوزا۔''

''آشا جی۔ آپ پولیٹکل رپورٹر ٹھہریں۔ پولس کورٹ میں کیا کر رہی ہیں؟''

آشا اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بات کرنے کا اُس کا موڈ نہیں تھا۔ یہ دونوں دوسرے اخبار والے ہی سہی مگر پھر بھی اُس کے ساتھی تھے۔ اُن کو کچھ جواب دینا تو ضروری تھا مگر جو جواب اس نے دیا اُس سے ڈی سوزا اور کرشنا دونوں کی حیرت اور بڑھ گئی ''رپورٹر کی حیثیت سے نہیں آئی ہوں۔ آج میں بھی ایک فریاد لے کر آئی ہوں۔ دیکھتی ہوں۔ عدالت مجرم کو کیا سزا دیتی ہے؟''

وہ کچھ پوچھنے والے ہی تھے کہ لال وردی پہنے ہوئے ایک چپراسی نے آکر گرجدار آواز میں کہا۔ ''چوپ'' مطلب تھا ''چپ'' یعنی خاموش رہو۔ مجسٹریٹ صاحب کی سواری آتی ہے۔

اگلے لمحے ہی سفید سر والے مجسٹریٹ صاحب کالا گاؤن پہنے داخل ہوئے۔ سب لوگ جوتے گھستے ہوئے کھڑے ہوگئے۔

مجسٹریٹ صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

سب لوگ بیٹھ گئے۔ آگے کی کرسیوں پر گوتم (جو لگتا تھا رات بھر سویا نہیں ہے) اُس کی آنٹی رادھا بائی، مسٹر شرما اور بیرسٹر لال بیٹھے۔ پیش کار نے ایک مقدمے کا فائل پیش کیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے اُسے کھول کر سرسری نظر سے دیکھا۔ بڑا معمولی کیس تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے جہاں کار پارکنگ کی اجازت نہیں ہے وہاں اپنی ٹیکسی پارک کر رکھی تھی۔

پیش کار نے پکارا: ''موہن سنگھ گیان سنگھ''

ایک پہاڑی صورت کا چھوٹے سے قد کا ٹیکسی ڈرائیور اپنی خاکی وردی پہنے ہوئے گواہی کے کٹہرے میں کھڑا ہوگیا۔ ہاتھ جوڑ کر مجسٹریٹ صاحب کو نمسکار کیا۔

''مجسٹریٹ صاحب نے پوچھا۔ ''تم نے کوئی وکیل کیا؟''

''نہیں حضور'' ٹیکسی ڈرائیور نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''اپنے جُرم کا اقرار کرتے ہو۔؟''

''جی حضور۔''

''بیس روپے ڈنڈ بھرو، جاؤ — اگلا کیس۔''

''پیش کار نے اعلان کیا۔''چندرا انٹر پرائزز۔''

ایک پولیس سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر مجسٹریٹ صاحب کو کیس کی داستان سنانی شروع کی''حضور یہ ایک سیریس کیس ہے۔ کار نمبر MRC 4775 تلسی ٹائپ روڈ سے رات کے 8 بج کر 17 منٹ پر سو کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جارہی تھی۔ ڈرائیور کی لاپرواہی سے ایک بچہ موٹر کے نیچے آ گیا۔ دونوں ٹانگیں کچل گئیں۔ میڈیکل رپورٹ آپ کے سامنے ہے، حضور۔''

''موٹر کس کی تھی؟'' مجسٹریٹ نے سوال کیا۔

''موٹر تو چندرا انٹر پرائزز کے چیرمین مسٹر گوتم چندرا کی ہے'' سب انسپکٹر نے بات بناتے ہوئے جواب دیا۔

''اب مجسٹریٹ نے سوال کیا۔'' کون چلا رہا تھا؟''

جواب میں بے اختیار گوتم کھڑا ہونا چاہتا تھا لیکن مسٹر شرما نے اُسے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ بیوقوف کہیں کا! اُن کی خاموش نگاہیں کہہ رہی تھیں۔

اُس سے پہلے کہ سب انسپکٹر کچھ کہہ سکتے، بیرسٹر لال اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ چندرا انٹر پرائزز کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کے بھی ایک ممبر تھے۔ مسٹر شرما سے کاروباری تعلّقات کے علاوہ ذاتی دوستی بھی کافی تھی۔

کھڑے ہوکر بیرسٹر لال نے اِس شان سے بولنا شروع کیا جیسے یہ تیسرے پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت نہ ہو سپریم کورٹ ہو اور یہ مقدمہ موٹر ایکسیڈنٹ کا نہ ہو بلکہ کوئی بڑا اہم قانونی اور آئینی سوال ہو جیسے کہ سپریم کورٹ کے ججوں کے مقرر کرنے سے پہلے اُن کے سیاسی اور نظریاتی اندازِ فکر کی جانچ پڑتال کی جائے کہ نہیں۔

''یور ورشپ۔'' انھوں نے سر کو با قاعدہ خم کر کے کہا۔'' اس کار کو ہماری کمپنی کا ڈرائیور مادھو سنگھ چلا رہا تھا۔ وہ یہاں حاضر ہے۔''

موٹا کالا، سفید یونیفارم پہنے مادھو سنگھ راٹھور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے گواہوں کے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

مجسٹریٹ نے ایک نظر اُس کی طرف ڈالی۔ واقعی یہ آدمی مجرم معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے پوچھا۔" تم اپنے جُرم کا اقرار کرتے ہو؟"

"جی حضور۔"

"تم اتنی لاپرواہی سے موٹر کیوں چلا رہے تھے؟ اُس بچے کی جان چلی جاتی تو؟"

ڈرائیور نے کن انکھیوں سے بیرسٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر طوطے کی طرح سیکھا ہوا سبق دہرادیا۔" حضور معافی دیں تو کہوں۔" میں تھوڑی دارو پیے ہوئے تھا۔"

مجسٹریٹ صاحب کو اپنا پُرانا لیکچر دینے کا موقعہ مل گیا۔" نشے کی حالت میں موٹر چلانا بہت بڑا جُرم ہے۔ ایک مہینے کی قید اور پانچ سو روپے جرمانہ۔"

بیرسٹر صاحب، مسٹر شرما اور رادھابائی نے اطمینان کا سانس لیا۔ چندرا خاندان کی عزّت کو بچا لیا گیا تھا۔ ڈرائیور کو ایک مہینے کی قید ہوگئی۔ کوئی بات نہیں۔ اُسے انعام بھی تو مل جائے گا۔ جُرمانہ تو ظاہر ہے کمپنی کے حساب میں سے دیا جائے گا۔ آخر کمپنی کی عزّت کا بھی تو سوال تھا۔

مگر اُن کا اطمینان کا سانس آدھا اندر اور آدھا باہر رہ گیا۔ جب ایک باریک مگر زوردار آواز عدالت میں گونجی۔

"حضور مجھے کچھ کہنا ہے۔" یہ آشا کی آواز تھی۔

مجسٹریٹ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اُس کی جانی پہچانی رپورٹر آشا پریم چند کھڑی دکھائی دی۔

"مِس آشا!" مجسٹریٹ اُس کا نام بھی جانتا تھا۔" میں رپورٹروں کو عدالت کی کارروائی میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"حضور" آشا نے ایسی آواز میں کہا کہ عدالت میں ہر آدمی مڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ "آج میں رپورٹر کی حیثیت سے نہیں، ایک فریادی کی حیثیت سے آئی ہوں۔ جو بچہ اس کار سے کُچلا گیا وہ میرا بھائی ہے۔"

سب لوگ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کُھسر پُسر کرنے لگے۔ بعضوں نے اپنے تعجب کا اظہار اونچی آواز میں بھی کیا۔

"آرڈر! آرڈر!" مجسٹریٹ کی رعب دار آواز آئی۔

''حضور'' آشا نے اپنا بیان جاری رکھا۔'' میں یہ بھی بتادوں کہ میں رپورٹر تو ضرور ہوں مگر میرے پاس وکالت کی سند بھی ہے۔''

اب تو مجسٹریٹ صاحب کو بھی اپنا تختی کا انداز بدلنا پڑا:'' ہمیں آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔مگر آپ کو کہنا کیا ہے؟''

''حضور میری درخواست ہے کہ اس کار کے مالک مسٹر گوتم چندرا سے حلف لے کر پوچھا جائے کہ یہ ایکسیڈنٹ ہوا تو گاڑی کون چلا رہا تھا؟''

ایک بار پھر بیرسٹر لال جلدی سے کھڑے ہوگئے۔'' یور ورشپ۔ چندرا انٹر پرائزز کے ڈرائیور مادھوسنگھ نے ابھی آپ کے سامنے اقبال جُرم کرلیا ہے۔ جو سزا آپ نے دی ہے وہ اُسے بھگتنے کو تیار ہے۔بات کو آگے بڑھانے سے کیا فائدہ؟''

مجسٹریٹ صاحب نے بیرسٹر صاحب کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ بیرسٹر لال، آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔اس کورٹ میں قانون اور انصاف کے خلاف کوئی بات نہیں ہوگی اور پھر اپنے پیش کار سے مخاطب ہوکر۔مسٹر گوتم چندرا کو گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا جائے۔''

اس بار جب گوتم چندرا خاموشی سے کھڑا ہوا تو مسٹر شرما کی ہمت نہ ہوئی اُس کو روکنے کی۔

جب کٹہرے میں کھڑا ہوا تو گوتم نے دیکھا کہ اُس کے سامنے لال کپڑے میں لپٹی ہوئی بھگوت گیتا پیش کی جارہی ہے۔

''پیش کار کہہ رہا تھا۔'' کہو گیتا کی سوگندھ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔''

گوتم نے بڑی سنجیدگی سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔'' گیتا کی سوگندھ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔''

اب مجسٹریٹ صاحب سوال کر رہے تھے۔'' مسٹر گوتم چندرا جس وقت ایکسیڈینٹ ہوا گاڑی کون چلا رہا تھا؟''

گوتم نے جواب دینے سے پہلے عدالت کے اُس کونے کی طرف دیکھا جہاں لال ساڑی پہنے ہوئے وہ لڑکی آشا بیٹھی تھی۔اُس کی خاموش نگاہوں میں غصہ کی آگ تھی، حقارت تھی، ایک الزام تھا، ایک چیلنج تھا، ایک چیتاؤنی تھی۔گویا وہ کہہ رہی ہوں۔'' ہمت ہے تو سچ بول کر دکھاؤ۔''

گوتم نے مجسٹریٹ صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سچ بات یہ ہے حضور کہ گاڑی میں چلا رہا تھا۔"
"ایڈیٹ۔" مسٹر شرما چلا پڑے۔ "یہ کیا پاگل ہو گیا ہے؟"
"آرڈر۔ آرڈر۔" مجسٹریٹ صاحب نے اپنا ہتھوڑا میز پر مار کر کہا اور پھر فیصلہ سنا دیا۔
"پندرہ دن کی قید اور دو سو روپے جُرمانہ۔"
مسٹر شرما نے بیرسٹر صاحب سے کہا۔ "بیرسٹر صاحب اس فیصلے کے خلاف ہم اپیل کریں گے۔"
اور گوتم نے کہا، شاید مجسٹریٹ سے، شاید اپنے آپ سے، شاید اس خوب صورت آنکھوں والی لڑکی سے جس کی ایک آگ بھری ہوئی نگاہ نے اُس کی دُنیا تہہ و بالا کر ڈالی تھی۔ "نہیں جناب والا، قسمت کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔"

گوتم کی آنٹی رادھا بائی سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھی مسٹر شرما سے بات کر رہی تھیں بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ بیٹھی ہوئی مسٹر شرما کی باتیں سن رہی تھیں کیوں کہ مسٹر شرما کی چرب زبانی کے سامنے وہ بھی کم ہی بول سکتی تھیں۔
"سچ کہتا ہوں" مسٹر شرما جھوٹ بول رہے تھے۔ "ہم نے عدالت میں کتنا بڑھیا کیس بنایا تھا! نہ جانے اُس گوتم بیوقوف کو سچ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ بنا بنایا سب کھیل خراب کر دیا۔ اب وہ خود مزے سے جیل میں بیٹھا ہے اور ہم یہاں لوگوں کو جواب دیتے دیتے تنگ آ گئے ہیں۔"
"مسٹر شرما" رادھا بائی نے آخر کار کہا۔ "میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ گوتم نے ایسا کیوں کیا؟ جیل جا کر سارے خاندان کی عزت مٹی میں ملا دی۔"
مسٹر شرما نے بڑی شان سے فلسفیانہ انداز بناتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک بہت بڑے فرنچ وکیل نے کہا ہے اگر مقدمہ سمجھ میں نہ آئے تو اُس میں اُلجھی ہوئی عورت کو تلاش کرو۔"
"عورت کو تلاش کرو؟" رادھا بائی نے چونک کر کہا۔ کون سی عورت؟
"دراصل اس مقدمے میں دو عورتیں اُلجھی ہوئی ہیں ایک تو ہماری مایا ہی ہے۔"
"اوہ مایا!" رادھا بائی کو اطمینان سا ہو گیا۔ "لیکن اُس بیچاری کا اس پاگل پن سے کیا تعلق ہے؟"
"بہت گہرا تعلق ہے۔" مسٹر شرما نے جواب دیا۔ سنا ہے۔ ایکسیڈینٹ سے کچھ منٹ پہلے

بورڈ آف ڈائریکٹرس کی میٹنگ سے پہلے گوتم بابا کے گھر اچانک پہنچ گیا تھا۔ جہاں وہ اپنے ایک پرانے دوست سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ شاید وہ دونوں شراب بھی پی رہے تھے اور پھر ذرا کھنکار کر کھسیا کر۔'' آپ تو جانتی ہیں آج کل کی لڑکیوں کو! یہ سب دیکھ کر گوتم بوکھلا گیا یہی وجہ تھی کہ وہ گاڑی کو بے تحاشا بھگا رہا تھا۔''

''لیکن یہ دوسری عورت کون ہے؟''

اب مسٹر شرما نے برابر میں ٹیبل پر پڑے ہوئے'' آزاد' اخبار کو اُٹھا کر اُس کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں بڑی سُرخی میں گوتم کی تصویر کا بلاک چھپا ہوا تھا اور اس کے مقدمے کی پوری دو کالم کی رپورٹ'' یہ اس آزاد اخبار کی رپورٹر ہے، آشا پریم چند سنا ہے بڑی تیز ہے۔ اُڑتی چڑیا کے پر کاٹتی ہے۔ اور اس ایڈیٹ گوتم کو اپنی گاڑی کے نیچے کچلنا بھی تھا تو اسی آشا کے چھوٹے بھائی کو۔ یہ دیکھیے اُس نے اپنی رپورٹ میں بھگو بھگو کر جوتے مارے ہیں مسٹر گوتم چندرا کو۔''

''تو اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' رادھا بائی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

مسٹر شرما نے اپنی چھوٹی آنکھوں کو اور چھوٹا کرتے ہوئے جواب دیا۔'' ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آخر ہماری کمپنی ہر سال ایک لاکھ کے اشتہار دیتی ہے آزاد اخبار کو۔''

آزاد اخبار کا یہی فرنٹ پیج منہ پر ڈالے ایک رپورٹر اپنی کُرسی پر بیٹھا اور سامنے میز پر ٹانگیں رکھے ہوئے سو رہا تھا۔

برابر کی میز پر آشا پریم چند اپنا آرٹیکل پورا کر رہی تھی۔

اُس کے برابر کی میز پر تیسرا رپورٹر پھول چند اپنے بانکے بالوں میں ڈھیر سارا تیل ڈالے ٹائپ کر رہا تھا۔ مگر اُس کی نظریں ٹائپ رائٹر کے بجائے آشا پر لگی تھیں۔ اس کا قد اتنا چھوٹا تھا کہ ٹائپ کرنے کے لیے کُرسی پر ایک گدّی رکھنی پڑتی تھی۔ جبھی تو سب اُسے ''ٹنگو'' کہہ کر پکارتے تھے۔

'' آشا جی۔'' اُس نے بڑے عاشقانہ انداز سے ''جی'' کو کھینچ کر کہا۔ مگر اونچی آواز میں نہیں، سوتے ہوئے رپوٹر کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے۔

''جی!'' آشا نے برف جیسی ٹھنڈی آواز میں پھول چند کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''جی! بس جی؟۔'' پھول چند ٹائپ کرنا بھول کر آشا کی طرف مخاطب ہوگیا۔'' میرا مطلب ہے آپ کے چھوٹے بھائی کا ایکسیڈینٹ ہوگیا تھا نا؟ اب کیسا ہے وہ؟''

''اسپتال میں ہے۔'' آشا نے اپنا مضمون ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔'' آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں روز اُس کے لیے پرارتھنا کیا کروں گا۔'' پھول نے کہا۔ اور اب وہ اپنی میز سے کھسک کر عین آشا کے سامنے آ گیا۔

آشا نے کسی قدر چڑ کر کہا۔'' کیا ہے مسٹر پھول چند''

اب جا کر پھول چند نے ایک فلم کے ٹائٹل کا بہانہ کرتے ہوئے اپنا حرف مدعا ادا کیا۔

''وہ پریم کمار کی پریم کہانی دیکھیں گی؟''

''نہیں۔'' آشا نے اپنے کاغذات بٹورتے ہوئے کہا۔

مگر پھول چند جیسا بے حیا عاشق ہار ماننے والا کب تھا۔ فوراً اُس نے دوسری تجویز پیش کر دی۔

''کہیں چل کر چائے پئیں گی؟''

''جی نہیں۔''

آشا اپنے مضمون کے کاغذات اکٹھے کر کے کھڑی ہوگئی تو پھول چند کو کہنے کا موقع ملا۔

''آپ کا کام تو ختم ہوگیا نا؟''

''جی ہاں۔''

''تو میں آپ کو بس اسٹاپ تک چھوڑ سکتا ہوں؟''

''جی نہیں۔'' آشا نے طنز بھرے انداز میں کہا۔'' مجھے راستہ معلوم ہے گائڈ کی ضرورت نہیں۔''

''آشا جی۔'' پھول راستہ روکتے ہوئے بولا۔'' آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں۔؟ میں تو آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

اب آشا نے ڈانٹ پلائی۔'' راستے سے ہٹ جایے مسٹر پھول چند۔''

پھول چند بھی احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زور سے بولا۔

''نہیں ہٹوں گا۔ جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گی کہ مجھ میں ایسی کون سی برائی ہے جو آپ

مجھ سے ایسا برتاؤ کرتی ہیں۔"

اُس کی اونچی آواز نے سوتے ہوئے لمبے چوڑے تگڑے رپورٹر کو جگا دیا۔" پھول چند!" ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

"جی!" پھول نے ڈر کر کہا۔

"جی کے بچے!" رپورٹر بھیم سنگھ نے ڈانٹ کر کہا۔" اب اگر تو نے کبھی مس آشا کو چھیڑنے کی کوشش کی تو جانتے ہو میں کیا کروں گا؟"

پھول چند نے بھیگی بلی بنتے ہوئے معصومیت سے سوال کیا:" کیا کریں گے بھیم جی!"

بھیم نے ہاتھ میں لیے ہوئے اخبار پر غصہ نکالتے ہوئے کہا۔" پھول کو مسل ڈالوں گا۔ سمجھ گئے آپ؟"

پھول چند نے سہم کر آہستہ سے کہا:" جی سمجھ گیا، بھیم جی!" اور اپنی میز پر واپس چلا گیا۔

"تھینک یو، بھیم جی!" آشا نے شکریہ ادا کیا۔

"کوئی بات نہیں، آشا، اگر یہ اب کبھی پریشان کرنے کی کوشش کرے تو تم مجھے کہنا۔" بھیم نے کہا۔ پھر اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اطمینان سے ٹانگیں سامنے میز پر رکھیں۔ پھر مسلے ہوئے اخبار کو سیدھا کر کے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا اور پھر سو گیا۔

محمد سلیم ردولوی' آزاد' اخبار کے نیوز ایڈیٹر، خلافت اور مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات کے زمانے میں ایک پرجوش نوجوان والینٹر تھے۔ اب ایک داڑھی والے بزرگ تھے جن کو سب رپورٹر، سب ایڈیٹر یہاں تک کہ ایڈیٹر صاحب تک' چاچا' کہتے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، خود اہل زبان مگر جن کی بیوی صرف پوربی بولتی تھیں۔ مگر جو اردو ہندی دونوں زبانوں کے اہل قلم تھے۔ آشا کے نہ صرف نیوز ایڈیٹر تھے بلکہ اُس کے پڑوسی تھے۔ وہ اور اُن کی بیوی، آشا اور اُس کے چھوٹے بھائی پر شفقت کی نظر رکھتے تھے۔

جب آشا اُن کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بھی اپنے کام کو سمیٹ رہے تھے۔

"آؤ بیٹی" انھوں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" کہو مضمون لکھ لیا؟"

''جی ہاں۔'' آشا نے کاغذوں کا پلندہ بڑھا دیا۔ چاچا نے اُسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔

''میں نے بھی اپنا کام ختم کر دیا ہے۔ اب ہم انیل کو دیکھنے اسپتال چل سکتے ہیں۔''

''چاچی تو سویرے سے وہیں ہیں۔'' آشا نے بڑے خلوص سے بیٹھتے ہوئے کہا۔'' ہم یتیموں کو تو آپ دونوں کا ہی سہارا ہے۔''

''اری انسان ہی انسانوں کے کام آتے ہیں، پگلی۔'' اور پھر چاچا نے مسکرا کر پوچھا۔'' کیا تو ہمیں انسان بھی نہیں سمجھتی؟''

''کاش اس دُنیا میں ایسے اور بھی انسان ہوتے۔'' آشا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا اور پھر اُس کے لہجے میں کڑواہٹ آ گئی۔'' یہاں تو ایسے دو ٹانگ کے جانور ہیں جو دوسرے انسانوں کے بچوں کو اپنی موٹروں کے نیچے ایسے کچل دیتے ہیں جیسے وہ کیڑے مکوڑے ہوں......''

''اوہ!'' چاچا نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔'' گوتم چندرا کی بات کر رہی ہو۔ مگر بیٹی ماننا پڑے گا بڑا مرد آدمی ہے جس نے بھری کورٹ میں جُرم تسلیم کر لیا اور جیل چلا گیا۔''

''ہونہہ! آشا نے گوتم کے جیل جانے کے ذکر پر چڑ کر کہا۔

''چاچا۔ جیل بھی ان امیر آدمیوں کے لیے ایک تفریح کی جگہ ہے۔ چین سے بیٹھا بنسی بجا رہا ہوگا!''

گوتم بنسی تو نہیں بجا رہا تھا لیکن جیل کی بارک کی سلاخوں والی کھڑکی کے پاس کھڑا اپنا باجا بجا رہا تھا۔ لگتا تھا اُس کو ایک ہی دُھن آتی تھی۔ اُس کو بار بار بجائے جا رہا تھا۔ نیلی دھاریاں پڑے کھدر کا اونچا سا پائجامہ۔ اُسی کپڑے کی آدھی آستینوں کی قمیض جو اتنی چھوٹی تھی کہ بنڈی لگتی تھی۔ سر پر ٹیڑھی بانکی کھدر کی ٹوپی دھری ہوئی جس پر جیل کی نیلی دھاریاں نہ پڑی ہوتیں، تو وہ گاندھی کیپ کہلاتی۔ ڈیڑھ سو سوٹ اور بہتر پتلونوں والا گوتم چندرا اس وقت اچھا خاصا کارٹون لگ رہا تھا۔

اُس کے باجے کی دُھن میں مٹھاس بھی تھی، نرمی بھی، گرمی بھی۔ جیل کے قیدیوں کی طرح اُداسی بھی تھی۔ مگر اُس میں زندگی کی ایک عجیب تڑپ بھی تھی جس نے لیٹے ہوئے پاکٹ مار بھیکو اور مشہور تالا توڑ سوہن کو بھی اُٹھ کر بیٹھنے کے لیے مجبور کر دیا۔

''ارے سوہن بھائی'' چھوٹے قد کا بھیکو بولا ''یہ نیا رنگروٹ تو بڑی اچھی دُھن بجاتا ہے۔''
لمبا چوڑا کالا سوہن بولا، بے وقوف جانتا ہے یہ کون ہے؟ اور پھر رازدارانہ لہجے میں۔
''بہت بڑا سیٹھ ہے یہ۔''
''ارے ایسا!'' بھیکو نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔
''کھڑکی کے پاس جا کر اس نے کہا'' نمستے سیٹھ بھائی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟
''یہ کہہ کر اُس نے اپنے سر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔''
گوتم ہنس کر بولا۔''ارے بھائی تم مجھے پاگل کیوں سمجھتے ہو؟''
''اس لیے کہ آپ یہاں پر ہیں۔'' بھیکو نے پاگل ہونے کا ثبوت پیش کیا۔'' سنا ہے آپ لکھ پتی سیٹھ ہیں پھر یہاں کیسے؟''
''موٹر تیز چلا رہا تھا۔'' گوتم نے سارے مقدمے کی کاروائی کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔''ایک بچہ نیچے آ گیا۔''
جیسے ہی اُس نے یہ کہا، بارک کے ایک کونے سے ایک زہر میں بجھی ہوئی ہنسی کی آواز آئی۔ گوتم نے مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان مگر داڑھی والے کو ہنستے ہوئے پایا۔ اُس کی آنکھوں میں غصہ تھا اور اُس کی آواز میں نفرت ملی ہوئی طنز بھری ہوئی تھی۔'' تو پھر تمھیں یہاں بھیجا؟ قصور سراسر بچے کا تھا! وہ تمھاری گاڑی کے نیچے کیوں آ گیا؟''
گوتم کو کوئی جواب نہ سوجھا تو اُس نے بھیکو کی طرف دیکھا۔ اب پاکٹ مار نے داڑھی والے قیدی کا تعارف کرایا۔'' یہ ہیں ہمارے کامریڈ کرانتی۔ بڑے جوشیلے ٹریڈ یونین والے ہیں۔ مزدوروں نے جب مل کے منیجر کا گھیراؤ کیا تو پولس کا کہنا ہے کہ اسی نے مزدوروں کو بہکایا، بھڑکایا جس کی وجہ سے مار پیٹ ہوئی اور ایک آدمی مارا گیا۔''
گوتم نے ایک بار ڈر کر اُس خوفناک انقلابی کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آگ ہی آگ بھری ہوئی تھی۔ ایسا انسان اُس نے آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جلدی سے مُڑ کر اُس نے بھیکو سے کہا'' اوہ! بھئی میں پالیٹکس POLITICS سے بہت گھبراتا ہوں۔'' اور پھر بات کا رُخ بدلنے کے لیے بھیکو سے پوچھا۔'' تم بتلاؤ کیسے آنا ہوا؟''

اپنا آنا جانا تو رہتا ہی ہے۔ تین مہینے اندر، تین مہینے باہر، میرا دھندا ہی ایسا ہے۔
''کیا دھندا ہے تمھارا؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ کہیں یہ بھی تو انقلابی نہیں۔
''میرا دھندا'' بھیکو نے جواب دیا۔ ''میرا دھندہ ہے جیب کاٹنا۔ اور ہاتھ کی قینچی ہوا میں چلاتے ہوئے اُس نے ایک فرضی جیب کاٹ کر اپنے آرٹ کی نمائش کر دی۔ اتنے میں چوڑا تگڑا کالا سوہن بھی اُن کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھیکو بولا: ''اور یہ ہے میرا پارٹنر مشہور تالا توڑ۔ دُنیا میں کوئی ایسی تجوری نہیں جسے سوہن اپنے ہاتھوں سے نہ کھول سکے۔''
'سیٹھ صاحب۔'' سوہن نے یہ موقع اپنے کمال کا اشتہار دینے کا غنیمت جانا۔ ''کبھی کوئی لوہے کی الماری کا یا تجوری کا چابی گم ہو جائے تو سوہن کو یاد کرنا۔'' یہ کہہ کر اُس نے چٹکی بجائی گویا ایسے آسانی سے وہ تجوری کھول سکے گا۔
بھیکو نے بڑا بھولا منہ بنا کر طنز کا بھرپور وار کیا۔ ''دراصل سیٹھ بھائی ہم دونوں وہی کرتے ہیں جو تم سیٹھ لوگ کرتے ہو۔''
گوتم کا واسطہ، عوام کے غصے، عوام کی نفرت اور عوام کے طنز سے کبھی پڑا ہی نہیں تھا۔ بڑی سادگی سے اس نے کہا۔' ہم کیا کرتے ہیں؟
''مجھ سے پوچھو۔'' انقلابی کامریڈ کرانتی کی آواز اس انداز سے گونجی کہ نہ صرف گوتم، بھیکو اور سوہن بلکہ جتنے قیدی بھی جاگ رہے تھے انہوں نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا جیسے وہ دُنیا کا کوئی بہت بڑا راز بتانے جا رہا ہو۔ کرانتی کہہ رہا تھا۔'' یہ سیٹھ لوگ بچّوں کے پینے کا دودھ چراتے ہیں۔ لوگوں کے چہروں سے مسکراہٹ غائب کر دیتے ہیں۔ عورتوں کی مانگ کا سیندور چرا لیتے ہیں اور کسی کو پتہ نہیں چلتا۔''
اس زہر میں بجھی ہوئی طنز کے بعد چند لمحے بارک پر سناٹا چھایا رہا۔
پھر سوہن نے بات بدلنے کے لیے کہا۔ ''سیٹھ صاحب آپ نے کوئی وکیل یا بالسٹر نہیں کیا تھا؟''
ایک بار پھر کامریڈ کرانتی کی آواز گونجی۔ ''ارے وکیل بیرسٹر سب کیے ہوں گے۔ عدالت میں اپنا ڈرائیور بھی پیش کیا ہو گا جس نے حلف اُٹھا کر یہ بھی کہا ہو گا کہ گاڑی میں چلا رہا تھا!''

''یہ سن کر گوتم حیران رہ گیا۔'' آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ بالکل یہی ہوا، عدالت میں۔ مگر جب میں گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا اور گیتا میرے سامنے رکھی گئی تو میں جھوٹی قسم نہ کھا سکا۔''

سوہن کو اپنا مقدمہ یاد آ گیا۔'' بھئی۔ گیتا کو بیچ میں لا کے یہ کورٹ والے بڑی دھاندلی کرتے ہیں اور تو اور میں بھی جھوٹی قسم نہ کھا سکا۔ تب ہی تو جیل میں آنا پڑا۔''

''قسم کھانے پر یاد آیا۔'' بھیکو نے زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جہاں ایک میلی سی گندی تھالی میں دو موٹی جلی ہوئی روٹیاں اور ایک کٹورا دال کا پڑا تھا۔'' سیٹھ بھائی، اگر آپ کو بھوک نہ لگی ہو تو یہ کھانا میں کھالوں؟''

وہ تھال اُٹھا ہی لیتا اگر عین وقت پر سوہن نے اُس کو روکا نہ ہوتا۔ اے خبردار! سیٹھ صاحب کو رات کو ضرور بھوک لگے گی۔ پہلے دن ایسا ہی ہوتا ہے'' اور پھر بھیکو کا ہاتھ پکڑ کر'' آؤ پارٹنر آؤ۔ سیٹھ صاحب کو آرام کرنے دو۔''

وہ دونوں گئے تو گوتم باجے کو منہ سے لگانے والا ہی تھا کہ کرانتی نے اپنے کونے سے جست لگا کر اُس کا گریبان پکڑ لیا۔

''اے مسٹر!'' اُس نے سختی سے سوال کیا۔ کیوں کہ اُس کو شبہ تھا کہ اس امیر آدمی کے یہاں آنے میں جیل والوں کی کوئی چال نہ ہو۔'' سچ سچ بتاؤ۔ کیوں آئے ہو یہاں؟''

گوتم نے اپنا گریبان نہیں چھڑوایا مگر اتنی نرمی سے بولا کہ کرانتی نے خود اس کے گریبان کو چھوڑ دیا۔'' شاید پچھلے جنم میں میں بھی تم لوگوں کی طرح غریب تھا۔'' اور اُس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ اُبھر آئی۔'' پھر جیل میں نہ آتا تو اتنی دلچسپ ہستیوں سے ملاقات کیسے ہوتی؟''

اب اُس کی آنکھوں میں کسی کی خوب صورت آنکھیں گھوم گئیں۔'' مگر کرانتی بھائی، سچ بات یہ ہے کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں جو چمک تھی وہ مجھے یہاں لے آئی ہے۔ اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اگر ہمت ہے تو اپنے باپ کا پرائشچت کرو اور جیل جا کر دکھاؤ۔''

اور اُس کی اپنی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ اِس وقت آشا پریم چند اُس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟ کیا وہ اُس کو کبھی معاف کر سکے گی؟

○

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

'آزاد' اخبار کئی زبانوں میں چھپتا تھا۔ ہندی میں، اردو میں، انگریزی میں، مرہٹی میں، مگر ایڈیٹر ان سب اخباروں کا ایک ہی تھا۔

ست پال ساہنی کہنے کو پنجابی تھے مگر عمر بھر بمبئی میں کاٹی تھی۔ ادھیڑ عمر کے خوش شکل، خوش مزاج اور ساتھ میں قابل آدمی تھے۔ اچھا لکھتے تھے۔ اپنے اسٹاف سے اپنی خوش اخلاقی سے اچھا کام لیتے تھے۔ سب لوگ ان کی بڑی عزّت کرتے تھے پھر بھی وہ سب سے دوستوں کی طرح ہی ملتے تھے۔

اس دِن آشا پھول چند کی شکایت کرنے اُن کے کمرے میں داخل ہوئی تو انھوں نے مسکرا کر اُسے 'گڈ آفٹر نون' کیا اور بیٹھنے کو کہا۔ اُن کے دفتر میں معمولی رپورٹر کو بھی کھڑے ہو کر بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

آشا نے بیٹھ کر کہنا شروع کیا: ''سر مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے.....''

''ہاں ہاں'' ساہنی صاحب نے کہا۔ ''افسوس کی بات تو ہے ہی آشا۔ آخر ہمارے اخبار کی ریپوٹیشن کا سوال ہے۔''

''جی مجھے یہی تو کہنا تھا کہ اخبار والوں کی عزّت کہاں رہے گی اگر رپورٹر ایسی حرکتیں کرنے لگے۔''

''ہاں ہاں۔ اگر رپورٹر بات کو بڑھا چڑھا کر اور واقعات کو توڑ مروڑ کر کچھ اس طرح کی رپورٹس پیش کریں گے جن سے ہمارے تعلقات ہمارے ایڈورٹائزرس کے ساتھ.....''

آشا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

''سر۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟'' اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تم کس کی بات کر رہی ہو؟'' ایڈیٹر صاحب نے بھی حیرانی سے کہا۔

''اب تو آشا کو وہ کہنا ہی پڑا جو وہ کہتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

''جی وہ پھول چند ہے نا؟ ہمیشہ بڑی بدتمیزی کے ساتھ مجھے چھیڑتا رہتا ہے۔''

''اچھا۔ اچھا۔'' ساہنی صاحب نے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے پھول چند کا چھوٹا قد بتاتے ہوئے ''وہ ٹنگو! اُسے تو میں سمجھا دوں گا۔ نہیں مانے گا تو نکال باہر کر دوں گا۔''

''تھینک یو، سر۔'' کہہ کر آشا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی بات تو ختم ہوگئی تھی۔ ایڈیٹر صاحب کا اور وقت برباد کرنے سے فائدہ؟

مگر ساہنی صاحب نے کہا: ''بیٹھو بیٹھو'' اور جب وہ سوچتی ہوئی بیٹھ گئی کہ نہ جانے اب کیا بات کریں گے تو انھوں نے کہا: ''میں تو تم سے کسی اور ہی معاملے کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔''

''کیا بات ہے سر؟''

''دیکھو آشا۔ یہ جو تم نے موٹر ایکسی ڈینٹ کے بارے میں رپورٹ لکھی ہے نا.....'' ایڈیٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ اُسی طرح ہچکچا رہے تھے جس طرح چند منٹ پہلے آشا پھول چند کی شکایت کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمھارا چھوٹا بھائی زخمی ہوگیا ہے۔ اُس کا بھی مجھے افسوس ہے.....مگر.....مگر.....'' آخر وہ اپنی جھجک پر قابو پاتے ہی بول پڑے ''تم نے اس کی رپورٹ اتنی بڑھا چڑھا کر لکھی تھی کہ معلوم ہوتا ہے جیسے تم گوتم چندرا جی کو بدنام کرنا چاہتی ہو۔ آخر اُس بیچارے سے تمھاری کیا دشمنی ہے؟''

آشا کے غصّے کا پارہ تو ایک دم اوپر چلا گیا تھا مگر اُس نے اُس کا اظہار زہر میں بُجھی ہوئی طنز کی شکل میں کیا۔

''مجھے اُس بیچارے سے کوئی دشمنی نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں اُن سب آدمیوں کو اپنا

دشمن سمجھتی ہوں جو کام نہیں کرتے مگر دو دو لاکھ کی موٹریں گھماتے پھرتے ہیں اور پرواہ نہیں کرتے، چاہے کسی غریب کے بچّے کی جان چلی جائے یا وہ عمر بھر کے لیے لنگڑا ہو جائے۔"

کبھی ساہنی صاحب بھی جوانی کے جوش میں ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے لیکن اب اُن کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ چار چار اخبار چلانے کی ذمہ داری اُن کے سر تھی اور تین سو آدمیوں کو ہر مہینے تنخواہ دینا اُس وقت میں ممکن تھا اگر مالکوں کو منافع کی کوئی صورت نظر آئے۔ سو انھوں نے آشا سے جو بات کہی وہ ایسا لگتا تھا کہ اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں۔

"تمھیں پتہ نہیں، آشا کہ پچھلے سال گوتم چندرا کی کمپنی نے سوا لاکھ کے اشتہار ہمارے اخباروں میں چھپوائے ہیں اور اب وہ کہتے ہیں کہ وہ اشتہار دینا بند کر دیں گے اگر......"

آگے کہتے کہتے وہ رُک گئے۔

"اگر؟" آشا نے ان سے سوال کے انداز میں کہا۔

اب ایڈیٹر صاحب نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ آشا کے سامنے بڑھایا۔ "اگر ہم نے یہ مضمون تمھارے نام سے نہیں چھاپا......"

آشا نے کاغذ ہاتھ میں لے کر اُس پر ایک نظر ڈالی اور بولی: "اور اگر میں کہوں کہ یہ جھوٹ ہے۔ میں اسے اپنے نام سے نہیں چھپنے دوں گی......؟"

ایڈیٹر صاحب نے بڑے میٹھے انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کچھ نہ کرو گی۔ تم جان بوجھ کر اپنے اخبار کا لاکھوں کا نقصان کرنا تھوڑا ہی چاہتی ہو؟"

اب آشا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا:

"ایک بہت بڑے جرنلسٹ نے مجھے سکھایا تھا کہ اپنے قلم سے کوئی ایسی بات نہ لکھنا جسے تم سچ نہ سمجھتی ہو......"

ساہنی صاحب نے بوکھلا کر جلدی سے پوچھا: "وہ کون بیوقوف تھا؟"

آشا نے اپنے ایڈیٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "سر — وہ آپ تھے!" اور پھر وہ نمستے کہہ کر جلدی سے باہر چلی گئی ورنہ اُسے ڈر تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

اور ساہنی صاحب سوچتے رہے کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔
''وہ— آپ— تھے!'' اور آخری لفظ پر بڑا زور تھا۔'' تھے— تھے۔'' یعنی اب نہیں ہیں!
کیا واقعی ست پال ساہنی بیباک جرنلسٹ'' آزاد'' اخبار کا آزاد قلم— اب'' ہے'' سے ''تھا'' ہو گیا ہے؟
اُن کی آنکھوں میں غصہ بھی تھا، افسوس بھی اور شرمندگی بھی!

صبح سویرا مالا بارہل کی کوٹھیوں میں بھی ہوتا ہے۔
نریمن پوائنٹ کے اسکائی اسکریپرز میں بھی ہوتا ہے۔
تلسی پائپ روڈ کی چالوں اور جھونپڑیوں میں بھی ہوتا ہے اور آرتھر روڈ کے جیل خانے میں بھی ہوتا ہے۔
قیدیوں کے لیے صبح اُس وقت ہوتی ہے، جب چائے والے کی لال گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔
وارڈر کے اے چلو چائے آگئی کہنے سے پہلے ہی بھیکو نے باتھ روم سے ہی چلّانا شروع کر دیا۔ اے واہ۔ چائے آگئی! اور سب قیدی اپنے اپنے مگ اور کوپن لیے چائے والے کی طرف دوڑ پڑے۔
لیکن ایک قیدی مزے سے کمبل اوڑھے اب بھی سو رہا تھا۔ بھیکو نے اُسے جھنجھوڑا۔'' اے سیٹھ بھائی۔ اُٹھو نا۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''
گوتم نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھولے بغیر کہا۔'' ارے بھیکو یار سونے دے نا۔ بڑے مزے کی نیند آرہی ہے۔''
'اتنے میں کامریڈ کرانتی گرم گرم چائے کا بھرا ہوا مگ لیے ہوئے لوٹا۔
گوتم کو سوتے ہوئے دیکھ کر اپنے طنز بھرے انداز میں بولا۔'' یہ گوتم سیٹھ تو ایسے سو رہا ہے جیسے جیل کی بارک نہ ہو اِس کا ایرکنڈیشنڈ بیڈروم ہو۔''
''کرانتی بھیا!'' گوتم نے آخر کار اُٹھتے ہوئے کہا۔'' ایرکنڈیشنڈ بیڈروم میں ایسی نیند کہاں آتی ہے؟''

کرانتی کی طنز اور کڑوی ہوتی گئی۔ ''تو میں بتاؤں گوتم سیٹھ جب اپنے ایر کنڈیشنڈ بیڈ روم میں نیند نہ آئے تو باہر فٹ پاتھ پر جا کر سو جایا کرنا جہاں کئی لاکھ آدمی سوتے ہیں۔ ٹھنڈے برف پتھروں پر نیلے آسمان کے نیچے وہاں بڑی اچھی نیند آتی ہے۔''

اتنے میں بھیکو گوتم کے لیے بھی چائے لے آیا۔ اس کو مگ پکڑا کر کرانتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لو بھئی۔ ان کا بھاشن چالو ہو گیا۔'' اور پھر اُس سے مخاطب ہو کر بولا: ''کرانتی بھائی۔ یہ آرتھر روڈ کا جیل خانہ ہے چوپاٹی کی سبھا نہیں۔ ایک بار چالو ہو جاتے ہیں تو چالو ہی ہو جاتے ہیں، معاف کرو، سیٹھ بھائی کو، ہاں۔''

مگر گوتم چائے کا گھونٹ پی کر داڑھی والے انقلابی سے بولا۔ ''نہیں کرانتی بھیا۔ تمھارے کڑوے شبدوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے!'' اور اُس کے چہرے پر نہ مذاق تھا نہ طنز، صرف سنجیدگی ہی سنجیدگی۔

اتنے میں ایک موٹا تازہ قیدی باہر سے آ کر گوتم کے پاس بیٹھ گیا اور اُس کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ارے گوتم چندرا جی۔ آپ؟ کیا معلوم تھا کہ آپ سے جیل میں ملاقات ہوگی۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''گوتم نے اُسے نہیں پہچانا، بولا۔'' آپ کی تعریف؟''

اس سے پہلے کہ موٹا قیدی کچھ کہہ سکے۔ بھیکو نے جواب دیا۔ ''سیٹھ بھائی یہ ہمارے سیٹھ پھول چند جی مہاراج ہیں۔ بارہ نمبر کی بارک میں رہتے ہیں! بھگوان نے بڑی بھول کی جو انہیں پیدا کر دیا۔''

سیٹھ پھول چند کے چہرے پر غصہ اور نفرت کی گرم ہوا چل رہی تھی۔ ''یہ سُورا مسخری کرے ہے جی۔ میں سیٹھ پھول چند مول چند۔ پھول چند اینڈ کمپنی امپورٹ ایکسپورٹ اینڈ کمیشن ایجنٹس۔''

بھیکو اپنے بستر پر بیٹھا بیٹھا بولا۔ ''امپورٹ ایکسپورٹ! سمجھے نا سیٹھ بھائی؟ یعنی اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر۔'' اور اُس نے کمبل اُٹھا کر اس کے نیچے کچھ چھپاتے ہوئے سیٹھ پھول چند کی بزنس کی اصل نوعیت بتا دی۔

پھول چند نے بھیکو کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''تو چپ رہ بے جیب کترے۔''

مگر بھیکو کو بھلا کون چپ کرا سکتا تھا، بولا۔ ''ارے بھئی ہم تو کسی سیٹھ ساہوکار کا بٹوہ پار کرتے ہیں۔ تم تو گورنمنٹ کی جیب کاٹتے ہو اور غریبوں کا گلا!''

گوتم نے پھول چند کی جان بچاتے ہوئے کہا۔ ''پھول چند جی آپ کا یہاں آنا کیسے ہوا؟'' جیل میں سب اپنا تعارف اسی طرح کراتے ہیں۔

''ابجی کیا بتاؤں؟ پھول چند نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ بہی کھاتوں کا گول مال ہو گیا۔ بھول سے ہمارے منیم جی نے انکم ٹیکس میں غلط کھاتے بھیج دیئے۔''

''غلط کھاتے؟'' گوتم نے ایسی کسی چیز کا ذکر پہلی بار سنا تھا۔

''اصل میں غلط نہیں تھے۔ صحیح تھے مگر بھول سے سُورا وہی لے گیا۔ سو مجھے یہاں آنا پڑا۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔ انھوں نے اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ پھر گوتم سے پوچھا۔ ''آپ اپنا اکاؤنٹ کیسے رکھتے ہیں؟''

ہمارے اکاؤنٹ وغیرہ تو سب مسٹر شرما دیکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اُن کو دو کھاتے نہیں رکھنے پڑتے۔

پھول چند چہک کر بولا۔ ''ارے سیٹھ تم کیا بات کرو ہو؟ تمھارا مسٹر شرما اس معاملے میں ہمارا گرو ہے۔ میں نے ڈبل حساب کتاب اسی سے سیکھا ہے۔''

''نہیں نہیں۔ میں نہیں مان سکتا کہ مسٹر شرما حساب کتاب میں کوئی گڑبڑ کرتے ہیں۔'' اور واقعی گوتم کو اُس وقت تک اِس کا یقین تھا۔

''بھئی گوتم سیٹھ'' پھول چند ہنس کر بولا۔ ''تم یا تو بڑے ہوشیار ہو کہ جیل میں بھی زبان نہیں کھولتے یا تو بھولے بنتے ہو!''

گوتم اس کا جواب دینے ہی والا تھا کہ ایک وارڈر نے دروازے سے آواز لگائی۔ ''گوتم چندرا چلو تمھیں جیلر صاحب نے بُلایا ہے۔''

جیل میں جیلر صاحب سے سب کی جان نکلتی ہے۔ گوتم بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''کیوں بھئی میں نے کیا کیا؟''

وارڈر نے دانت باہر نکالتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔"کیا کچھ نہیں آج تمھاری چھٹی ہے۔"

"چھٹی!" گوتم نے جوش سے نعرہ لگاتے ہوئے اعلان کیا۔

"ارے پندرہ دن اتنی جلدی گزر گئے۔" اور پھر سب سے رخصت ہونے لگا۔"سیٹھ جی" نمستے نمستے کرانتی بھیا۔ نمستے سوہن اور آخیر میں بھیکو سے گلے مل کر کہا۔"بائی بائی بھیکو۔"

"اچھا سیٹھ بھائی تم جاؤ۔" بھیکو بولا۔"اگلے ہفتہ میں بھی باہر آرہا ہوں۔"

"بھولنا نہیں" گوتم نے اُسے یاد دلایا۔"تمھاری انگلیوں پر میرا شراپ ہے۔اب یہ کسی کی جیب نہیں کاٹ سکیں گی۔"

"ٹھیک ہے" بھیکو بولا۔"تو پھر یہ لیتے جایئے۔" یہ کہہ کر اُس نے گوتم کا چھینا ہوا بٹوا اُسے لوٹا دیا۔

"کمال کر دیا!" گوتم نے بٹوا جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔"یاد رکھنا یہ آخری بار ہے۔"

گوتم چلا گیا تو بھیکو نے کہا۔"یہ گوتم سیٹھ تو ہے۔مگر دل کا بڑا اچھا آدمی ہے۔"

سیٹھ پھول چند نے برا مان کر کہا۔"تو کیا سیٹھ لوگ اچھے نہیں ہوتے؟"

"نہیں نہیں۔ اچھے ہوتے ہیں۔" بھیکو نے بات بدلتے ہوئے کہا۔"مگر اس گوتم میں سیٹھوں جیسی بات ہی نہیں۔"

تالا توڑ سوہن بولا۔"تم اسے صرف اچھا کہتے ہو؟...... بہت اچھا ہے اپن کو بولا۔میرے پاس آنا۔ہم تمھیں نوکری دے گا۔"

اس کامریڈ کرانتی کی آواز آئی۔"اور BELIEVE IT OR NOT مجھ سے بھی کہا ہے۔جیل سے چھوٹ کر میری فیکٹری میں مزدوروں کو پڑھایا کرنا" اور پھر وہی طنز بھرا انداز"لیکن سیٹھوں کی باتوں کا کیا اعتبار۔ وہ جیل اور جیل کے ساتھیوں سب کو بھول جائے گا جب وہ اپنے ایرکنڈیشنڈ بیڈروم میں مخملی گدّوں پر سوئے گا۔!"

گوتم مخملی گدّے والے لمبے چوڑے پلنگ پر لیٹا تو تھا لیکن سو نہیں رہا تھا۔

آج اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔

جیل کی باتیں، جیل کے ساتھی، جیل میں جو کچھ ہوا تھا، جو کچھ سنا تھا وہ سب یاد آرہا تھا۔

اُس نے سگریٹ جلایا۔ ایک کش لے کر بُجھا دیا۔

اُس نے لائٹ جلائی وقت دیکھا، رات کے دو بج چکے تھے۔ پھر لائٹ بجھا دی۔

بار بار کروٹیں لیں۔ ہر بار کامریڈ کرانتی کی طنز بھری آواز سنائی دی۔ ''تو میں بتاؤں گوتم سیٹھ۔ جب اپنے ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم میں نیند نہ آئے تو باہر فٹ پاتھ پر جا کر سو جایا کرنا۔ جہاں بمبئی کے کئی لاکھوں آدمی سوتے ہیں۔ وہاں بڑی اچھی نیند آتی ہے۔''

گوتم آج تک فٹ پاتھ پر تو نہ سویا تھا۔ پندرہ دن جیل کی بارک میں زمین پر ضرور سویا تھا اور وہاں بے خوابی کی شکایت اُس کو پہلی رات کے بعد کسی دن نہیں ہوئی تھی۔

اُس نے کمبل اور دونوں تکیے اُٹھائے اور پلنگ کے پاس ہی قالین پر اپنا بستر لگالیا۔ چند منٹ بعد وہ خرّاٹے لے رہا تھا اور پانچ گھنٹے بعد جب اُس کا نوکر رامو چائے لے کر آیا تو وہ اپنے صاحب کو زمین پر سوتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''صاحب صاحب'' کہہ کر اُسے اُٹھایا تو گوتم نے آنکھیں کھولے بغیر کروٹ لے کر سوتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''رہنے دے یار بھیکو۔ بہت اچھی نیند آرہی ہے۔''

وہ جیل سے باہر آگیا تھا۔ مگر لگتا تھا جیل بھی اُس کے ساتھ باہر آگئی ہے۔

○

اندھیری رات کے مسافر

گوتم خوش خوش گنگناتا ہوا زینے سے اُتر کر نیچے آیا تو رادھا بائی ناشتہ کی میز پر تھیں۔

''ہیلو آنٹی''

''ہیلو گوتم۔ آج ناشتہ اپنے کمرے میں ہی کر لیا؟''

''اتنی بھوک جو لگی تھی۔ آج تو ڈبل ناشتہ کیا ہے میں نے۔''

اب آنٹی نے وہ سوال کیا جو اُن کو سویرے سے پریشان کیے ہوئے تھا۔ ''سنا ہے تم اپنے بستر پر نہیں سوئے۔ زمین پر سوئے۔ یہ سب کیا ہے؟''

گوتم نے اپنے نوکر رامو کی طرف دیکھا جو کمرے میں اُس کے دادا کی لگی تصویروں کو جھاڑ کر صاف کر رہا تھا۔ ضرور اُس نے یہ خبر آنٹی کو دی ہوگی۔ پھر اُس نے جواب دیا۔

آنٹی سچ بات یہ ہے کہ مجھے نرم بستر پر سونے کی عادت ہی نہیں رہی۔ جیل میں زمین پر سونا پڑتا تھا۔ بڑے مزے کی نیند آتی ہے۔ سو میں نے زمین پر بستر لگا لیا۔ کوئی بُری بات تو نہیں کی میں نے آنٹی۔

آنٹی نے سوکھا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ''بری بات تو نہیں ہے مگر انوکھی بات ضرور ہے۔''

اب گوتم اپنے دادا کی بڑی آئل پینٹنگ کے نیچے رکھے سائڈ بورڈ پر اپنی کار کی چابیاں

تلاش کر رہا تھا۔ ''آنٹی کار کی چابیاں کہاں ہیں؟''

''تمھارے ڈرائیور کے پاس ہیں۔''

گوتم نے حیرت سے کہا۔ ''میرا ڈرائیور؟'' کیونکہ اس کا ڈرائیور تو صرف نام کا تھا۔ کار وہ ہمیشہ خود چلاتا تھا۔

باہر نکل کر آیا تو دیکھا موٹر کھڑی ہے۔ پاس ہی سفید یونیفارم پہنے ڈرائیور کھڑا ہے اور ساتھ میں ایک ہٹا کٹا پہلوان جیسا آدمی خاکی یونیفارم پہنے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' گوتم نے اپنی آنٹی سے پوچھا، جو خلافِ معمول آج دروازے تک اُسے چھوڑنے آئی تھی۔

''اُس دن ایکسیڈینٹ ہو گیا تھا نا! سو ہم نے سوچا کچھ دن تمھیں موٹر نہیں چلانی چاہیے۔''

''اور یہ کون ہے؟'' گوتم نے پہلوان کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تمھارا باڈی گارڈ ہے۔ تمھاری حفاظت کے لیے ہر وقت تمھارے ساتھ رہے گا۔ دیکھو نا وہ تو خیریت ہو گئی، نہیں تو ایکسیڈینٹ کے بعد وہ فٹ پاتھ والے تمھیں مار ڈالتے!''

گوتم کے چہرے پر سنجیدگی اور اُداسی کی بدلی چھا گئی۔ ''وہ کسی کو مارتے نہیں آنٹی۔ وہ تو روز خود مارے جاتے ہیں۔''

پندرہ دن کے بعد گوتم اپنے دفتر میں داخل ہوا تو اُس نے محسوس کیا کہ اسٹاف کے سب لوگ اُس کو کسی قدر حیرت اور ڈر سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے صرف آدھے مہینے میں وہ ایک خطرناک بھوت بن گیا ہو۔

اپنے کمرے میں داخل ہوا تو آفس بوائے بھولو نے اُس کو کوٹ اُتروانے میں مدد کرنی چاہی لیکن گوتم نے اُس سے کہا۔ ''یہ کام میں خود کر سکتا ہوں۔ تم جاؤ۔''

کوٹ اُتار کر اُس نے کرسی کے کندھے پر ڈال دیا۔ پھر اپنی ٹائی اُتاری سونے کی گھڑی اُتاری۔ جیب سے سونے کا سگریٹ کیس اور لائٹر نکال کر رکھا۔ ساتھ میں بٹوہ بھی جس میں سو کے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے وہ امیری کی ان نشانیوں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔

اندر والے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو مسٹر شرما۔''

مسٹر شرما آج بڑے طنز بھرے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے۔

"WELCOME HOME, MY CHAIRMAN" سو سُوا گتم۔ خوش آمدید۔ کہیے طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''تھینک یو، مسٹر شرما'' اور اس نے فون بند کر دیا۔

پھر باہر کا فون بجا۔

''ہیلو آنٹی۔ جی ہاں۔ مجھے سب یاد ہے۔ اس وقت گیارہ بجے ہیں۔ باہر بھولو دودھ کا گلاس لیے کھڑا ہے۔ تھینک یو، آنٹی۔''

بھولو دودھ کا گلاس چاندی کی ٹرے پر رکھ کر لایا۔ اُس کو یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح دودھ اُس کو ہی پینے کو ملے گا اور ساتھ میں پانچ روپے کا انعام۔

مگر آج گوتم نے دودھ کا گلاس اُٹھالیا اور ''چیرز'' کہہ کر جیسے کبھی شراب پیتا تھا آج غٹ غٹ سارا دودھ پی گیا۔

حیرت سے آفس بوائے کی آنکھیں تقریباً باہر نکل آئیں۔

گلاس واپس کرتے ہوئے گوتم نے کہا۔'' بھولو۔ پندرہ دن جیل کا کھانا کھاؤ تو دودھ کیا دُنیا کی ہر چیز اچھی لگنے لگے گی۔''

بھولو مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا کہ گوتم نے 'ٹھہرو' کہہ کر اُسے روک لیا۔

''جی صاحب؟''

''پانچ روپیہ قرضہ دے سکتے ہو؟''

''جی صاحب؟'' بھولو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُس کے صاحب کو آج کیا ہو گیا تھا۔ یہ جیل خانے سے واپس آیا تھا کہ پاگل خانے سے؟'' جی صاحب کیا کہا آپ نے؟''

''پانچ روپے قرضہ؟''

آفس بوائے نے جیب سے پلاسٹک کا ریلوے سیزن ٹکٹ کے پاس کا پلاسٹک کور نکالا،

اس میں دو روپے چھوڑ کر ایک پانچ کا نوٹ باہر نکالا اور گوتم کی طرف کانپتے ہاتھوں سے بڑھایا۔

'تھینک یو، بھولو۔'

دروازہ بند ہوا تو گوتم نے بجلی کا سوچ دبا دیا جس سے دروازہ میں آپ سے آپ قفل لگ جاتا تھا۔ پھر فون اُٹھایا اور آپریٹر سے بات کی۔

''یس سر۔''

اگلے تین گھنٹے تک کوئی ٹیلیفون آئے تو کہہ دو صاحب BUSY ہیں۔ میں سونے والا ہوں۔ جب اُٹھوں گا تو تمھیں فون کر دوں گا۔ اس وقت تک مجھے کوئی فون کال آئے ڈسٹرب نہ کرنا۔ سمجھ گئیں؟''

لیلی نے کہا۔ ''یس سر'' اور سوچ میں پڑ گئی کہ آج یہ غیر معمولی باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔

اگلے لمحے اپنے دفتر کے کمرے میں گوتم نہیں تھا۔ صرف میز پر اُس کی سونے کی گھڑی، سونے کا سگریٹ کیس، سونے کا سگریٹ لائٹر اور بٹوہ پڑا تھا جس میں سو سو کے نوٹ بھرے ہوئے تھے اور گوتم اُس وقت کمرے کے پچھلے دروازے سے بالکنی کے کٹہرے کو پھلانگ کر اٹھارویں منزل سے لوہے کی سیڑھی سے نیچے اُتر رہا تھا۔ یہ سیڑھی بلڈنگ میں آگ لگنے کی صورت میں فائر بریگیڈ والوں کی سہولت کے لیے بنائی گئی تھی۔ یہ گوتم نہ جانے اپنی روح کی کون سی آگ بجھانے جا رہا تھا؟

دروازے پر لکھا تھا۔ ''آشا پریم چند۔''

کھٹ کھٹایا تو اندر سے ایک بچّے کی آواز آئی۔ ''دروازہ کھلا ہے میں اندر کے کمرے میں ہوں۔''

اندر جا کر گوتم نے دیکھا کہ کھڑکی کے پاس ایک پلنگ بچھا ہے جس پر ایک آٹھ نو برس کا بچّہ انیل بیٹھا ہے یا لیٹا ہے۔ اُس کی دونوں ٹانگیں پلاسٹر میں ہیں مگر کھڑکی میں سے وہ بیٹھے بیٹھے ہی ریل کو دھڑ دھڑ کرتے آتے جاتے دیکھ سکتا ہے۔ ریل کے اوپر جو پل بنا ہے اس پر دوڑتی ہوئی بسوں اور موٹروں کو اور چلتے پھرتے آدمیوں کو دیکھ سکتا ہے۔

''ہیلو۔'' گوتم نے کہا۔

''آپ ڈیڈی سے ملنے آئے ہیں نا؟'' بچّے نے کہا۔ وہ تو دفتر گئی ہیں۔

شکر ہے بچّے نے اُسے پہچانا نہیں تھا۔ پہچانتا بھی کیسے؟ اُس دن اور اُس وقت تو وہ بیچارہ بیہوش ہو گیا تھا۔

گوتم نے جھوٹ کہا۔ ''تو کیا مسٹر بھٹا چاریہ یہاں نہیں رہتے؟''

''جی نہیں۔ یہاں تو میں اور میری ڈیڈی رہتے ہیں۔ لگتا ہے، بھائی صاحب آپ کسی غلط فلیٹ میں آ گئے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے غلط فلیٹ میں آ گیا ہوں۔ گوتم نے بات بناتے ہوئے کہا۔ پانچ مالہ چڑھتے چڑھتے سانس پھول گیا ہے۔ کہو تو بیٹھ جاؤں۔''

''ضرور بیٹھیے۔'' ہنس مکھ اور مہمان نواز بچّے نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔'' آپ پانی پئیں گے بھائی صاحب؟''

گوتم نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

بچّے نے بات جاری رکھی۔'' میں بھی اکیلا بیٹھا بیٹھا بور ہو جاتا ہوں۔ میری ڈیڈی تو شام کو آتی ہیں۔''

یہی سوچ کر گوتم بھی دوپہر کو آیا تھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ آشا کے آنے کا خطرہ فی الحال نہیں ہے تو اُس نے انجان بن کر انیل سے پوچھا۔''اچھا یہ بتاؤ۔ تمھاری ٹانگوں کو کیا ہوا ہے؟''

جواب میں بچّے نے دیوار پر لگی ہوئی تصویروں میں سے ایک کی طرف اشارہ کر دیا۔ تصویر ایک لمبی چوڑی موٹر کی تھی۔ اور اس کے پہیوں کے نیچے ایک بچّے کی ٹانگیں آ گئی تھیں۔ ایسی تصویریں دیوار پر ہر طرف لگی تھیں۔ کچھ رنگین تصویریں رسالوں میں سے کاٹ کر چپکا دی گئی تھیں، ہمالیہ پر چڑھنے والوں کی تصویریں، چاند پر چلنے والوں کی تصویریں، کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والوں کی تصویریں، کچھ تصویریں رنگین چاک سے گھر میں، شاید انیل نے ہی خود بنائی تھیں۔ کسی میں لال لال بس۔ کسی میں بندر، کسی میں بچّے کھیل رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ پاس کے میز پر بھی ڈرائنگ کی ایک کاپی پڑی ہوئی تھی جس کے کھلے ہوئے صفحے پر رانا پرتاپ کی تصویر۔ ایک تاریخی کہانیوں کی کتاب سے نقل کر کے بنائی جا رہی تھی۔ مگر گوتم کی نظر پھر اُس کار والی تصویر پر واپس آ گئی۔

''ایسا بھیانک کار ایکسیڈینٹ! تمھیں تو بڑی چوٹ آئی ہوگی۔؟''

''سچ بتاؤں بھائی صاحب؟'' بہادر بچہ کہہ رہا تھا۔ ''میں تو فوراً بیہوش ہو گیا تھا۔ مجھے تو کوئی دُکھ نہیں ہوا۔ پر اُس بیچارے آدمی کو مجھے اٹھا کر پانچ مالہ کے اوپر لانا پڑا۔''

''بیچارے کو۔'' انیل کی زبانی موٹر کار والے۔ یعنی اپنے بارے میں ہمدردی کے الفاظ سن کر گوتم اچنبھے میں رہ گیا۔ ''تم اس سے نفرت نہیں کرتے؟''

''میں کسی سے نفرت وفرت نہیں کرتا۔'' انیل نے ایسے کہا جیسے ان بیکار باتوں کے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہے۔

''امیروں سے بھی نہیں؟''

''امیر آدمی۔ غریب آدمی۔ سب اچھے ہو سکتے ہیں اگر وہ بھلے آدمی ہوں۔''

''یہ بچہ تو کمال کا ہے۔ گوتم نے سوچا اور ہنس کر کہا: ''ارے واہ۔ تم تو فلاسفر نکلے۔''

انیل نے فلاسفر کا لفظ پہلی بار سنا تھا۔ پوچھا۔ ''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''ایک بُدھی وان اور بھلا آدمی جو کسی سے نفرت نہیں کرتا۔'' پھر گوتم کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا میں چلتا ہوں۔ مسٹر چٹرجی سے ملنا ہے۔''

''پر بھائی صاحب۔ جب آپ آئے تھے تو کہہ رہے تھے کہ آپ کو مسٹر بھٹا چاریہ جی سے ملنا ہے۔''

''مجھے پکڑ لیا نا تم نے؟ گوتم نے کھسیا کر کہا۔ ''چٹرجی، بھٹا چاریہ تو بہانے ہیں، بھیا۔ سچ پوچھو تو مجھے اپنی ہی تلاش ہے۔''

''وہ جانے لگا تو انیل نے کہا۔ آپ پھر آئیں گے نا؟''

''تم بلاؤ گے تو ضرور آؤں گا۔''

''ضرور ضرور آنا۔ میں اکیلا بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتا ہوں''

''اچھا میں آؤں گا۔''

''پکا وعدہ'' اور بچے نے قسم کھانے کے لیے اپنے گلے کو ہاتھ لگایا۔

''بالکل پکا۔ گوتم نے وعدہ کیا اور اپنے گلے کو ہاتھ لگا کر قسم کھائی۔

انیل سے مل کر گوتم کو ایک عجیب خوشی کا احساس ہوا تھا۔ وہ پندرہ دن پرانا گناہ کا بوجھ جو اُس کے ضمیر پر تھا وہ کچھ ہلکا ہوتا دکھائی دیتا تھا۔

وہ کچھ گنگناتا ہوا لکڑی کے زینے پر سے اُترتا چلا گیا۔ اسی زینے پر وہ بیہوش انیل کو ہاتھوں میں لیے ایک رات کو چڑھتا گیا تھا۔ اُس وقت یہی زینہ یہی پانچ مالہ کا زینہ کتنا اونچا لگا تھا چڑھاؤ اور اُتار میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

بلڈنگ سے باہر آ کر سڑک پر بس اسٹینڈ پر بس رُکتی ہوئی دکھائی دی تو وہ اُس طرف دوڑا۔ چلتی ہوئی بس میں چڑھ گیا۔

بس چلی گئی۔

پھر ایک اور بس مخالف سمت سے آئی۔

اس بس میں سے جو مسافر اُترے اُن میں آشا پریم چند بھی تھی۔ جو دفتر سے واپس آ رہی تھی۔

ایک شاعر نے اندھیرے سمندر میں دو جہازوں کو پاس سے گذرتے دیکھ کر نظم لکھ دی کہ دنیا کے اس اندھیرے میں، ہم ان مسافروں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے، پہچان نہیں سکتے۔ تعجب ہے کہ آج تک بمبئی کے کسی شاعر نے بسوں کے انجانے مسافروں کے بارے میں کوئی نظم نہیں لکھی۔ جو اُترتے رہتے ہیں چڑھتے رہتے ہیں مگر ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔ ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے۔

آشا کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے آواز لگائی۔ ''ہیلو انیل۔''

''ہیلو دیدی۔'' انیل نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ''بڑی دیر کر دی آج۔؟''

آشا نے قریب جا کر بھائی کو گلے لگایا، پیار کیا۔ پھر پوچھا۔ ''کہو آج دن بھر کیا کرتے رہے؟''

''پہلے تو کتاب پڑھی۔ پھر تصویر بنائی۔''

''دکھاؤ کون سی تصویر۔؟'' اور پھر رانا پرتاپ کی تصویر دیکھ کر ''ارے واہ یہ تو بہت اچھی تصویر ہے۔''

''پھر چاچی کھانا لے کر آ گئیں اور انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔''

''اچھی ہیں نا چاچی۔''

''بہت اچھی۔''

پھر انیل کو ایک دم یاد آیا۔ دیدی ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ ایک صاحب بھول سے ہمارے گھر میں آ گئے تھے۔ کسی چڑجی یا بینرجی کی تلاش کر تے تھے۔

''اچھا!'' آشا نے اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

انیل مزے لے لے کر سب سناتا رہا۔ ''میں نے کہا، بیٹھیے، وہ بیٹھ گئے۔ بڑے مزے کی باتیں کر رہے تھے۔ بہت بھلے آدمی تھے وہ دیدی۔''

مگر آشا جرنلسٹ تھی، رات دن چوروں، ڈاکوؤں، مجرموں کے بارے میں سنتی اور پڑھتی رہتی تھی، بچے کو پھسلانا کون سی مشکل بات ہے! اُس نے سوچا انیل کو تنبیہ کر دینا چاہیے۔ ''ہو سکتا ہے کوئی بھلا آدمی ہو، ہو سکتا ہے کوئی برا آدمی ہو، ایسے اجنبی لوگوں سے گھل مل جانا اچھا نہیں۔ آئندہ ایسے لوگوں کو گھر میں مت آنے دیا کرو۔''

کہنے کو تو اُس نے کہہ دیا لیکن فوراً ہی آشا کو احساس ہوا کہ اُسے یہ کہنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ انیل نے روکھا ہو کر اپنی پلاسٹر میں جکڑی ٹانگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم ہی بتاؤ دیدی اِن لوگوں کو اِس حالت میں اندر آنے سے کیسے منع کروں؟ دروازہ تو ہمیشہ کھلا ہی رہتا ہے۔''

آشا سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور اُس نے انیل کو پیار سے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

چندراولا کے ڈائننگ روم میں لمبی چوڑی ڈائننگ ٹیبل کے دو کناروں پر بیٹھے ہوئے گوتم اور اُس کی آنٹی کھانا کھا چکے تھے۔ اب بٹلر جان کافی کی پیالیاں اُن کے سامنے رکھ رہا تھا۔ پھر وہ وہاں سے واپس کچن میں چلا گیا۔

''گوتم!''

''جی، آنٹی۔''

''تم جانتے ہو جب تم اپنی بیوقوفی اور ضد کی وجہ سے جیل میں تھے تو ہمیں کمپنی کا کام چلانے میں کافی دقت ہوئی۔ تمھارے دستخط کے بغیر تو مسٹر شرما کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ

کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

ایک سیب سے کھیلتے ہوئے گوتم نے کہا۔" کیوں، آنٹی۔ مسٹر شرما تو سنا ہے بغیر دستخطوں کے ہی کافی کام کر لیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جب بھی میرے سامنے وہ کوئی کاغذ یا چیک رکھتے ہیں، میں اُس پر بنا سوچے سمجھے دستخط کر دیتا ہوں۔"

"وہ تو تمھیں کرنا ہی چاہیے۔" آنٹی نے اُس کے قریب کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مسٹر شرما بڑے سینئر آدمی ہیں۔ اُن پر تم پورا بھروسہ کر سکتے ہو۔" اب انھوں نے لال فیتہ بندھے ہوئے قانونی قسم کے کاغذ نکالے اور گوتم کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ میری رائے میں تم یہ پاوَر آف اٹرنی سائن کر دو اور سارے کام کا بوجھ مسٹر شرما پر ڈال دو۔ اس کے بعد تم چھٹی منانے آرام سے کشمیر جا سکتے ہو۔"

"اوہ! کشمیر؟ خوب یاد دلایا۔" اور پھر فروٹ ڈش میں سے دو سیب نکال کر کہا۔" یہ سیب بھی تو کشمیر سے آئے ہیں۔ دو چار لے جاتا ہوں۔ رات کو بھوک لگتی ہے نا!" یہ کہہ کر گوتم نے سیب اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیے۔

آنٹی کا بیان جاری رہا۔" جی چاہے تو لندن یا پیرس چلے جاؤ۔ فرانس بڑا رنگین ملک ہے تمھیں ضرور پسند آئے گا۔ وہاں کی شامپین تو کمال کی ہوتی ہے۔"

گوتم نے ایک لفظ کو پکڑ لیا۔" شامپین! آنٹی۔ شامپین تو انگوروں کی بنتی ہے نا۔" اور انگوروں کا ایک گچھا اُٹھا کر۔" میں یہ انگور بھی لے جاتا ہوں باقی باتیں کسی اور دن کریں گے۔ اب تو نیند آ رہی ہے۔ جیل میں تو نو بجے ہی بتیاں بُجھا دیتے ہیں نا؟ گڈ نائٹ، آنٹی۔" اور وہ زینہ پر چڑھتا ہوا چلا گیا۔

رادھا بائی اُس کو جاتے دیکھتی رہی۔ اُس کے چہرے پر لالچ اور نفرت کی سخت لکیریں اُبھر آئیں اور اُس نے منہ بنا کر کہا:" ہونہہ! پاگل کہیں کا۔ ہر وقت جیل کی ہی باتیں کرتا رہتا ہے!"

وہ پاگل، یعنی گوتم اپنے بیڈ روم میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور ایک جاپانی ٹیلی ویژن سیٹ پر پروگرام دیکھ رہا تھا کہ برابر میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ٹیلی فون اُٹھا کر اُس نے کہا۔" ہیلو"

دوسری طرف سے آواز آئی۔" ہیلو گوتم ڈارلنگ!"

گوتم کے چہرے پر اُکتاہٹ کے آثار دکھائی دیے ایک بڑے طنز بھرے لہجے میں اُس نے جواب دیا۔ ''جی۔ آپ نے سنا نہیں کہ آپ کے گوتم ڈارلنگ کا تو دیہانت ہوگیا۔ موٹر ایکسیڈینٹ میں۔''

مایا ایک باریک شفون کا ڈانس ڈریس پہنے ہوئے، ایک ہوٹل کے ڈانس ہال سے ٹیلی فون کر رہی تھی۔ رنگین، جوان جوڑے اس کے پس منظر میں ڈانس کر رہے تھے۔ بینڈ کے سنگیت کے شور میں اُس کی آواز مشکل سے ہی سنائی دیتی تھی۔ سو اُس کو چیخ کر بولنا پڑ رہا تھا۔

''اوہ ڈارلنگ لگتا ہے تم اب بھی خفا ہو مجھ سے۔ اُس دن تم ساری بات غلط سمجھے۔''

''نہیں مایا'' گوتم ایک ایک لفظ کو چبا کر ادا کر رہا تھا۔ ''غلط تو میں اُس دن تک سمجھ رہا تھا۔ اُس دن تو بات صاف ہوگئی۔''

مایا خوش ہو کر بولی۔ ''تو پھر ہم لوگ پہلے کی طرح کیوں نہ ملیں؟ اِس دم موکامبو چلے آؤ۔ آج یہاں بڑے مزے کا ڈانس ہو رہا ہے۔

"YOU WILL LOVE IT DARLING, PLEASE!"

''اب تم غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہو۔ گڈ نائٹ مس مایا رانی!'' اور اُس نے ٹیلی فون کا چونگا اُٹھا کر رکھ دیا۔

اس انسلٹ کی تاب نہ لا کر مایا بے اختیار چلاّ پڑی۔

"YOU BASTARD!"

اس کی سوسائٹی میں گالی ہمیشہ انگریزی میں دی جاتی تھی! پھر مایا نے فون کو دھڑ سے پٹخ دیا۔ اور اُسی وقت ڈانس بینڈ کی میوزک چلاّ پڑی۔ ٹرمپٹ کی آواز ایسے نکلی جیسے یہ مایا کے گھائل ابھیمان کی آواز ہو۔

O

بدنام اگر ہوں گے تو......

اگلے دن انیل مغموم صورت بنائے ہوئے اپنے پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھا نیچے سڑک پر آتی جاتی موٹروں، گاڑیوں، بسوں کے کارواں کو دیکھ رہا تھا۔

دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی تو انیل بے اختیار بولا۔ ''کون ہے؟'' حالانکہ اُس کا دل جانتا تھا کہ اس وقت کون آیا ہوگا۔

''میں ہوں تمھارا کل والا دوست۔'' گوتم نے دروازے سے ہی جواب دیا۔ ''کل میں چٹرجی بینرجی کی تلاش میں آیا تھا اور اب میں صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ کیا میں آجاؤں اندر!''

''نہیں۔'' انیل نے غمگین چہرہ بنا کر کہا۔ ''میری دیدی نے منع کیا ہے۔ کہا ہے انجانے لوگوں سے خبردار رہنا۔''

گوتم کے مسکراتے ہوئے چہرے پر بھی سنجیدگی کی پرچھائیں پڑ گئی۔ ''اچھا میں جاتا ہوں۔''

مگر وہ گیا نہیں جب تک انیل نے ''نہیں نہیں'' کہہ کر اُس کو روک نہ لیا۔ ''آپ مت جایئے۔ میں دیدی سے نہیں کہوں گا۔''

قریب آکر گوتم نے کرسی پر بیٹھ کر اور اپنے تھیلے کو زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''کہو۔ انیل کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں'' انیل نے اب مسکرا کر کہا اور پھر تھیلے کی طرف دلچسپی سے دیکھتے ہوئے۔

''اس بیگ میں کیا ہے؟''

''بہت سی چیزیں ہیں۔''

''مجھے دکھاؤ نا۔''

''ضرور دکھاتا ہوں۔'' کہہ کر گوتم نے تھیلا اٹھایا اور جیسے جادوگر اپنے بھان متی کے پٹارے میں سے چیزیں نکالتا ہے اُس طرح بچے کو خوش کرنے کے لیے ڈرامائی انداز میں ایک ایک چیز نکالتا گیا اور اُس کا نام بولتا گیا۔ ''دیکھو یہ ہیں سنترے، یہ ہیں سیب، اور یہ ہیں انگور اور دیکھو یہ ہیں وٹامن کی گولیاں۔ تمھیں طاقت دیں گی اور یہ ہیں کیلشیم کی گولیاں تمھاری ہڈیوں کو مضبوط بنائیں گی اور دیکھو میں کیا کیا نکالتا ہوں۔ میں نکالتا ہوں، چاند پر چلنے والا آدمی۔''

چاند پر راکٹ میں بیٹھ کر جو امریکن کاسموناٹ گئے تھے۔ ایسا ہی ڈریس پہنے ہوئے ایک ٹین کی گڑیا تھی جو چابی دینے سے چلنے لگتی تھی۔ اس کو دیکھ کر پہلے تو انیل بڑا خوش ہوا پھر اُسے ہاتھ میں لے کر دفعتاً غمگین ہو گیا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' گوتم نے پوچھا۔ ''کیا یہ کھلونا پسند نہیں آیا؟''

انیل نے کھڑکی کی طرف سے منہ پھیرا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ روکھی آواز میں وہ بولا۔ ''لوگ چاند پر چل رہے ہیں اور میں زمین پر بھی نہیں چل سکوں گا۔'' اور پھر اپنی ٹانگوں کے سخت پلاسٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے۔ ''کبھی نہیں کبھی نہیں، کبھی نہیں۔''

گوتم نے اُس کا ننھا سا ہاتھ پکڑ لیا کہ کہیں وہ اپنی ٹانگوں کو مار مار کر پھر زخمی نہ کر ڈالے۔ ''فکر نہ کرو پہلوان'' اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر اُس کو منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب دیکھتے جاؤ۔ کیا ہوتا ہے؟''

یہ کہہ کر اُس نے اپنا پرانا باجا نکال کر اپنی پرانی اکلوتی اور محبوب دُھن بجانی شروع کی۔ اِس دُھن میں بچپن کا بھولا پن تھا اور زندگی کا تجربہ بھی، خوشی کا احساس بھی اور درد سے آشنائی بھی۔ اُس دُھن کو سن کر تھوڑی دیر کے لیے تو انیل واقعی بھول گیا کہ اُس کی ٹانگیں پلاسٹر کے شکنجے میں پھنسی ہوئی تھیں، چلنے کے ناقابل تھیں، دُنیا سے، قسمت سے، بھگوان سے اُس کی شکایت

جاتی رہی۔ وہ سنگیت کی دھارا میں بہہ گیا۔ جو خوشی کی دھارا تھی خود فراموشی کی دھارا تھی۔

اور اب اُس کے منہ سے سگریٹ کا دھواں نکل رہا تھا اور دھویں کے ساتھ ہی ایک گانے کے الفاظ بھی جو زندگی کی تکلیفوں اور مشکلات کو سگریٹ کے دھویں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔

گوتم گا رہا تھا۔ زندگی سگریٹ کا دھواں۔

'اور اب اپنی ٹانگوں کی تکلیف اور معذوری کو بھول کر انیل اپنے ہاتھوں سے دُھن پر تال دے رہا تھا۔

گوتم گا رہا تھا

ناچ رہا تھا۔

تھرک رہا تھا۔

انیل کو ڈرا رہا تھا۔

انیل کو ہنسا رہا تھا۔

انیل کا دل بہلا رہا تھا۔

وہ انیل کی زندگی میں امید کی کرن روشن کر رہا تھا۔ ایک ایسے آنے والے کل کی خبر دے رہا تھا جب آج کا معذور اور اپاہج انیل دوڑ سکے گا، فٹ بال کھیل سکے گا، ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں پر چڑھ سکے گا اور ایک دن ساری دُنیا اس کو چاند پر چلتے ہوئے بھی دیکھے گی......

گویا بات جہاں سے شروع ہوئی تھی اُس مقام پر آ کر گانا رُک گیا۔ مگر اس عرصے میں انیل کا موڈ بدل گیا۔ جہاں مایوسی تھی، اُن آنکھوں میں اب اُمید اور خوشی کی روشنی چمک رہی تھی۔

گانا ختم کرتے ہوئے گوتم نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر کسی قدر پریشانی اور جلدی سے کہا۔ کیوں کہ اُسے ڈر تھا کہ آشا واپس آ کر اُس کا سب بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ ''اچھا انیل۔ اب مجھے جانا چاہیے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر پھلوں وغیرہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ '' یہ سب میں تمھارے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔''

انیل نے معصومیت سے پوچھا۔ '' آپ بہت امیر آدمی ہیں کیا؟''

گوتم نے کسی قدر گھبرا کر پوچھا۔ '' مگر تم نے یہ سوال کیوں کیا؟''

''میری دیدی کہتی ہیں۔'' انیل نے کسی قدر پس و پیش کرتے ہوئے کہہ ڈالا۔'' امیروں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں۔''

''تمھاری دیدی ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر میں تو اتنا غریب ہوں کہ یہ سیب اور سنترے بھی میں نے تمھارے لیے چرائے ہیں اور باقی یہ سب قرضہ لے کر خریدا ہے۔''

''مگر یہ سب کیوں کیا آپ نے؟'' انیل نے بھولے پن سے سوال کیا۔

''مائی ڈیر انیل'' گوتم نے گہری سانس لے کر جاتے جاتے کہا۔'' یہ سب اس لیے کیا کہ تم میری ایک ایسی بیماری کا علاج کر رہے ہو جو ٹانگ ٹوٹنے سے بھی زیادہ بھیانک ہے۔''

وہ انجانا آدمی، جس کا نام بھی انیل کو معلوم نہیں تھا لیکن بچّے کے ننھے مگر ذہین دماغ میں ایک کُلبُلاتا ہوا سوال چھوڑ گیا۔'' وہ کون سی بیماری ہوتی ہے۔''

بس BUS آئی۔ ٹھہری۔

اگلے دروازے سے ایک بھیڑ اُتری اُس بھیڑ میں آشا بھی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ایک کاغذ کی تھیلی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں اپنا بٹوہ اور اخباروں رسالوں کا ایک پلندہ۔

وہ قدم بڑھاتی ہوئی آگے چلی گئی۔

بس کے پچھلے دروازے سے مسافر چڑھ رہے تھے۔ گوتم بھاگتا ہوا آیا اور چلتی ہوئی بس میں چڑھ گیا۔

آشا نے گوتم کو نہیں دیکھا۔

گوتم آشا کو نہیں دیکھ سکا۔

بمبئی کی بسیں اور اُن کی بھیڑ بار بار یاد دلاتی ہیں کہ 'اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا'

کمرے میں داخل ہوتے ہی آشا نے اخباروں کا پلندہ اور اپنا بٹوہ ڈریسنگ ٹیبل پر پٹک دیا۔ اب اُس کے ہاتھ میں صرف کاغذ کی تھیلی تھی۔

''دیدی!'' انیل خوشی اور تعجب سے چلایا۔'' آج سویرے ہی آ گئیں؟''

''آشا نے قریب آتے ہوئے کہا۔'' مجھے تمھاری چنتا رہتی ہے نا۔'' چاچا نے جلدی چھٹی دیدی۔'' اور پھر تھیلی میں سے چند چھوٹے چھوٹے کیلے اور لیمو کے سائز کی نارنگیاں نکالتے ہوئے۔'' یہ دیکھو میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں کیلے اور سنترے۔''

عین اُسی وقت اُس کی نظر اُن بڑے بڑے سنتروں اور لال لال سیبوں پر پڑی جو پلیٹ میں پڑے گویا اُس کے لائے ہوئے پھلوں کا منہ چڑا رہے تھے۔'' ارے یہ سب کون لایا؟ چاچی؟''

انیل نے خاموشی سے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ آشا نے بھی اپنی غلطی کا احساس کیا۔'' ہاں۔ وہ بیچاری کہاں سے لائیں گی؟ سیب تو ڈیڑھ روپے کا ایک ملتا ہے اور انگور دس روپے کلو۔ سیب انگور تو صرف دھن والے ہی کھا سکتے ہیں۔'' پھر اُس کی آنکھوں میں شبہ چمک اُٹھا۔'' انیل سچ سچ بتاؤ یہ کون لایا ہے؟''

اب تو انیل کو رُک رُک کر مجرموں کی طرح نظریں جھکا کر اقرار کرنا ہی پڑا۔'' دیدی۔ وہ آدمی آج پھر آیا تھا۔''

''تو یہ سب وہ لایا ہے؟''

''جی دیدی۔ اور یہ بھی۔'' یہ کہہ کر انیل نے بہن کو دواؤں کی شیشیاں اور کھلونا بھی دکھایا۔

''میں نے تو تمھیں منع کیا تھا۔'' پھر اُس کے دماغ میں ایک اور شبہ نے سر اُٹھایا۔'' بہت امیر آدمی ہے کیا وہ؟''

''چور بھی ہو سکتا ہے۔'' انیل نے جواب دیا۔'' جادوگر بھی ہو سکتا ہے۔ جب میں رو رہا تھا۔ انھوں نے گانا سنا کر مجھے ہنسا دیا۔''

آشا نے ''چور'' اور جادوگر'' دونوں لفظوں پر غور کر کے فیصلہ سنایا'' چور جادوگر بھی ہو تو زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

انیل نے اپنی دیدی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔'' پر دیدی۔ ہمارے ہاں۔ ہے ہی کیا چرانے کے لیے؟''

اور جواب میں آشا نے اپنے پیارے بھائی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔'' کون جانتا ہے وہ تجھے ہی چرانے آیا ہو؟''

آشا کے چہرے پر گہری فکر کے آثار تھے۔
مگر ننھا بھولا انیل مسکرا رہا تھا۔
"آزاد' اخبار کی ٹیلی فون آپریٹر باہر کے دروازے کے پاس ہی بیٹھی تھی۔
آشا داخل ہوئی تو اُس نے کہا۔" آشا۔ ایڈیٹر صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"
آشا سیدھی ایڈیٹر صاحب کے دفتر میں گئی۔ میں اندر آسکتی ہوں؟ کہہ کر اندر گئی۔
"آؤ۔" ساہنی صاحب نے صرف اتنا ہی کہا۔ آج وہ چپ چپ اور کسی قدر پریشان دکھائی دیتے تھے۔ ایک لفافہ اُٹھا کر انھوں نے آشا کی طرف بڑھا دیا۔
اُس نے کھڑے کھڑے ہی خط نکال کر پڑھا۔ اُس کے چہرے پر تعجب اور ہلکے سے استعجاب کے آثار نمودار ہوئے۔ تین مہینے کا نوٹس؟ اُس نے کہا یا اُس نے پوچھا۔" تو یہ ہے اچھے کام کا انعام۔"
اُس کے طنز بھرے لہجے نے ساہنی صاحب کی جھجک توڑ ڈالی۔" نہیں۔ یہ تمھاری ضد کی سزا ہے۔ اگر تم اب بھی چاہو تو میں یہ نوٹس واپس لے سکتا ہوں۔"
"صرف مجھے گوتم چندرا جی سے معافی مانگنی پڑے گی؟" آشا کے لہجے میں وہی طنز اب بھی تھا۔" اُس کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ اصول کے معاملے میں کبھی سمجھوتہ بازی نہ کرنا— یہ بھی آپ ہی نے سکھایا تھا۔ نمستے ایڈیٹر صاحب اور دھنیہ واد۔"
ایڈیٹر کے دفتر سے وہ سیدھی نیوز ایڈیٹر کے کمرے میں پہنچی۔ خاموشی سے چاچا کے ہاتھ میں وہ نوٹس دے دیا۔
"تین مہینے کا نوٹس؟" چاچا نے پڑھ کر کہا۔" لاحول ولاقوۃ!" اور پھر جیسے بچے کو دلاسہ دیتے ہیں۔" تو فکر نہ کر بیٹی ہم سب سمجھ لیں گے۔ تو جا کے اطمینان سے انیل کی دیکھ بھال کر۔"

انیل دیکھ بھال کے بغیر بھی ہنس رہا تھا۔
مگر یہ ایک ہنستے ہوئے بچے کی تصویر تھی۔ جس میں وہ رنگین پنسلوں سے رنگ بھر رہا تھا۔
چاچا کا بڑا بچہ امجد جو اُس سے عمر میں ایک آدھ سال بڑا ہوگا اُس کے پاس بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا۔
"ارے واہ" امجد نے ہنس کر کہا۔" یہ تو بالکل تیری فوٹو بن گئی ہے۔"

انیل نے اپنے کام سے نگاہ اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ''یہ تو ہنستا ہوا بچّہ ہے؟'
''تو بھی تو آج کل بہت خوش رہتا ہے۔''

اور یہ سچ بھی تھا کہ جب سے گوتم نے اُس کے پاس آنا جانا شروع کیا تھا انیل واقعی بڑا خوش رہتا تھا۔

اتنے میں حاجی کی گرجدار پوربی لہجے کی آواز آئی۔ ''ارے آج جمعہ کا دن ہے۔ آج تو نہا لے۔''

''کیا مصیبت ہے!'' امجد نے ہلکے سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور بادل ناخواستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا انیل۔ میں ابھی آیا۔''

امجد کے جانے کے چند منٹ بعد دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی تو انیل نے اوپر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ کر خوشی سے کہا۔ ''آجایئے۔''

گوتم داخل ہوا۔ ''ہیلو انیل۔''

''نمستے بھائی صاحب۔'' انیل گوتم کو انکل'' کہتا تھا مگر کبھی کبھی بھولے سے ''بھائی صاحب'' کہہ کر بھی پکارتا تھا۔

''کہو پہلوان کیسے ہو؟''

'ایسا ہوں۔' اور یہ کہہ کر انیل نے تصویر میں ہنستے ہوئے بچّے کی طرف اشارہ کر دیا۔

''ارے واہ'' گوتم نے کہا۔ ''یہ تو تم نے بڑی بڑھیا تصویر بنائی ہے۔''

انیل نے سچ بولنا ہی بہتر سمجھا۔ ''تصویر تو دیدی نے بنائی ہے۔ میں نے تو اس میں صرف رنگ بھرے ہیں۔''

گوتم نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یار۔ تمھاری دیدی تو کمال ہیں! جرنلسٹ ہیں، وکیل ہیں اور اب معلوم ہوا کہ آرٹسٹ بھی ہیں۔''

پھر دیوار کی طرف دیکھ کر جو سب تصویروں سے بھری ہوئی تھیں۔ ''مگر اسے لگاؤ گے کہاں؟ تمھاری دیواریں تو سب بھر گئی ہیں۔''

انیل نے پلنگ کے بالکل سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک آدھ ہی تصویر لگی تھی۔ ''وہاں۔ جہاں میں اسے ہر وقت دیکھ سکوں۔''

اور پھر لجاجت بھرے لہجے میں۔ ''آپ کر پا کر کے اسے وہاں لگا دیں گے؟''

ضرور۔

اور گوتم تصویر کو لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہاتھ میں چار چھ ڈرائنگ پن سنبھالے اور دیوار کے پاس رکھے ہوئے ایک مونڈھے پر چڑھ کر تصویر کو دیوار پر مختلف جگہ رکھ کے انیل کو دکھانے لگا۔

''انیل۔ یہاں؟''

''نہیں نہیں۔ وہاں۔

''یہاں؟''

''ذرا اوپر...... نہیں نہیں...... نیچے......''

اوپر نیچے...... دائیں بائیں۔ یہاں وہاں۔ تصویر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک بار انیل نے کہا۔ ''ہاں ہاں۔ یہاں۔ بس بس۔''

گوتم نے ڈرائنگ پن لگائے تو ایک اُس کی انگلی میں چبھ گیا۔ 'اُف' کر کے پیچھے کو ہوا تو پیروں کے نیچے مونڈھا ڈگمگایا۔

گوتم کو اس طرح ڈگمگاتے دیکھ کر انیل ہنسنے لگا۔

انیل کو ہنستے دیکھ کر گوتم کو ہنسی آ گئی۔

گوتم اور ہنسا۔

انیل اور ہنسا۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور دونوں کی ہنسی ہوا میں بکھر کر سو گئی۔ آشا کی ساڑی دروازے میں لہرائی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اُس نے غصے سے پوچھا اور پھر گوتم کی طرف دیکھ کر اُس کی بھویں اوپر کو چڑھ گئیں اور آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

گوتم نے مونڈھے پر سے اُترتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ لیجیے پرائشچت کر رہا ہوں۔''

انیل نے جلدی سے تعارف کرانے کی کوشش کی۔ ''دیدی یہی ہیں وہ۔''

''جن کی لمبی چوڑی موٹر کار نے تمھاری ٹانگوں کو کچل دیا تھا؟'' آشا نے اپنی طرف سے

انیل کے جملے کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

''یہ وہی ہیں جن کے ہاتھوں تمھارا خون ہوسکتا تھا۔''

انیل بھی اپنی بات کا پکا تھا۔ اپنی دیدی سے ڈرتا تھا مگر اپنے دوست کی ہتک ہوتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ پر۔ دیدی۔ یہ میرے۔ دوست ہیں!''

اب آشا نے دہکتی آگ بھری آنکھوں سے گوتم کی طرف دیکھا۔ بھولے بھالے بچّے کو آپ کھلونوں کی رشوت دے کر اور گانا سنا کر اپنے جال میں پھنسا سکتے ہو۔ مگر مجھے نہیں، مسٹر گوتم۔'' پھر اُس نے امیر نوجوان کو اُس کا نیا کارنامہ سنا دیا۔'' آج آپ کے کہنے سے مجھے نوکری سے نکال دیا گیا۔''

گوتم نے حیرت سے کہا:'' میرے کہنے سے آپ کو نوکری سے نکال دیا گیا؟''

''جی ہاں۔'' آشا بولی۔'' آپ کو اور کچھ کہنا ہے؟''

پھر آشا نے دروازے کی طرف دیکھا جیسے اُسے باہر نکل جانے کا حکم سنا رہی ہو۔ اگر گوتم اُسے نوکری سے نکلوا سکتا تھا تو وہ بھی اُسے گھر سے باہر نکال کر انتقام لے سکتی تھی۔

گوتم نے ایک بار انیل کی طرف دیکھا۔

انیل نے گوتم کی طرف دیکھا۔

گوتم نے اپنا انگوٹھا اونچا کیا۔ گو اشارے سے کہہ رہا ہو۔

''تمھاری دیدی کے غصے کے باوجود میں تمھارا دوست ہوں۔''

انیل نے بھی اپنا انگوٹھا اونچا کیا۔ گویا کہہ رہا ہو'' میں سمجھتا ہوں، میرے دوست۔''

پھر گوتم خاموشی سے کمرے کے باہر چلا گیا۔

آشا سیدھی انیل کے پلنگ کے پاس آئی جہاں گوتم کے لائے ہوئے کھلونے بکھرے پڑے تھے۔

آشا کے من میں ایک شبہ اُٹھ رہا تھا۔ کیا اُس کے چھوٹے بھائی نے اُس کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔

''انیل سچ سچ بتا۔'' آشا نے انیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔'' تجھے معلوم

تھا نا یہی ہے وہ موٹر والا؟"

جواب میں انیل نے نظریں جھکا کر سر ہلا دیا۔

بچے کب کسی سے خفا ہوتے ہیں۔ کب اُسے معاف کر کے دوستی کر لیتے ہیں۔ یہ بھگوان جانتا ہے یا بچے ہی جانتے ہیں۔

ایڈیٹر ست پال ساہنی نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے کا دروازہ کھل رہا تھا اور اس میں سے سیٹھ گوتم چندرا اندر آ رہا تھا۔ وہ ایک بڑھیا سوٹ پہنے تھا۔ آستینوں میں سونے کے بٹن لگے تھے۔ بڑھیا ریشمی ٹائی لگی تھی اب وہ واقعی پچاس ساٹھ لاکھ روپے کا مالک نظر آ رہا تھا۔

"گوتم چندرا جی! آپ!" ایڈیٹر صاحب بے اختیار کھڑے ہو گئے۔" آیئے۔ آیئے۔ تشریف رکھیے۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟ میں خود حاضر ہو جاتا۔"

"کام میرا ہے۔" گوتم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔" سو مجھے ہی آنا چاہیے تھا؟"

'کام' کا ذکر سن کر ایڈیٹر صاحب نے سمجھا۔ ضرور آشا کو نکالنے کی بات ہوگی۔ اس کا اطمینان کرنے گوتم چندرا جی آئے ہوں گے۔ سو انھوں نے بڑے اطمینان اور بھروسے سے کہا۔

"جی۔ وہ کام تو آپ کا ہو ہی گیا، سیٹھ صاحب۔ ہم نے اُس لڑکی کو نوٹس دے دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے۔" گوتم نے کہا اور ساہنی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر اگلے لمحے گوتم نے بات اور انداز دونوں کو بدل دیا۔" مگر میں سوچتا ہوں بہت اچھا نہیں کیا آپ نے۔"

'جی؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!" ایڈیٹر نے گڑ بڑا کر کہا۔" ہم نے بالکل وہی کیا جو آپ نے ہمیں لکھا تھا۔"

"ہم نے؟" گوتم نے 'مغل اعظم' کے انداز میں بڑے رعب سے کہا۔

"جی۔ وہ۔ میرا مطلب ہے کہ آپ ہوں یا آپ کی طرف سے آپ کے جنرل منیجر مسٹر شرما ہوں۔ ہمارے لیے ایک ہی بات ہے!"

"بالکل ٹھیک ہے۔" گوتم نے زور سے کہا مگر شرما صرف آج کی سوچتے ہیں۔ ہم آگے کی سوچتے ہیں۔ کیا سمجھے آپ؟"

''جی۔ جی؟ میں کچھ نہیں سمجھا۔'' ایڈیٹر صاحب بیچارے کو یہ سب گورکھ دھندا لگ رہا تھا۔

اب گوتم نے بڑی لا پرواہی کے انداز میں کہا: ''اگر آپ نے اُس لڑکی کو، کیا نام ہے اُس کا؟'' بزنس کے بارے میں وہ کچھ نہ جانتا ہو مگر ایکٹنگ کرنا اُسے آتا تھا۔

ایڈیٹر نے کہا۔ ''جی؟ آشا۔ آشا پریم چند۔''

اب گوتم نے اپنی بات پوری کی۔ ''اگر آپ نے آشا پریم چند کو نوکری سے نکال دیا تو یہ بات ہمارے امیج IMAGE کو خراب کرے گی۔ میری بات مانئے تو اس کا نوٹس واپس لے لیجیے۔''

''نوٹس واپس لے لوں؟'' جس طرح ساہنی نے یہ الفاظ دہرائے اُس سے سے معلوم ہوتا تھا کہ خود اُس کی دلی منشا یہی ہے۔ ''بہت اچھا۔ جیسی آپ کی آگیا (حکم)۔''

گوتم نے اب بات کو پھیلا کر کہا۔ ''ہمارے خلاف وہ اور کچھ بھی لکھنا چاہے تو لکھنے دیجیے۔ اُس سے آپ کا نام ہوگا!''

''مگر آپ کی تو بڑی بدنامی ہوگی، سیٹھ صاحب۔''

''ہونے دیجیے'' گوتم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!'' شعر پر تو بات ختم ہو ہی جاتی ہے!

ایڈیٹر صاحب دروازے تک گوتم کو چھوڑنے آئے۔ گوتم گیا تو واپس جاتے وقت انھوں نے سوچا کہ ہال میں سب ایڈیٹروں، رپورٹروں کو بھی دیکھتے چلیں وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اچھے خاصے جلوس کی شکل میں سب لوگ چلے آرہے ہیں آگے آگے نیوز ایڈیٹر چاچا۔ ساتھ میں بھیم سنگھ، پھول چند اور باقی تمام سب ایڈیٹر اور رپورٹر سب کی نگاہوں میں خاموش غصے کی جوالا بھڑک رہی تھی۔

''کیوں بھئی'' جب ایڈیٹر صاحب چاروں طرف سے گھیر لیے گئے تو انھوں نے پوچھا۔ ''یہ کیسی پریشانی ہے؟ بات کیا ہے؟''

چاچا سلیم نے بے دھڑک سوال پوچھا۔ ''یہ گوتم چندرا یہاں کیوں آیا تھا؟''

اُس کے بعد تو ایک کے بعد ایک زبانی حملہ ہوتا رہا۔

''بھیم سنگھ نے کہا۔'' کیا اب یہ ہمارے اخبار کی پالیسی بنایا کرے گا۔''

''پھول چند نے کہا: ''سوا لاکھ کا سالانہ اشتہار کیا دیتا ہے۔ اپنے آپ کو اخبار کا مالک سمجھ بیٹھا ہے؟''

ایڈیٹر صاحب نے کہا: ''یہ تو گھیراؤ سا معلوم ہوتا ہے۔ آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟''

چاچا سلیم نے کہا: ''اگر آشا کو نوٹس دیا گیا ہے تو ہم سب بھی اپنے استعفیٰ ابھی دیتے ہیں۔''

''بس یہی کہنے ہم لوگ یہاں آئے ہیں۔'' یہ بھیم سنگھ کی آواز تھی۔

ایڈیٹر نے ہتھیار رکھتے ہوئے کہا: ''بھئی تم لوگوں کے بغیر تو میں اپنا اخبار چلا ہی نہیں سکتا۔''

بھیم سنگھ نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا: '' تو پھر آشا کو جو نوٹس دیا ہے وہ واپس لیجیے۔''

پھول چند نے کہا: ''یہ ہماری ڈیمانڈ ہے۔''

ایڈیٹر صاحب نے پوری طرح ہار مان لی: ''پھر تو نوٹس واپس لینا ہی پڑے گا۔ چاہے گوتم چندرا کی کمپنیاں ہمیں اشتہار دیں یا نہ دیں۔''

چاچا نے آواز لگائی: ''یہ ہوئی نا آواز'' آزاد' اخبار کے ایڈیٹر کی' اور سب کی تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔

اب ہر شخص ایڈیٹر صاحب سے ہاتھ ملا کر انہیں مبارکباد دے رہا تھا اور وہ مسکرائے جا رہے تھے کہ مبارکباد کا اصل مستحق تو کوئی اور ہی ہے!

○

چاندی سونے کی دیواریں

اپنے ساتھیوں کی مبارکباد لے کر آشا دفتر سے واپس گھر جا رہی تھی۔ بس اسٹینڈ کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اُس نے دیکھا مسافروں سے بھری ہوئی بس اسٹارٹ ہو رہی ہے۔ اُس کے پیچھے بھاگی بھی لیکن بس ایک دفعہ چل پڑے تو پیچھے مڑ کر تھوڑا ہی دیکھتی ہے۔

وہ بس اسٹینڈ پر کھڑی اگلی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد آئے گی کہ آدھے گھنٹے بعد — کہ اُس نے ایک بغیر چھت کی کھلی موٹر میں (جو اتنی معمولی تھی کہ کسی بڑے سیٹھ کی شایان شان نہیں لگتی تھی) گوتم کو آہستہ آہستہ اپنی طرف آتے دیکھا۔

موٹر آ کر اُس کے برابر رُک گئی۔

گوتم نے کہا: ''مس آشا۔ کیا میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں؟ آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔''

آشا نے 'جی نہیں' کہا اور سڑک پر پیدل ہی چل کھڑی ہوئی۔ وہاں کھڑے ہو کر گوتم سے سوال جواب کرنا اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

گوتم نے اپنی موٹر کے انجن کو ٹھہرایا نہیں تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ آشا کے ساتھ ہو لیا۔

موٹر کو ساتھ چلتے دیکھ کر بس اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے لوگ مسکرا رہے تھے۔

کھسیا کر آشا ایک جگہ رُک گئی کہ موٹر آگے نکل جائے گی۔

مگر گوتم نے بریک لگا کر اپنی موٹر بھی وہیں روک دی۔
آشا بولی: ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ بڑے بے شرم ہیں آپ؟''
گوتم نے آشا کی نسوانی عزّت کو للکارا: ''کیا مجھ سے ڈرتی ہیں آپ؟''
''میں دُنیا میں کسی سے نہیں ڈرتی۔'' آشا نے جواب دیا۔ ''اور وہ بھی آپ سے ڈروں گی؟''
''تو پھر آپ کار میں بیٹھ جایئے نا؟ میں آپ کو کھا نہیں جاؤں گا۔''
غصے سے آشا نے کار کا دروازہ کھولا اور 'چلیے' کہہ کر بیٹھ گئی۔
اُسے ثابت کرنا تھا کہ پڑھی لکھی آزاد خیال لڑکی کسی موٹر والے سے نہیں ڈرتی۔
جیسے ہی آشا نے دروازہ بند کیا۔ گوتم نے گاڑی کا رُخ موڑا۔
''ارے۔ ارے۔ یہ کدھر جا رہے ہیں آپ؟'' وہ چلاّئی۔
گوتم نے اطمینان سے موٹر چلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جہاں اطمینان سے آپ سے بات کر سکوں۔''

موٹر تیز رفتاری سے بمبئی شہر کی سڑکوں پر سے ہو کر، مضافات میں سے گذرتی ہوئی جوہو کے ساحل کے کنارے کنارے......
یہاں تک کہ سمندر کے کنارے ایک سنسان مقام دیکھ کر وہاں رُک گئی۔
گوتم دروازہ کھول کر نیچے اُترا، تیز تیز چل کر دوسری طرف آیا۔ دروازہ کھولا۔ پھر آشا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ وہ نیچے آ کر غصے سے بولی ''اب تو بتا سکتے ہیں مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟''
''میں اپنے اور آپ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''
آشا کو اس امیر اور سر پھرے نوجوان پر غصہ آ رہا تھا جو اُسے شہر سے بیس میل دور لے آیا تھا۔ وہ تیزی سے بولی: ''مجھے آپ کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے بارے میں کچھ بات کریں۔ مجھے موٹر میں پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ میں پیدل جا سکتی ہوں۔''
یہ کہہ کر آشا نے چلنا شروع کر دیا۔

مگر گوتم کا لمبا مضبوط ہاتھ بڑھا اور آشا کا بازو پکڑ کر اُسے واپس کھینچ لیا۔ ''آپ نہیں جا سکتیں۔''
اس کھینچا تانی میں وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے کہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔ ایک دوسرے کے گرم گرم سانس کا لمس محسوس کر سکتے تھے
(اور آشا نے من ہی من میں سوچا گوتم کے اتنا قریب آنا مجھے برا نہیں لگا۔ شاید اچھا ہی لگا۔)
پھر بھی آشا نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا: ''یہ کیا زبردستی ہے؟ کہیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''
اب گوتم نے سوال کیا: '' پہلے تو مجھے یہ پوچھنا ہے کہ آپ سے معافی مانگنے کے لیے مجھے کیا کرنا پڑے گا؟''
گوتم اُس کے جواب کے لیے تیار نہیں تھا۔ '' آپ کو پھر سے جنم لینا پڑے گا۔ وہ بھی کسی امیر گھرانے میں نہیں جہاں نوجوان بڑی بڑی موٹروں میں غریب بچّوں کی ٹانگیں کچلتے پھرتے ہیں۔''
''انیل نے مجھے معاف کر دیا ہے'' گوتم نے کہا اور پھر پوچھا۔ '' آپ کیوں نہیں کر سکتیں؟''
''انیل تو بچّہ ہے۔'' آشا نے فوراً جواب دیا '' لیکن میں آپ کی چکنی چپڑی باتوں میں آنے والی نہیں مسٹر گوتم۔''
''ایک بات بتایئے۔ آپ امیروں سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں؟'' امیر ہونا پاپ ہے کیا؟'
آشا نے بڑے زور سے کہا: ہاں، پاپ ہے! اور پھر فرانسیسی مصنف روسو کا مقولہ دوہرایا۔ '' ہر بڑی دولت کے پیچھے کوئی نہ کوئی جرم چھپا رہتا ہے۔''
'' مگر یہ دولت میں نے تو پیدا نہیں کی۔ میرے دادا نے میرے نام چھوڑی ہے۔ مجھے اُن کے گناہوں کی سزا کیوں ملے؟''
آشا کے جواب میں بڑی تلخی تھی بڑا غصہ تھا۔ ''پوتا دادا کی دولت کا وارث بن سکتا ہے تو اُسے اپنے دادا کے اَپرادھوں کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑے گا۔''
اب گوتم تقریباً لاجواب ہو گیا تھا۔ '' شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔'' بولتے بولتے وہ ریت سے نکلی ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔ '' مگر میں سمجھتا ہوں انسانی ہمدردی کے دروازے امیروں کے لیے بھی بند نہیں ہونے چاہییں۔'' پھر اُس نے گفتگو کو ایک ذاتی موڑ دیا۔ '' سچ مانیے گا، آشا جی میں نے آپ جیسی لڑکی زندگی بھر میں نہیں دیکھی۔ اگر ایک بے وفا لڑکی نے زندگی میں دھوکہ نہ

دیا ہوتا تو میں آپ سے کہتا......''

کہتے کہتے وہ رُک گیا۔

''کیا کہتے آپ؟'' آشا نے دلچسپی سے پوچھا۔

''......کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

''دیکھیے، مسٹر گوتم، آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ......'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ ''یہ نہ سمجھیے گا کہ مجھے اکیلے پا کر آپ اس قسم کی باتیں کر سکتے ہیں۔'' مگر گوتم جلدی سے بات کاٹ کر بولا۔

''آشا اتنی جلدی میری قسمت کا فیصلہ نہ سناؤ۔ میں تم سے محبت کی بھیک نہیں مانگ رہا ہوں مگر دوستی کی اُمید تو رکھ سکتا ہوں؟ آشا ہم دوست تو ہو سکتے ہیں نا۔''

اُس کی آواز میں گڑگڑاتی ہوئی لجاجت نہیں تھی۔ ایک ایسی خود اعتمادی تھی جو لڑکیوں کو پسند آتی ہے۔

''ہاں۔ مگر کیسے؟'' آشا نے اقرار بھی کیا اور سوال بھی۔ ''میرے اور آپ کے درمیان تو سونے چاندی کی دیواریں کھڑی ہیں۔!''

گوتم کے جواب میں ایک پیشین گوئی تھی اور نئی زندگی کا اعلان نامہ۔ ''ایک دن یہ دیوار بھی ٹوٹ جائیں گی۔ مجھے صرف وقت چاہیے اور تمھارا بھروسہ۔''

یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ایک مضبوط مردانہ ہاتھ۔ مگر آشا کچھ دیر تک سوچتی رہی کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤں یا نہ بڑھاؤں۔

پھر اُس نے گوتم کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں ایک درخواست تھی اُمید تھی۔ خود اعتمادی تھی، یقین تھا کہ دوسری طرف سے دوستی کا ہاتھ ضرور بڑھے گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔

آشا کا نرم، نازک زنانہ ہاتھ گوتم کے ہاتھ میں آ گیا۔

اور دو ہاتھوں کا ایک دوسرے کو چھونا تھا کہ دونوں کی رگوں کے خون میں شہنائیاں بجنے لگیں۔

اور اب نارنجی سورج نیلے گہرے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔

دور تک پھیلا ہوا ساحل سنسان تھا۔ مگر اُداس نہیں تھا۔ سنگیت کی ایک لے کے مقابلے میں

سمندر کی لہروں کا جل ترنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔

گوتم اپنا باجا بجا رہا تھا۔ جیسا اُس نے کبھی نہیں بجایا تھا۔

وہ جھوم جھوم کر باجا بجا رہا تھا۔ تھرک رہا تھا، ناچ رہا تھا، آشا مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

پاس بیٹھ کر گوتم بولا۔ ''معاف کرنا، آشا۔ جب بھی میں بہت خوش ہوتا ہوں یا بہت دُکھی ہوتا ہوں تو یہ پرانا باجا بجانے لگتا ہوں مگر مجھے صرف یہی ایک دُھن آتی ہے۔''

آشا جیسی تیز لڑکی بھلا فقرہ کسے بغیر کب چُپ رہ سکتی تھی۔ اس وقت آپ بہت خوش ہیں یا بہت دُکھی؟''

جواب میں گوتم نے خوشی سے مگن ہو کر باجا بجانا پھر شروع کر دیا۔

''گوتم!'' آشا نے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا: ''تمھاری آتما تو ایک کلاکار کی آتما ہے۔ تم اتنے امیر گھر میں کیوں پیدا ہو گئے؟''

اس سوال کے جواب میں بھی گوتم باجا بجاتا رہا۔

''لیکن ایسا باجا تو آج کل دکھائی بھی نہیں دیتا۔'' آشا نے کہا۔ ''تمھیں کہاں سے مل گیا۔ ذرا دیکھوں۔''

یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ باجے کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ گوتم پر جیسے دورہ پڑ گیا ہو۔

''اسے ہاتھ مت لگاؤ۔'' وہ چلّایا اور باجے کو آشا سے دور اپنے پیچھے چھپا لیا۔ ''تم بھی اسے چھیننا چاہتی ہو مجھ سے؟'' یہ کہہ کر وہ دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

آشا اُس کا ردِ عمل دیکھ کر بھونچکا سی رہ گئی

''نہیں گوتم'' وہ بولی۔ پھر کھڑے ہو کر گوتم کے قریب آئی اور اُس کے کندھے پر اپنا نرم ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تو صرف دیکھنا چاہتی تھی۔''

اُس کا کندھے پر ہاتھ رکھنا تھا کہ غُصّے کے دورے کا سارا زہر جیسے گوتم کے جسم سے نکل گیا۔

اب اُس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا، آشا؟ میں نے کیا کیا؟''

آشا کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی نفسیاتی دورہ تھا جو گوتم کے اختیار سے باہر تھا۔ اُس نے

ملائمیت سے جواب دیا۔" کچھ نہیں گوتم۔ میں تو صرف یہ باجا دیکھنا چاہ رہی تھی اور تم ایسے چلا پڑے جیسے" وہ کہنا چاہتی تھی" جیسے تمھیں کوئی دورہ پڑا ہو" مگر وہ چُپ ہوگئی۔

اب گوتم نے اُسے بتایا۔" معلوم نہیں کیوں، آشا۔ مگر جب کبھی کوئی یہ باجا مجھ سے لینا چاہتا ہے تو میرا ایسی حال ہوتا ہے۔" اب اُس نے سوال کر ہی دیا۔" کیا میں پاگل ہوں۔؟"

"نہیں گوتم۔" آشا نے دھیرے سے اُسے سمجھایا۔" تم پاگل نہیں ہو۔ صرف ایک گھبرائے ہوئے بچّے کی طرح ہو جس سے زندگی میں نہ جانے کیا کیا چھینا گیا ہے۔" پھر اُس نے سوال کیا۔" کیا تمھیں معلوم ہے تم سے کیا چھینا گیا ہے؟"

" مجھے کچھ معلوم نہیں۔" گوتم نے جواب دیا۔" مجھے کچھ یاد نہیں۔"

اب گوتم کا ہاتھ پکڑے آشا اُسے موٹر کی طرف لے جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

یاد کرو گوتم۔ یاد کرو۔"

سورج ڈوب رہا تھا۔ اُن دونوں کے خاکے اب ڈوبتے سورج کی رنگینی کے سامنے کالے پڑ چکے تھے۔

مگر اُن کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

"یاد کرو، گوتم۔ یاد کرو۔"

" کچھ یاد نہیں آتا۔ آشا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔"

اور آشا گوتم کا ہاتھ پکڑے لے جا رہی تھی جیسے بچّے کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چلنا سکھایا جاتا ہے۔ شاید پچیس برس کے گوتم کو اس سہارے کی ضرورت اور تلاش تھی۔

O

چوکیدار اور چور!

ایک دن گوتم اپنے دفتر میں بیٹھا کچھ کاغذات پڑھ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
فون اُٹھا کر کان کو لگایا تو اپنی ٹیلیفون آپریٹر کی آواز آئی۔
یس لیگی۔
'سر۔ دو آدمی آئے ہیں آپ سے ملنے۔ بھیکو اور سوہن نام بتاتے ہیں۔"
'گوتم نے نام دُہرائے۔ "بھیکو اور سوہن؟" اور پھر پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہیں؟"
"سر وہ کہتے ہیں۔ جیل سے۔"
ایک دم گوتم کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ جیل کے دوستوں کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ "وہ تو ہمارے پُرانے دوست ہیں۔ اُن کو اندر بھیج دو۔ اور اُن کے لیے چائے اور ناشتہ بھجوا دو۔"
دروازہ کھلا تو سوہن اور بھیکو اندر آئے۔ چھوٹے قد کا بھیکو کرتا پاجامہ اور اپنے لمبے بالوں پر گاندھی ٹوپی اوڑھے تھا۔ سوہن جو لمبا تگڑا اور سانولا تھا۔ نیلے رنگ کی سوتی پتلون اور ایک ڈھیلا ڈھالا قمیض پہنے ہوئے تھا۔
جیل میں وہ دونوں کتنے منہ پھٹ اور بے باک ہوا کرتے تھے۔ کتنی بے تکلفی سے اُس سے بات کرتے تھے۔ یہاں کی شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اُن کی گھگی بندھ گئی۔

''سیٹھ صاحب۔ شما کرنا......!''

''اپن تو یونہی سلام کرنے کو آ گیا، حضور......''

دونوں نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور کھڑے ہو گئے۔

گوتم نے کھڑے ہو کر اُن کو پیار بھری ڈانٹ پلائی۔'' یہ سیٹھ صاحب اور حضور کیا لگا رکھی ہے؟ میں تو وہی تمھارا جیل والا ساتھی ہوں گھبراؤ نہیں۔'' پھر اُس نے آواز نیچے کر کے راز کی بات بتا دی۔'' یہ بھی ایک قسم کا جیل خانہ ہی ہے۔''

''جی۔ جیل خانہ؟'' بھیکو نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

اور سوہن بولا۔'' اگر یہ جیل خانہ ہے تو اپن کو ادھر عمر قید کر دو۔ سیٹھ صاحب۔''

''پھر سیٹھ صاحب؟'' گوتم نے اعتراض کیا۔

''سیٹھ بھائی۔ سیٹھ بھائی۔'' بھیکو فوراً جیل والی بے تکلفی پر اُتر آیا۔

''بیٹھو۔ بیٹھو۔'' گوتم نے گدّے دار کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' آرام سے بیٹھو۔''

ابھی سوہن اور بھیکو گدّے دار کرسیوں پر بیٹھ کر اُچھل ہی رہے تھے کہ گوتم نے اُن سے سوال کیا۔

''کہو کیسے ہو تم لوگ؟ کب نکلے؟''

''سیٹھ بھائی۔'' سوہن بولا۔'' میں تو آج ہی نکلا ہوں۔ پر بھیکو ایک ہفتے پہلے آیا۔ اب تک بیچارے کو کوئی کام نہیں ملا۔ نہ کوئی آمدنی ہی ہوئی۔''

بھیکو نے جلدی سے صورت حال کی تفصیل بتا دی۔'' سیٹھ بھائی۔ وہ آپ کا شراپ ہے نا میری انگلیوں پر۔؟ جس کی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں خالی نکلتی ہے...... یا بٹوہ نکلتا تو خالی!''

''میں نے کہا نہیں تھا؟'' گوتم نے مسکرا کر کہا۔'' بولو۔ یہاں کام کرو گے؟''

''سچ؟'' بھیکو کو یقین نہیں آیا کہ اُس نے ٹھیک سنا ہے۔'' سیٹھ بھائی۔ کام کیا کرنا پڑے گا۔؟''

گوتم نے اُسے بتایا۔'' تمھیں تو اپنی فیکٹری میں چوکیدار بنوائے دیتا ہوں۔ وہاں سے جو مزدور نکلتے ہیں اُن کی تلاشی لینی پڑتی ہے۔ تمھارا تجربہ کام آئے گا اور پھر سوہن کی طرف دیکھ

کرے۔'' اور تمھیں میکینک رکھوائے دیتا ہوں۔ کیوں منظور ہے؟''

''بالکل منظور ہے۔'' سوہن اور بھیکو دونوں نے اکٹھے جلدی سے کہا کہ کہیں سیٹھ کی رائے بدل نہ جائے۔

''تو چلو'' گوتم نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے اور کمرے کی دوسری طرف رکھی ہوئی ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اس خوشی میں کچھ کھا پی لو۔''

میز پر سینڈوچ، سموسے، کیک، پیسٹری، مٹھائی وغیرہ پلیٹوں میں رکھی تھیں۔ یہ دیکھ کر بھیکو اور سوہن کے منہ میں پانی تو بھر گیا مگر پہل کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

''بیٹھو بیٹھو۔'' گوتم نے کہا اور وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے مگر کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔

''شروع کرو۔'' گوتم نے کہا۔

پھر یہ دیکھ کر کہ وہ اب بھی تکلف کر رہے ہیں۔ شاید اُس سے ڈر رہے ہیں۔

اُس نے خود سینڈوچ کی ایک پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔''بھئی میں تو انتظار نہیں کر سکتا۔''

یہ کہہ کر اُس نے ایک سینڈوچ منہ میں رکھ لی۔

اب کیا تھا بھیکو اور سوہن بھی کھانے کی پلیٹوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح پل پڑے۔ ایسا لگتا تھا کئی وقت سے کھانا نہیں ملا تھا۔ کیک پیسٹری، سموسہ، سینڈوچ۔ ایک کے بعد ایک چیز حلق سے اُتارنے لگے۔

اور دروازے کے سوراخ میں سے دفتر کے کلرک اور چپرسی آنکھ لگا کر دیکھ رہے تھے کہ اُن کا سیٹھ دو چوروں جیب کتروں کے ساتھ آرام سے بیٹھا ہوا اُن ہی کی طرح گنوار پن سے کھا پی رہا ہے۔ ایک نے تو اپنے سر کی طرف انگلی کا اشارہ بھی کر دیا جیسے کہ وہ اس حرکت کو پاگل پن ہی سمجھتا تھا۔

کھا پی کر گوتم پھر اپنی میز پر واپس آیا۔

گھنٹی بجائی۔

آفس بوائے اندر آیا۔

ایک پرچہ لکھ کر گوتم نے اُس کو دیا اور کہا۔''ہمارے ان دونوں دوستوں کو کیشیئر کے پاس لے جاؤ۔ اُس کو یہ چٹ دینا اور کہنا کہ دونوں کو دو دو سو روپے اڈوانس دے دے اور پھر ان کو

فیکٹری منیجر کے پاس لے جانا۔''

بھیکو اور سوہن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب خواب ہے کہ اصلیت۔ دونوں بھونچکا ہو کر رہ گئے تھے۔ جیل والا 'گوتم سیٹھ' اُن سے باہر آ کر بھی اس طرح ان سے ملے گا، اپنے ساتھ بیٹھا کر اُنھیں کھلائے پلائے گا، اُن کی اتنی آؤ بھگت کرے گا، ان کو نوکری دے گا۔ یہ سب تو انھوں نے سپنے میں بھی سوچا نہیں تھا!

بھیکو اور سوہن چلے گئے تو گوتم نے اپنی خوشی کا اظہار اپنی کُرسی کو لٹو کی طرح گھما کر کیا۔

اُسی وقت مسٹر شرما بھاگے بھاگے اور پریشان حال داخل ہوئے۔

''گوتم بیٹا'' انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔'' میرا مطلب ہے سیٹھ صاحب۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

گوتم نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا۔'' جی کچھ نہیں۔ کُرسی پر بیٹھا ہوں۔''

مگر مسٹر شرما کو اُس کی کسی اور کارروائی پر اعتراض تھا۔'' یہ آپ نے کیشیئر کو کیا لکھ کر بھیجا ہے؟ دو چوروں کو چوکیدار بنانا چاہتے ہو؟''

گوتم کو ایک دم جیل میں موٹے پھول چند کی ملاقات یاد آ گئی جنھوں نے اُس سے کہا تھا کہ'' یہ ڈبل حساب کرنا میں نے تمھارے مسٹر شرما سے ہی سیکھا ہے۔''

سو اُس نے بڑے دھیرے سے جواب دیا مگر ہر لفظ کو چبا چبا کر۔

''چوروں کو چوکیدار بنا رہا ہوں۔ چوکیداروں کو چور تو نہیں بنا رہا ہوں۔ اور یہ کہہ کر اُس نے مسٹر شرما کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح دیکھا کہ وہ بھی سٹ پٹا گئے۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب بھی معلوم ہو جائے گا۔'' گوتم نے اطمینان سے کُرسی پر لیٹتے ہوئے کہا۔'' اچھا ہوا آپ آ گئے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرس کی ایک میٹنگ بلائی ہے۔''

یہ سن کر مسٹر شرما کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کل کا چھوکرا جو کل تک ڈائریکٹرس کی میٹنگ میں سوتا رہتا تھا آج اس سے کہہ رہا ہے کہ میٹنگ بلائی ہے! انھوں نے ٹالنے کی پرانی ترکیب نکالی۔'' اس کا تو دو ہفتے کا نوٹس دینا پڑے گا۔''

'تو دے دیجیے' گوتم نے بڑی صفائی سے کہا۔

مسٹر شرما نے کمپنیوں کے قانون کے بارے میں گوتم کے انجانے پن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مگر ایجنڈا کیا ہوگا؟''

مگر گوتم اس سوال کے لیے تیار تھا۔ ''کہیے کہ چندرا انٹر پرائزز کے نئے انتظام کے لیے کچھ فیصلے کرنے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ یہاں تک کہ مسٹر شرما باہر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد دروازہ بند ہوگیا۔ تب ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اُبھر آئی۔

ادھر اپنے کمرے میں مسٹر شرما سوچ رہے تھے کہ ایسی باتیں جیل جانے سے پہلے تو کبھی گوتم نے نہیں کی تھیں۔ وہاں اُسے کسی نے کیا کچھ سکھا پڑھا دیا تھا؟

اس رات کو چندرا ولا کے شاندار ڈرائنگ روم میں میز کے دو کناروں پر بیٹھے ہوئے گوتم اور اُس کی پھوپی رادھا بائی خاموشی سے ڈنر ختم کر رہے تھے۔ مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جس میں صرف پلیٹیں اُٹھانے اور رکھنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''گوتم بات کیا ہے؟ آخر کار رادھا بائی نے خاموشی کے تالاب میں ایک پتھر پھینکا۔ ''اُس ایکسیڈینٹ کے بعد سے تم بالکل ہی بدل گئے ہو۔ اب تم کسی ہوٹل یا پارٹیوں میں بھی نہیں جاتے۔ سُنا ہے مایا سے بھی نہیں ملتے۔ وہ تمھیں بہت یاد کرتی ہے۔''

''مگر میں اُسے بالکل یاد نہیں کرتا۔'' گوتم نے دانت بھینچ کر جواب دیا۔ ''اس لیے کوئی اور بات کیجیے۔''

''اور کیا بات کروں؟'' اُس کی آنٹی نے پوچھا۔

''مجھے کچھ میرے بچپن کے بارے میں بتایئے۔'' گوتم نے کہا۔ ''میرے پتا جی ماتا جی کے بارے میں۔''

رادھا بائی کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے وہ بولیں۔ ''یہ ایک دم سے اُن کی یاد تمھیں کیسے آگئی۔ پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا؟''

''آنٹی'' گوتم بولا۔ ''ہر آدمی کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ جاننا چاہتا ہے،

میں کون ہوں، میں کیا ہوں۔ مجھے اس دُنیا میں کون لایا اور کیوں لایا؟'' اور یہ کہہ کر اُس نے بات کو زور دینے کے لیے ایک چھُری کو اُٹھا کر اور میز پر مار کر گاڑ دیا۔

رادھا بائی نے کہا۔''یہ کافی نہیں کہ تم سراُتّم چندر کے پوتے ہو؟''

اُن کا خیال تھا کہ دادا کا نام آتے ہی گوتم لاجواب ہو جائے گا مگر گوتم نے بڑا زور دے کر کہا۔''نہیں یہ کافی نہیں ہے بچپن سے آج تک یہی سنتا آیا ہوں کہ سراُتّم چندر لکھ پتی تھے، کروڑ پتی تھے، بل مالک تھے، بڑے آدمی تھے لیکن کوئی مجھے میرے پتا جی کے بارے میں نہیں بتاتا۔''

''اچھا میں بتاتی ہوں۔'' رادھا بائی نے آنکھوں سے فرضی آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے پتا جی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ دل کے دورے سے جب اُن کا دیہانت ہو گیا تو پتا جی کا دل بھی بیٹھ گیا اور اُس کے تھوڑے دن بعد اُن کا بھی ہارٹ فیل ہو گیا۔''

گوتم جہاں بیٹھا تھا وہاں سے وہ اپنے دادا کی ایک تصویر سامنے کی دیوار پر دیکھ سکتا تھا۔ دوسری بڑی تصویر اُس کے برابر سائڈ بورڈ کے اوپر لگی تھی۔'' سارے گھر میں صرف دادا جی کی تصویریں ہیں مگر پتا جی کی ایک بھی نہیں کیوں؟'' یہ سوال برسوں سے اُس کے دماغ میں کُلبُلا رہا تھا۔ آج نکل ہی پڑا۔''سارے گھر میں صرف دادا جی کی تصویریں ہیں مگر پتا جی کی ایک بھی نہیں، کیوں''

''تمھارے دادا۔ میرے پتا جی۔ اپنے جواں مرگ بیٹے کی کوئی نشانی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے سب تصویریں ہٹا دی گئی تھیں۔

ایک دوسرا سوال تھا۔ وہ بھی آج گوتم نے کر ہی ڈالا۔''اور میری ماں کا کیا ہوا؟''

''پتی کے دیہانت کے بعد وہ بھی چل بسیں۔''

''وہ کیسے مریں۔ ہارٹ اٹیک سے؟''

''سنو گوتم'' رادھا بائی نے اپنے بھتیجے کو سمجھایا۔''پُرانے زخم کریدنے سے کیا فائدہ؟ ہم نے تمھیں ان سب باتوں سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔''

اب گوتم کی آنکھوں میں بے چینی کی ایک نئی چمک تھی۔ اُس کی آواز میں ایک نیا عزم، نئی طاقت تھی۔''لیکن اب میں بچہ نہیں ہوں۔ اب میں بھیانک سچائیوں کا سامنا کر سکتا ہوں۔ بتایے۔ میری ماں کو کیا ہوا تھا؟''

''جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو۔'' رادھا بائی کی آنکھیں بھی غصے سے اور شاید نفرت سے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ تمھاری ماں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے کپڑوں پر پٹرول چھڑکا اور اُس میں آگ لگا دی۔

''مگر کیوں؟'' گوتم نے چھری کی نوک کو پھر میز پر مار کر بڑے زور سے کہا۔

''کیا......وہ پاگل — ہو گئی — تھیں؟''

رادھا بائی کا جواب تھا'' وہ پاگل ہو نہیں گئی تھی۔'' اور پھر ایک لمحے کے وقفے کے بعد اُن کی آواز گونجی۔'' وہ پاگل تھی!''

گوتم کے ہاتھ سے چھری پلیٹ کے اوپر گر پڑی۔

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

اور اُس کی زبان سے ایک سوال نکلا جو وہ کسی دوسرے سے نہیں خود اپنے آپ سے کر رہا تھا۔

''کیا — کیا؟ — میں بھی اپنی ماں کی طرح پاگل ہوں؟''

''ڈیڈی!'' انیل نے دودھ اور دلیے کا پیالہ اپنے منہ سے پرے ہٹاتے ہوئے دکھی آواز بنا کر کہا۔'' ڈیڈی! میں اور نہیں کھاؤں گا۔ نہیں کھاؤں گا۔''

آشا نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔'' انیل۔ دلیہ کھانے سے تمھارے بدن میں طاقت آئے گی۔ تھوڑا سا تو اور کھا لو......بچّوں کو تو بہت بھوک لگتی ہے۔''

''بھوک کیسے لگے گی؟'' انیل نے بسورتا ہوا منہ بنا کر کہا۔'' سارا دن تو میں لیٹا رہتا ہوں۔'' اور پھر اُس نے اصل شکایت کی۔'' ڈاکٹر صاحب۔ کب یہ پلاسٹر اُتاریں گے؟''

''انیل۔ تمھیں معلوم ہے۔ ابھی پندرہ دن باقی ہیں۔'' آشا نے پلاسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے اوپر پندرہ دن آگے کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔

''پر ڈیڈی۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں — تنگ آ گیا ہوں۔'' اور پھر انیل نے اپنا غصہ پلاسٹر پر گھونسے برسا کر اُتارا۔

اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے آشا بولی۔'' انیل، کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ تم تو اتنے بہادر ہوا

کرتے تھے؟ ہمیشہ ہنستے رہتے تھے؟ اب کیا ہوا؟''

جواب میں انیل نے بہ ظاہر ایک غیر متعلق سوال کیا۔ مگر آشا سمجھ گئی کہ انیل کا موڈ خراب ہونے کی اصل وجہ کیا ہے۔ اُس نے پوچھا۔

''اب گوتم بھیا کیوں نہیں آتے؟۔۔ میں روز اُن کا انتظار کرتا ہوں کیا آپ نے اُن کو منع کر دیا ہے؟''

آشا کے پاس اس سیدھے سوال کا سیدھا جواب نہیں تھا۔ سو اُس نے بھی ایک الگ ہی سوال کر دیا۔ ''تم اُنہیں بہت یاد کرتے ہو؟''

''ہاں دیدی۔'' انیل سب کچھ بھلا کر بڑے جوش سے بول رہا تھا۔ ''جب گوتم بھیا آتے تھے تو بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ کبھی گانا سناتے تھے، کبھی لطیفے، کبھی کہانیاں۔۔۔ وہ مجھے بہت ہنساتے تھے دیدی۔''

آشا نے حیرت سے انیل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''انیل تمھارا کتنا بڑا دل ہے! تُم نے سچ مچ اُن کو معاف کر دیا؟'

''اس میں معاف کرنے کی کیا بات ہے، دیدی؟'' بچّے نے بڑی دور کی بات کی۔ ''ایسے ایکسیڈینٹ تو روز ہوتے رہتے ہیں۔''

آشا یہ سن کر حیران رہ گئی۔ ''تم مجھ سے زیادہ سمجھدار ہو، انیل؟'' اور پھر دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے بولی۔ ''کل تمھارے گوتم بھیا تم سے ملنے آئیں گے۔

اگلے دن آشا نے گوتم کو 'آزاد اخبار کے دفتر سے فون کیا۔

'ہیلو!' گوتم کی آواز آئی۔

''ہیلو! آشا نے کہا۔

''آشا؟'' گوتم نے آواز پہچان کر کہا۔

وہ اس وقت گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا مگر پھر بھی مسکرا رہا تھا!

اس فون سے دو چار منٹ پہلے اُس کا جیل والا ساتھی بھیکو (جس کو اُس نے اپنی مل میں چوکیدار بنوا دیا تھا) اُس سے ملنے آیا تھا۔

''سیٹھ بھائی'' اُس نے کہا تھا۔ ''آپ کی مل میں تو بڑا گول مال ہوتا ہے۔''

اور جب اُس نے پوچھا تھا۔''کیسا گول مال''تو بھیکو نے اُسے بتایا تھا۔روز رات کو ایک ٹرک کپڑے سے بھر کر چور دروازے سے باہر جاتا ہے۔ پہلے دن ہی میں نے روکا تو دوسرا چوکیدار ہے نا وہ کہنے لگا۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے مالکوں کے حکم سے ہوتا ہے۔اگر تم اپنی نوکری رکھنا چاہتے ہو تو چپ چاپ رہو اور اگلے دن مجھے پانچ روپے دے کر کہا۔ یہ بات گوتم سیٹھ سے نہ کہنا۔ بھلے نوکری انھوں نے دی ہو مگر حکم یہاں صرف مسٹر شرما کا چلتا ہے!

''شاباش بھیکو۔''گوتم نے کہا تھا۔''اب تم جاؤ۔مگر آنکھیں کھلی رکھو اور جو دیکھو لکھتے رہو۔ اور پھر مجھے بتاؤ۔''

اس بات کو سن کر وہ گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔مگر جاتے جاتے بھیکو نے ہاتھ کی صفائی سے ایک رنگین پنسل اُس کی میز سے اُڑا لی تھی اور جب گوتم نے اُس کی چوری پکڑ لی تو جواز پیش کیا تھا۔ لکھنے کے لیے سیٹھ بھائی، لکھنے کے لیے۔آپ ہی نے تو کہا ہے لکھتے رہو' اور یاد کر کے گوتم اب تک مسکرا رہا تھا۔

فون پر اُس کو آشا کی آواز سنائی دی تو وہ کھل اُٹھا۔خصوصاً جب آشا نے کہا۔''انیل آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔''

''تو مجھے اجازت ہے اُس سے ملنے کی۔؟''گوتم نے پوچھا۔

جواب میں آشا کی ہلکی سی شرمندہ سی آواز آئی۔''یہ کہہ کر آپ مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔آپ ضرور اس سے ملیے گا۔''

''اور اُسے تازہ ہوا کھلانے اپنی موٹر میں لے جاؤں؟''

''ضرور لے جایئے۔''آشا نے کہا اور ساتھ میں تنبیہ بھی کر دی۔''مگر گاڑی ذرا دیکھ کر چلایئے گا۔''

''دیکھ کر ہی چلاؤں گا۔''گوتم نے یقین دلایا۔''مگر انیل کی حفاظت کے لیے اُس کی بہن کو بھی ساتھ جانا پڑے گا۔''

''اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔''آشا نے جواب دیا مگر اُس کے چہرے پر ایک شرمیلی سی خوشی اُس کے من کی چغلی کھا رہی تھی!

○

میرا بیٹا میرا دشمن ہے

وہی گوتم کی چھوٹی کھلی چھت کی ہرے رنگ کی کار تھی جس میں وہ آشا کو 'بھگا' کر سمندر کے کنارے لے گیا تھا اُسی سمندر کے کنارے پھر آ رہی تھی مگر وقت بدل گیا تھا اور کار میں بیٹھے ہوئے تینوں کا موڈ بدل گیا تھا۔

آج گوتم شرمندہ اور پشیمان نہیں تھا۔

آج آشا غصے میں بھری ہوئی نہیں تھی۔

''آج انیل روکھا اور غمگین نہیں تھا۔

تینوں خوش تھے۔ تینوں ہنس رہے تھے۔

پھیلا ہوا ساحل تھا۔ ریت کا لمبا چوڑا میدان اور اُس پر گوتم اپنی کار سے لہریئے بنا رہا تھا۔ پھر گول گول چکر لے رہا تھا۔ نرم ریت پر موٹر کے ٹائروں کے بڑے بڑے دائرے بنتے جا رہے تھے۔

اور یہ دیکھ کر انیل ہنس رہا تھا۔

انیل کو ہنستے دیکھ کر آشا ہنس رہی تھی۔

اور آشا کو ہنستے دیکھ کر گوتم ہنس رہا تھا۔

آخر کار موٹر روک کر گوتم نے دروازہ کھولا اور اُترتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی آیا۔ انیل کے

لیے آئس کریم لے آؤں۔"

پھر وہ لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا اُدھر چلا جدھر آئس کریم، قلفی مسالے والی چاٹ والے اپنے خوانچے لیے کھڑے تھے۔

گوتم کو جاتے دیکھ کر آشا نے اپنے بھائی سے پوچھا۔ "کیوں انیل اچھا لگ رہا ہے نا؟"

"ہاں، دیدی۔ بہت مزہ آرہا ہے۔ گھر بیٹھے بیٹھے تو میں تنگ آ گیا تھا۔" پھر سمندر کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے "دیدی من کرتا ہے کہ میں بھی جا کے سمندر میں تیروں۔"

آشا نے اُس کو تسلی دی۔ "انیل تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ جب پلاسٹر اُتر جائے گا تو ضرور تیرنا۔"

اتنے میں گوتم آئس کریم ہاتھ میں لیے واپس آ گیا" لے بھئی انیل تیرے لیے میں یہ اسپیشل آئس کریم لایا ہوں۔"

"تھینک یو گوتم بھیا" اور پھر اپنی بہن کی طرف دیکھ کر "دیدی اب آپ لوگ میرے لیے کچھ سیپیاں تو اکٹھی کر دیجیے۔"

'اور تم یہاں اکیلے رہو گے؟"

"کیا ہوا؟ میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں۔"

گوتم نے ہنس کر کہا" تو چلو آشا۔ ہم بچے بن کر انیل کے لیے سیپیاں ڈھونڈیں۔

جب دو آدمی ایک ہی ساحل پر سیپیاں تلاش کر رہے ہوں......

تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں دونوں کی نگاہیں ایک ہی سیپی یا سیپیوں کے ایک ہی ڈھیر پر پڑیں۔

دو ہاتھ جب سیپیوں کو اُٹھانے کے لیے ایک ساتھ بڑھتے ہیں تو دونوں کو ساتھ جھکنا پڑتا ہے اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھولے سے یا جان بوجھ کر......دونوں ہاتھ ایک دوسرے کو چھو لیں۔

اور ان دو ہاتھوں میں اگر ایک لڑکے کا ہاتھ ہے اور ایک لڑکی کا۔ جو دونوں ایک دوسرے کو پیار کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ اس کا اعلان ابھی کسی ایک نے بھی نہیں کیا ہے۔ خصوصاً لڑکی نے تو

ابھی تک رومانی دلچسپی کا اظہار بھی نہیں کیا ہے۔ تو یہ پہلا لمس۔ ایک ہاتھ کا دوسرے کو چھو لینا ایک حادثہ ہو سکتا ہے۔ ایک بجلی کی کرنٹ جو ایک جسم سے دوسرے جسم میں دوڑ جاتا ہے۔ مگر AC کرنٹ کی طرح یہ جھٹکا دے کر اُن دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر دیتا بلکہ DC کرنٹ کی طرح سے ایک کو دوسرے کی طرف کھینچتا ہے۔

کبھی کبھی اس مقناطیسی کرنٹ کا اثر ایک شاعرانہ اور رومانی طبیعت پر یہ بھی ہوتا ہے کہ دل کے اندر کے جذبات کسی گیت کے سہارے زبان پر آ جاتے ہیں اور اظہار حال کا موقع مل جاتا ہے۔ گوتم نے پہلے گنگنانا شروع کیا۔ پھر اُس کی زبان سے الفاظ نکلے

''دل نے تڑپ تڑپ کے تڑپنا سکھا دیا
انعام اب ملے کہ سزا سر جھکا دیا''

جب اُس نے دیکھا کہ آشا یہ سن کر دور نہیں بھاگ گئی تو اُس نے آشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گایا۔

''دیوانہ کر کے چھوڑ دے جو اک زمانے کو
مجھ کو اسی نگاہ نے انساں بنا دیا''

یہ صرف رومانی جذبات کا اظہار نہیں تھا، ایک نفسیاتی ردعمل کا بیان بھی تھا۔

''بس اتنا جانتا ہوں مجھے تم سے پیار ہے
اور پیار میں نہ جیت کسی کی نہ ہار ہے
اس کے سوا جو یاد تھا سب کچھ بھلا دیا''

اب وہ سمندر کے کنارے نکلی ہوئی چٹانوں کے پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے اور گوتم نے گانا ختم کرتے کرتے اپنی جیب سے باجا نکال لیا تھا اور بڑی نرمی سے آشا نے وہ باجا اُس کے ہاتھ سے لے لیا تھا گانا ختم ہوا تو آشا نے کہا: ''گوتم تم تو بہت اچھا گاتے ہو۔''

''گانا رونا تو سب کو آتا ہے۔'' گوتم نے کہا اور تب ہی اُس نے دیکھا کہ آشا اُس کا باجا منہ کو لگائے ہوئے بجا رہی ہے۔ ''مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنا اچھا بجاتی ہو۔''

اب آشا نے باجا منہ سے نکال کر کہا۔ ''گوتم۔ دیکھو۔ آج میں نے یہ باجا تمھارے ہاتھوں

سے لے لیا اور تمھیں ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔''

''یہ تو سچ ہے۔ کیوں غصہ نہیں آیا، آشا''

''اس لیے کہ یہ باجا میں نے تم سے چھینا نہیں ہے۔ تمھاری مرضی سے لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمھیں مجھ پر بھروسہ ہے اور۔۔۔''

''اور؟'' گوتم نے بیتابی سے سوال کیا۔

آشا نے بڑے پیارے انداز میں مسکرا کر اپنا جملہ پورا کیا' ......اور تم پاگل بالکل نہیں ہو!''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم'' گوتم نے کہا۔ ''مگر جانتی ہو اس دُنیا میں سب سے عقلمند، سب سے سندر، سب سے پیاری لڑکی کون ہے؟''

اب آشا نے بھولی بن کر سوال کیا: ''کون ہے؟''

'وہ تم ہو آشا۔''

آشا نے شرارت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اب تم سچ مچ پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگے ہو۔'' پھر کھڑے ہو کر ''چلو انیل ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔''

اُسی وقت چندراولا کے شاندار ڈرائنگ روم میں رادھابائی بیٹھی ہوئی مسٹر شرما اور کمپنی کے دو ڈائریکٹروں سے بات کر رہی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کا تھا اور سگار پی رہا تھا، دوسرا داڑھی والا نوجوان تھا۔

رادھابائی کہہ رہی تھیں: ''اس وقت گوتم باہر گیا ہوا ہے۔ ہم لوگ آرام سے باتیں کر سکتے ہیں۔''

''میں کہتا ہوں۔'' مسٹر شرما بولے۔ ''اگر ہم نے اس بیوقوف گوتم کے پاگل پن کا توڑ نہیں سوچا تو ایک دن یہ ہمیں پاگل بنا کر چھوڑے گا۔''

سگار پینے والے نے کہا: ''مگر مسٹر شرما ہمیں ڈائریکٹرس کی میٹنگ کا تو انتظار کرنا چاہیے۔''

داڑھی والے نے ہاں میں ہاں ملائی: ''ہاں دیکھیں تو سہی یہ کمپنی کا نیا انتظام کس ڈھنگ سے کرنا چاہتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں وہ یہ نیا انتظام کس ڈھنگ سے کرنا چاہتا ہے؟

مسٹر شرما بولے۔

سگاروالا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''آپ جانتے ہیں؟''

داڑھی والے نے پوچھا۔ ''کیا کرنا چاہتا ہے وہ؟''

''تو سنیے۔'' مسٹر شرما بولے۔ ''جو پاگل پن اُس کے باپ کو تھا وہی بیٹے کو ہوتا جا رہا ہے۔''

یہ سن کر دونوں ڈائریکٹرس بھونچکا رہ گئے۔ ایک نے ''اوہ مائی گارڈ'' کہہ کر بھگوان کو انگریزی میں یاد کیا۔ دوسرے نے کہا۔ ''یہ تو خطرناک بات ہے۔''

اور رادھا بائی نے اپنا سر پکڑ کر سوال کیا جو فریاد بھی تھی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کمبخت کو کوڑے کے ڈھیر میں سے نکال کر وارث بنانے کی کیا ضرورت تھی؟''

مسٹر شرما نے اُن کو یاد دلایا۔ ''اس لیے کہ اُس زمانے میں ہندو کوڈ بل پاس نہیں ہوا تھا۔ بیٹیاں اپنے باپ کی جائیداد کی وارث نہیں ہو سکتی تھیں۔ اگر ہم نے گوتم کو وارث نہ بنایا ہوتا تو یہ ساری بزنس ختم ہو گئی ہوتی۔''

''ہاں ٹھیک ہے اب یاد آ گیا۔'' رادھا بائی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ ''مگر مسٹر شرما، آج کل گوتم بڑے ٹیڑھے سیدھے سوال کر رہا ہے اپنے ماں باپ کے بارے میں۔''

داڑھی والے نے فوراً اپنی رائے پیش کی۔ ''ضرور اُس کو کوئی بڑا چالاک آدمی پٹی پڑھا رہا ہے۔''

''آدمی نہیں عورت۔'' مسٹر شرما نے زور دے کر کہا۔ ''یہ سب باتیں اُس جرنلسٹ چھوکری آشا کے دماغ سے نکلی ہیں۔''

رادھا بائی نے اعتراض کیا: ''مگر اس معاملے میں چھان بین کرنے سے اُسے کیا ملے گا۔''

اور مسٹر شرما نے بہ ظاہر بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''یہی کوئی پچاس ساٹھ لاکھ روپے۔'' مگر اُن کے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اُن کی آنکھوں میں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

اور واقعی رات کو دفتر میں بیٹھی اخبار کے پرانے موٹے موٹے فائلوں میں آشا اس معاملے کی چھان بین کر رہی تھی۔

اُس کا خیال تھا کہ گوتم کے دادا اتنے مالدار اور مشہور آدمی تھے کہ اُن کے اور اُن کے بیٹے کے بارے میں کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہا ہوگا۔ شاید کھوج کرنے سے گوتم کے بچپن کے بارے میں کوئی روشنی پڑ سکے اور اُسے یقین تھا کہ گوتم کی نفسیاتی اُلجھن کی کنجی اُس کے بچپن ہی میں ملے گی۔

یکا یک پرانے اخباروں میں اُسے کچھ نظر آیا جس کو پڑھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور اُس نے جلدی جلدی ورق اُلٹ کر اُس خبر کا باقی حصہ بھی پڑھ لیا اور اپنے پیڈ پر کچھ تفصیلات نوٹ کر لیں۔

گوتم اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ٹیلیفون اُٹھایا۔

اُس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی باہر کے کمرے میں بھی بجی۔ وہاں رادھا بائی نے ٹیلی فون اُٹھایا۔ اب گوتم جس سے بھی بات کرے گا وہ سب رادھا بائی سن سکیں گی۔

''ہیلو'' گوتم نے کافی ڈانٹ کر کہا۔ جیسے اُسے یقین ہو کہ اس وقت پھر مایا کا فون ہی آیا ہوگا۔

آشا کی آواز کان میں آئی تو وہ سٹ پٹا گیا۔ ''اوہ آشا؟'' اُس نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ''میں تو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ کہو کیا کر رہی ہو؟''

آشا اس وقت اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ''گوتم، مجھے تمھارے پتا جی کے بارے میں بہت ہی عجیب بات معلوم ہوئی ہے تم ابھی مل سکتے ہو؟ اسی وقت؟''

گوتم تو ہر وقت ہر جگہ آشا سے ملنے کو تیار رہتا تھا۔ مگر اُسے تعجب ہوا جب آشا نے ایک چھوٹے سے ریستوران کا نام لیا اور کہا: ''سنو ٹیکسی میں آنا۔ تمھاری گاڑیاں پہچانی جاتی ہیں۔''

گوتم جلدی سے فون رکھ کر باہر نکل گیا۔

اور باہر کے کمرے میں اُس نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک اندھیرے کونے میں اُس کی پھوپی بیٹھی ہے اور اُس کے پاس ٹیلی فون رکھا ہے۔

جب گوتم گذر گیا اور باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو رادھا بائی نے ٹیلی فون کا ڈائل گھمایا اور نمبر ملایا اور کہا:

''ہیلو مسٹر شرما؟''

مسٹر شرما کی شاندار موٹر میرین ڈرائیو پر تیز چلتی ہوئی آئی اور موڑ پر آہستہ ہو کر سنگم

ریستوران کے پاس آکر ٹھہر گئی۔
شرما نے جیب سے چھوٹی سی دوربین نکالی (جو تھیٹر دیکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے) اور اُس کو آنکھوں سے لگا کر اُس کی پھِرکی گھمائی۔
ریستوران کے دروازے میں سے ایک میز پر دو آدمی بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ دوربین کی پھرکی گھماتے ہی وہ قریب آتے معلوم ہوئے۔ اُن کے چہرے قریب آگئے مگر اُن کی آوازیں دور ہی رہیں۔
آشا اور گوتم شاید ابھی آئے تھے کیوں کہ ویٹر ایک کافی کی پیالی اور ایک اورنج کا گلاس میز پر رکھ کر پوچھ رہا تھا: ''اور کچھ چاہیے صاحب؟''
کچھ نہیں: گوتم نے کہا۔
ویٹر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔
ریستوران بند ہونے کے قریب تھا۔ میزوں پر، کرسیوں پر، کرسیاں رکھ کر مینار بنا دیے گئے تھے۔ بس ایک ہی سوتا سوتا ویٹر کام کرنے کے لیے رہ گیا تھا۔ وہ بھی اب کاؤنٹر پر جا کر اونگھ رہا تھا۔ باقی سب سنسان اور خاموش تھے۔
گوتم نے یہ اطمینان کر کے کہ کوئی اُن کی باتیں نہیں سن رہا ہے۔ آشا سے کہا۔ ''بتاؤ، آشا۔ تمھیں کیا معلوم ہوا ہے؟''
''پہلے تم بتاؤ۔ تمھیں معلوم ہے تمھارے پتا جی دیہانت سے پہلے کیا کرتے تھے؟''
گوتم نے کہا: ''ایک بار آنٹی سے پوچھا تھا تو انھوں نے کہا تھا وہی کرتے تھے جو کروڑ پتی باپ کے بیٹے کیا کرتے ہیں۔''
''لیکن یہ سچ نہیں ہے۔'' آشا نے زور دے کر کہا۔ ''گوتم تمھارے پتا جی تو وہ کر رہے تھے جو کروڑ پتی باپ کے بیٹے کبھی نہیں کیا کرتے۔''
''تو وہ کیا کرتے تھے؟'' وہ اپنے باپ کی زندگی کا بھید جاننے کے لیے کافی کی پیالی بالکل بھول گیا جو اس کے سامنے رکھی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔
آشا نے اسے بتایا اور سن کر گوتم کو ایسا لگا جیسے اُس کی زندگی پھر سے شروع ہو رہی ہو۔

جیسے وہ دولت کی قید سے آخر کار آزاد ہو گیا ہو۔ آشا کہہ رہی تھی۔ ’’سن بیالیس میں وہ آزادی کے آندولن میں جیل گئے اس پر تمھارے دادا سر اُتم چندر آپے سے باہر ہو گئے۔ انھوں نے اپنے اکلوتے اور بن ماں کے بیٹے کو اپنی جائیداد سے بے دخل کر دیا......‘‘

’’پھر کیا ہوا؟‘‘ گوتم نے بے چینی سے پوچھا۔

’جب تمھارے پتا جی چار برس بعد جیل سے نکلے اور انہیں یہ معلوم پڑا تو انھوں نے اپنا نام اشوک چندر سے اشوک بھارتی رکھ لیا تا کہ اپنے باپ سے اُن کا کوئی رشتہ نہ رہے......‘‘

گوتم کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ’’مجھے تو یہ سب ایک کہانی معلوم ہوتی ہے۔‘‘

آشا نے کہانی جاری رکھی۔ ’’تمھارے پتا نے ایک ہریجن لڑکی سے جو اُن کے ساتھ ستیہ گرہ میں شریک تھی بیاہ کر لیا۔ تم اُسی شادی کی اولاد ہو۔‘‘

’’یہ سب تمھیں کیسے معلوم ہوا؟‘‘

’’اخباروں کی پرانی فائلوں میں ڈھونڈنے سے بہت کچھ مل جاتا ہے۔‘‘

’’پھر کیا ہوا؟‘‘

’’جب اُن کا دیہانت ہوا، تمھارے پتا مزدوروں کے انقلابی لیڈر تھے۔ سن باون میں تمھارے دادا جی کے مل میں اسٹرائیک ہوئی۔ مالک کے حکم سے اُس کے آدمیوں نے باہر سے مزدوروں کو لا کر اسٹرائیک کو توڑنا چاہا۔ وہ ٹرکوں میں بھر بھر کے لوگوں کو لا رہے تھے۔ تمھارے پتا نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہم مل کے گیٹ کے سامنے سڑک پر لیٹ جائیں گے مگر ٹرکوں کو اندر نہ جانے دیں گے۔‘‘ یہ کہہ کر آشا رک گئی۔

نہ جانے کیوں گوتم کو احساس ہوا کہ اب کوئی بھیانک بات ہونے والی ہے۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے پوچھا۔ ’’پھر کیا ہوا؟‘‘

’’مل کے منیجر نے تمھارے دادا جی کو فون کیا کہ مزدور سڑک پر لیٹے ہیں ٹرکوں کو اندر جانے نہیں دیتے آپ کا حکم چاہیے۔‘‘

’’انھوں نے کیا حکم دیا؟‘‘

’’انھوں نے کہا کہ ٹرکیں اندر جانی چاہییں۔ چاہے کوئی بھی راستے میں لیٹا ہو۔‘‘

آشا پھر خاموش ہوگئی لیکن اس خاموشی میں گوتم کو ایسا لگا جیسے ٹرکوں کے انجنوں کی بھیانک گھڑگھڑاہٹ پھر سنائی دے رہی ہے۔ اُن کے بھاری پہیوں کے چلنے کی آواز۔ راستے کی کوئی رکاوٹ......انجنوں کی خونخوار گھڑگھڑاہٹ پر بھاری پہیوں کے نیچے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز۔ انسانی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز......

آشا کہہ رہی تھی۔ ایک تھکی ہوئی، مری ہوئی آواز میں: ''دو آدمی ٹرکوں کے نیچے آکر مارے گئے اور اُن میں سے ایک......''

پھر وہ جھک کر رُک گئی۔ آگے اُس سے نہ کہا گیا۔

مگر گوتم نے اُس کا جملہ پورا کردیا۔

''...........میرے چاچی تھے!''

آشا نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔

چند لمحوں تک مکمل خاموشی چھائی رہی۔ دور کہیں ریل کا انجن سیٹی بجا رہا تھا۔

گوتم خاموش تھا۔ اُسے اپنی دُنیا، اپنی ساری زندگی، اوپر نیچے ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ کیا سچ ہے؟ کیا جھوٹ ہے؟ کیا اچھا ہے؟ کیا برا ہے؟ اُس کی زندگی کی ساری قدریں اُلٹ پلٹ ہوگئی تھیں۔ آج زندگی موت نظر آرہی تھی اور موت زندگی! مگر اُس اُلٹ پلٹ ہوتی ہوئی دُنیا میں ایک ہی صورت اپنی جگہ بنا پائی۔ وہ تھی آشا!

''آشا!'' گوتم نے کہا۔ ''کیا ایسا ہوتا ہے؟ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک باپ اپنی دولت اور پوزیشن کی خاطر اپنے بیٹے کی جان لے لے؟''

''کہا جاتا ہے کہ سراُتم چندر کو نہیں معلوم تھا کہ سڑک پر لیٹنے والوں میں اُن کا اپنا بیٹا تھا ہے۔'' اور پھر آشا نے دانت کچکچا کر کہا: ''مگر جو لیٹے تھے اُن میں سے ہر ایک کسی باپ کا بیٹا تھا۔''

پھر اُس نے بات جاری رکھی۔ ''کہتے ہیں کہ بیٹے کی موت نے اُن کے دل کو ایسا جھٹکا دیا کہ دو مہینے بعد وہ ہارٹ اٹیک سے چل بسے مگر مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی ساری جائیداد اپنے پوتے یعنی تمھارے نام لکھ دی۔''

اب گوتم بولا: ''مگر میری ماں کا کیا ہوا؟''

''ان کے بارے میں اخباروں میں کچھ نہیں ملا۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ گوتم سوچ رہا تھا۔ اپنے دادا کے بارے میں اپنے باپ کے بارے میں۔ اپنی ماں کے بارے میں اور خود اپنے بارے میں!

پھر آشا نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا: گوتم! کتنے مہان تھے تمھارے پتا جی۔ اپنے آدرش اور اصولوں کے لیے جان دے دی۔

گوتم نے سر اُٹھا کر آشا کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ابھیمان بھی تھا اور دکھ بھی بھرا تھا۔ ''آشا'' اُس نے کہا۔ ''آج میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا ہے۔ مگر ڈر کے مارے دل بھی دھڑک رہا ہے۔ اتنے بڑے آدمی کا بیٹا ہونا بڑی ذمہ داری ہے۔''

اتنے میں بجلی کوندی مگر بادلوں کی گرج نہیں سنائی دی۔

یہ بادلوں والی بجلی نہیں تھی۔ یہ کیمرے کی فلیش گن کا فلیش تھا جس نے ایک لمحے کے لیے اُن کی آنکھوں کو چُندھیا دیا۔ پریس فوٹو گرافر کی آواز آئی۔ 'تھینک یو، سر۔ تھینک یو، میڈم۔' اور انھوں نے دیکھا کہ فوٹو گرافر بھاگا ہوا جا رہا ہے اور ریستوران کے باہر کھڑی ہوئی موٹر میں چڑھتے ہی وہ موٹر وہاں سے غائب ہو گئی۔

گوتم سمجھ گیا کہ اس فوٹو گرافر کے یہاں آنے میں رادھا بائی یا مسز شرما یا ان دونوں کا ہاتھ ہے۔

''اب یہ لوگ اس تصویر کو لے کر سب پیپرس میں چھپوائیں گے۔'' آشا نے پریشان ہو کر کہا: اسکینڈل پھیلائیں گے۔ گندی گندی باتیں لکھوائیں گے۔

''لکھنے دو آشا۔'' گوتم نے ٹیبل سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب اس سوسائٹی سے میرا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا ہے اور یہی اعلان کرنے کے لیے کل میں اُن تمام جگہوں پر جانا چاہتا ہوں جہاں میں پہلے جایا کرتا تھا۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟''

اور آشا نے گوتم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے یقین کے ساتھ کہا: ''میں تمھارے ساتھ ہر جگہ چلنے کو تیار ہوں گوتم۔ چلو!''

یہ اُس کی طرف سے اعتراف محبت تھا۔

اور اُن دونوں کی طرف سے اعلان جنگ بھی تھا!

○

دھوئیں کی زنجیر

اوبرائے شیراٹن ہوٹل۔

گوتم کی سب سے چھوٹی پرانی موٹر آکر کھڑی ہوئی تو ایسا لگا جیسے آگے پیچھے دائیں بائیں جو بڑی بڑی نئی شاندار موٹریں کھڑی تھیں ان کا منہ چڑا رہی ہو۔ چھ فٹ کے لمبے چوڑے شاندار دربان نے گوتم کو پہچانتے ہی سلام مارا اور جب اُس نے کہا۔ ''کہو بھئی کیسے ہو؟'' تو دربان نے کہا۔ ''ٹھیک ہے صاحب۔ آپ بہت دن بعد آئے صاحب۔''

گوتم نے یہ نہیں کہا کہ آج کے بعد شاید ہی وہ کبھی یہاں آسکے گا اور آشا کا بازو پکڑ کر اندر لے گیا۔

دربان نے دل ہی دل میں سوچا کہ اچھا ہے آج گوتم صاحب کے ساتھ کوئی معقول لڑکی معلوم پڑتی ہے۔ شکر ہے وہ اوچھی مایا رانی نہیں ہے۔

اندر لابی میں پہنچ کر آشا نے گوتم سے کہا۔ ''لگتا ہے تمھیں یہاں سب لوگ جانتے ہیں۔''

گوتم نے صاف گوئی سے کہا۔ ''کبھی میں یہاں روز آیا کرتا تھا۔ مایا کے ساتھ۔''

پھر سامنے سے آنے والے لوگوں کی طرف اُس نے نگاہ کی تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔ ''لو نام لیا اور وہ شیطان سامنے ہی آگیا!''

سامنے سے مایا ایک بھڑ کیلی ساڑی پہنے، بغیر کمر کی چولی پہنے، لمبے چوڑے تگڑے گوپال کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ جس کو اپنے تخیل میں گوتم نے پستول کی گولی سے مار ڈالا تھا۔ وہی سامنے مایا کو بغل میں لیے چلا آرہا تھا۔

مایا نے گوتم کو دیکھتے ہی کہا:'' ہائی۔ گوتم!'' اور گوپال سے چپک گئی۔ سہارا لینے کے لیے یا گوتم کو چڑانے کے لیے؟

گوتم نے کہا۔'' ہائی۔ مایا۔''

گوپال نے ہاتھ ملا کر صرف '' ہائی......'' کرنا ہی کافی سمجھا۔

مایا نے گوپال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، گوتم سے کہا۔'' گوگی کو تو تم جانتے ہی ہو؟''

گوتم نے کہا۔'' اچھی طرح سے!'' (اچھی طرح نہ جانتا تو تخیل میں بھی اُس کا خون کیسے کر سکتا تھا؟)

اب گوتم نے آشا اور مایا کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔'' یہ ہیں آشا پریم چند، اور آشا، یہ ہیں مس مایا رانی......اور یہ'' گوپال کی طرف اشارہ کر کے'' یہ ہیں اِن کے دوست جن کو سب پیار سے گوگو۔ میرا مطلب ہے گوگی کہتے ہیں۔''

'' مایا اور گوگی نے بیک وقت'' ہائی کیا''

مگر آشا نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

اگر وہ مانگی ہوئی امریکن ایٹی کیٹ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے تو وہ اپنے ہندوستانی ڈھنگ کیوں چھوڑے؟

اور پھر مایا اور گوپال باہر کی طرف ٹہلتے ہوئے چلے گئے اور گوتم اور آشا اندر کی طرف چلے۔

آج کل کی سوسائٹی میں، آج کل کی دُنیا میں۔ لوگ اسی طرح ملتے ہیں ہائی کرتے ہیں۔ پھر اپنے اپنے راستے چلے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں۔ جب تک ایسی ہی کسی جگہ پھر ملاقات نہ ہو جائے!

اب گوتم اور آشا لفٹ مین کے سامنے کھڑے تھے۔

اوپر سے ایک لفٹ آیا۔ اُس میں سے ایک اچھی شکل وصورت کا لمبا تگڑا نوجوان باہر نکلا

اور گوتم کو دیکھتے ہی چلاّ پڑا۔"ہائی۔ گوتم!"

"ہیلو، ستیش" گوتم نے بھی کسی قدر گرمجوشی سے کہا۔

"نمستے۔" آشا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

ستیش اور گوتم کالج کے پرانے کلاس فیلو اور دوست تھے۔

ستیش نے کہا:" کہو، یار۔ اتنے دنوں سے نظر نہیں آئے۔"

گوتم نے جواب دیا:" آج کے بعد کبھی شاید یہاں نظر نہیں آؤں گا۔"

"کیا کسی دوسرے ملک جارہے ہو؟"

گوتم کا جی چاہتا تھا کہے" دوسرے ملک نہیں دوسری دُنیا۔" مگر یہ بات ستیش جیسا کھلنڈر کیا سمجھے گا۔ سو اُس نے صرف اتنا کہا" کچھ ایسا ہی سمجھو۔"

بڑے لکی ہو، یار۔ ستیش غلط سمجھ کر بولا:" کہاں جارہے ہو۔ پیرس، لندن یا نیو یارک؟"

گوتم نے کہا۔"ان سب جگہوں سے بھی بہت دور!" اور آشا کو ساتھ لیے لفٹ میں داخل ہوگیا۔ لفٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ لفٹ اوپر کی طرف روانہ ہوگیا۔ تب ستیش نے اُدھر منہ پھراتے ہوئے کہا۔

"یہ گوتم بھی بڑا ہی پاگل ہے۔ پہلے تو RASH DRIVING میں جیل گیا۔ اب کیا اس لڑکی کے ساتھ کالے پانی جانے کا ارادہ ہے؟"

اس رات کو گوتم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

آشا کو ہراُس جگہ لے گیا جہاں وہ مایا کو بھی لے جایا کرتا تھا۔

"اوبرائے شیراٹن" کی تیسویں منزل پر بنے ہوئے سُپر کلب میں جہاں دو آدمیوں کے ایک وقت کے کھانے کے دوڈھائی سو روپے دینے پڑتے ہیں— اور دس روپے کے نوٹ سے کم ٹپ دو تو ویٹر ایسے گھور کر دیکھتے ہیں جیسے کسی بھکاری کو کوئی ایک نیا پیسہ دے دے!

تاج محل ہوٹل کا گراؤنڈ فلور پر بنا ہوا ریستوران 'شامیانہ' جس کا صرف نام ہی ہندوستانی تھا۔ باقی سب کچھ ولایتی۔ جہاں چھوٹے موٹے فلم اسٹار— 'اُبھرتے ہوئے ستارے' جن کو کہا جاتا ہے۔ آدھی رات کے بعد آکر ٹمٹماتے ہیں۔

اور پھر جوہو کے کنارے۔

''سن اینڈ سینڈ'' ہوٹل۔ جہاں نہ اُبھرتے ہوئے سورج کو کوئی دیکھتا ہے نہ ریت پر کوئی لیٹتا ہے۔صرف شراب پی جاتی ہے اور سوئمنگ پول کے نیلے رنگ کے پانی میں خوش فعلیاں کی جاتی ہیں۔اندر کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈائننگ ہال میں ڈانس کیا جاتا ہے۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے آشا کا جی بھر گیا۔

''گوتم اس بھیڑ میں میرا جی گھبرا رہا ہے۔اب مجھے یہاں سے کہیں لے چلو جہاں میں سانس لے سکوں......''

''یہ کون سی بڑی بات ہے— باہر آؤ۔''

''وہ ہمیں بلا رہا ہے۔''

''کون؟''

''سمندر۔''

سمندر کے کنارے ریت پر ایک ہپّی جوڑا بیٹھا تھا۔لڑکی کے بال چھوٹے تھے۔لڑکے کے بال لمبے تھے۔دونوں تقریباً ایک جیسے ہی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔دونوں کے پاس گٹار تھے جو وہ بجا رہے تھے۔اپنا دل بہلا رہے تھے۔گوتم اور آشا جیسے اِکا دُکا آنے جانے والوں کا دل بہلا رہے تھے۔

گٹار کی دُھن اس وقت، اُس ماحول میں، سمندر کی لہروں کے جل ترنگ سے مل کر کانوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔کم سے کم گوتم اور آشا کے کانوں کو جن کا دل اُس وقت ایک دوسرے کی چاہت سے بھرپور تھا جس کا بھرپور اظہار وہ ابھی تک نہ کر سکے تھے۔

ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔جس میں سمندر کی لہریں اٹکھیلیاں کرتی دکھائی دیتی تھیں۔

گوتم نے گستاخ نگاہوں سے آشا کی طرف دیکھا۔

اُس کے لبوں نے نہ سہی تو اس کی آنکھوں نے آشا کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

آشا اُن نگاہوں کا مطلب سمجھ کر شرما گئی۔

گوتم نے آگے بڑھ کر آشا کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ وہ ایک قدم سرکی تو ساڑی کا سَرسَراتا ہوا پلّو ہاتھ میں آ گیا اور جب دوسرا قدم بڑھایا تو سرسراتا ہوا ہی ہاتھ سے نکل گیا۔

گوتم اب تک گنگنا رہا تھا۔

اب اُس کے جذبات ہیپیوں کے سنگیت میں ڈھل کر گیت بن گئے ۔

''نہ آنکھیں چراؤ نہ، دامن چھڑاؤ۔

میرے پاس آؤ۔ میرے پاس آؤ''

اور گیت ہی میں آشا نے جواب دیا:

''محبت کی دُنیا بساؤ تو آؤں

وفا کو وفا کر دکھاؤ تو آؤں

وہ چاندی کی تلوار، سونے کی دیوار

بے درد بے روح دولت کا انبار

اُسے چھوڑ کر تم جو آؤ تو آؤں''

اب بڑے یقین کے ساتھ گوتم نے گایا:

''وہ سونے کی دیوار، میں توڑ آیا

وہ دولت کا سنسار، میں چھوڑ آیا

بسائیں گے دُنیا نئی تم آ تو جاؤ

بچھا دیں گے نظریں قدم تو بڑھاؤ......''

یہاں تک کہ آشا نے بھی گوتم کے قریب آ کر کہا:

''جو دولت کا سنسار تم چھوڑ آئے

تو اک دل کی جنت بسائیں گے ہم تُم

اندھیرے کے سینے میں جو نور بھر دے

چراغ ایک ایسا جلائیں گے ہم تُم

رہیں گے سدا ساتھ، اب ہاتھ لاؤ۔''

اور پھر دونوں ساتھ مل کر کہہ رہے تھے، اعلان کر رہے تھے، ایک دوسرے سے وعدہ کر رہے تھے۔

''میرے ساتھ آؤ۔ میرے ساتھ آؤ......''

یہاں تک کہ وہ ٹہلتے ہوئے ساحل کے پھیلے ہوئے اندھیرے میں گھل گئے۔

اگربتیوں کے دھویں کا ایک بادل اُٹھ کر سرا اُتم چندرا کی تصویر کو ہار پہنا رہا تھا۔

یہ چندرا انٹر پرائزز کا بورڈ میٹنگ کا ہال تھا اور بورڈ کے سب ممبر میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

حسب معمول میٹنگ کی کارروائی مسٹر شرما ہی شروع کر رہے تھے۔ انھوں نے گوتم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہمارے چیرمین صاحب کی اجازت ہو تو میں میٹنگ شروع کروں؟''

''میٹنگ ضرور شروع کیجیے۔'' گوتم نے کہا مگر مجھے نہ ختم کر دیجیے۔''

آج گوتم ایک نئے موڈ میں تھا۔ سوٹ کے بجائے ایک آدھی آستین کی قمیص پہنے تھا جیسے لڑنے کے لیے اُس نے پہلے سے آستین چڑھالی ہو۔

ایک ڈائریکٹر نے مسٹر شرما کے بارے میں گوتم کے طنز بھرے جملے پر فوراً کہا۔'' ہمارے چیرمین صاحب کا SENSE OF HUMOUR بڑے غضب کا ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' مسٹر شرما نے ہاں میں ہاں ملائی اور پھر میٹنگ کی کارروائی جاری رکھی۔'' ہاں تو پچھلے جلسے کی کارروائی CIRCULATE کر دی گئی تھی، کوئی اعتراض؟''

''نہیں نہیں۔'' سب کی آواز آئی۔'' نو۔ نو۔ نو۔''

PASSED مسٹر شرما نے کہا یا شاید پوچھا۔

سب نے مل کر آواز لگائی UNANIMOUSLY PASSED

اب مسٹر شرما نے کہنا شروع کیا۔'' سب سے پہلے میں اپنی طرف سے چیرمین صاحب کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ موٹر کا جو ایکسیڈینٹ ہوا تھا اُس سے بال بال بچ گئے مگر یہ تو انھوں نے ضرور سیکھ لیا ہوگا کہ تیز رفتار سے چلنا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ موٹر کار ہو یا کاروبار۔''

''واہ واہ!'' داڑھی والے ڈائریکٹر نے فوراً کہا۔'' کیا بات کہی ہے۔ مسٹر شرمانے۔''

''اب ہم گوتم چندر جی سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ بورڈ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔'' اور پھر مسٹر شرمانے اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے سکریٹری سے کہا۔'' ہر بات لکھتے رہو!''

گوتم کھڑا ہوکر بولا۔'' آپ سب عمر میں ہی نہیں عقل میں بھی مجھ سے بڑے ہیں۔ زیادہ تجربہ کار ہیں۔ پھر بھی آپ نے مجھے چیرمین بنایا ہے۔'' بھلا کیوں؟''

سوال کرکے وہ ڈرامائی انداز میں ٹھہر گیا۔ سب بغلیں جھانک رہے تھے۔ گوتم نے پھر کہنا شروع کیا۔'' اس لیے تاکہ کمپنی کے سب سے زیادہ شیرس میرے نام پہ ہیں۔ مگر وہ روپیہ جس سے یہ سب شیرس خریدے گئے میں نے محنت سے پیدا نہیں کیا تھا۔ اپنے دادا سے ورثہ میں پایا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ مجھے کیا حق ہے اس روپے پر قبضہ کرنے کا؟ اس بڑی بزنس کو کنٹرول کرنے کا؟''

سب لوگ خاموشی اور تعجب سے گوتم کی باتیں سن رہے تھے۔ اُن کی یہ اب تک سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کہہ کیوں رہا ہے۔

گوتم نے اُن کی خاموشی کے ساکن تالاب میں ایک اور پتھر پھینکا۔

''ایک بات اور بتاؤں؟— ہر رات کو بارہ بجے کپڑے سے لدی ہوئی ایک ٹرک ہمارے مل سے باہر نکلتی ہے۔ چوری سے۔ گورنمنٹ کو دھوکہ دیا جاتا ہے اور ساتھ میں شیر ہولڈرس کو بھی۔ کیوں مسٹر شرما ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

مسٹر شرما گڑبڑا سے گئے۔'' جی؟۔ یہ۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

اس مہنگائی کے زمانے میں ہمارے ملوں کے مزدور بھوکوں مر رہے ہیں۔ گوتم کہے جارہا تھا۔'' اور ہم — میں خود اور آپ — مسٹر شرما۔ ہم سب ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں سوتے ہیں۔ بڑی بڑی ولایتی موٹروں میں گھومتے ہیں اور پٹرول کمپنی کے اکاؤنٹ میں ڈال دیتے ہیں، کیوں مسٹر شرما۔ کیا خیال ہے؟''

''جی۔ وہ۔ کیا کہوں؟'' مسٹر شرما گڑبڑا کر کہہ رہے تھے۔'' جی وہ— کیا کہوں— کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟''

گوتم نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔" کہیے تو سچ سچ کہہ دوں؟"

"ہاں ہاں برخوردار۔" داڑھی والے ڈائریکٹر نے کہا۔" ضرور کہو۔"

گوتم بولا۔" سچ کہتا ہوں۔ میرا اس چوری اور بے ایمانی کے ماحول میں دم گھٹنے لگا ہے......سو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ......"

یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رُکا اور سب ڈائریکٹرس اُس کی زبان کی نوک پر لٹکے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دُنیا خاموشی سے انتظار کر رہی ہے کہ گوتم آگے کیا کہتا ہے۔

"سو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے تمام شیرس بیچ کر اُس روپے سے اپنے دادا کے نام پر ایک بڑا اسپتال بناؤں جہاں غریب بچوں کا علاج مُفت ہو سکے۔"

مگر چیرمین صاحب کھچڑی بالوں والے ڈائریکٹر نے اپنا پائپ جیب میں رکھتے ہوئے کہا:" آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ کمپنی کی ساکھ جاتی رہے گی ممکن ہے دیوالہ نکل جائے۔"

اور داڑھی والے ڈائریکٹر نے کہا:" ارے بھئی گوتم۔ اپنا نہ سہی ہمارا تو سوچو۔"

بیرسٹر صاحب اپنے ہی نقطۂ نظر سے بولے:" چیرمین صاحب، کیا آپ نے اپنی اسکیم کے بارے میں انکم ٹیکس اڈوائزر اور کمپنی لا کے ماہرین سے مشورہ کر لیا ہے؟"

"جی ہاں۔" گوتم نے زور دے کر کہا۔" میں نے مشورہ کیا ہے، اپنی آتما سے، اپنے ضمیر سے، میں نے کہا تھا کہ میں کمپنی کو نئے ڈھنگ سے چلانا چاہتا ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کو نئے ڈھنگ سے چلانا چاہتا ہوں۔"

اب مسٹر شرما نے اپنا پینترہ چلا۔ کن انکھیوں سے رادھابائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

"بھئی میں تو سمجھتا ہوں گوتم کو پورا ادھیکار ہے کہ وہ اپنے روپے کو جیسے چاہے استعمال کرے۔"

اور رادھابائی بولی:" گوتم غریب بچوں کے لیے اسپتال بنائے اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔"

اب داڑھی والے ڈائریکٹر بولے۔" مگر میری رائے میں چیرمین صاحب کو ہفتہ بھر اور سوچ بچار کر لینا چاہیے؟"

کھچڑی بالوں والے ڈائریکٹر نے حسب معمول داڑھی والے کی تائید کی۔" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اتنے دنوں میں شاید ہم سب مل کر ہی ان کے شیرس خرید سکیں۔"

اب مسٹر شرما نے تجویز پیش کی۔ ''چیرمین صاحب بس ایک ہفتہ۔''

گوتم چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ اس تجویز کی مخالفت نہ کر سکا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اُس نے کہا۔

'ایک ہفتہ کے بعد میٹنگ پھر ہوگی۔''

مسٹر شرما نے سکریٹری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے لکھ لو۔'' پھر انھوں نے اعلان کیا ''تو آج کی میٹنگ برخواست کی جاتی ہے۔''

اب سب ڈائریکٹر ایک ایک کر کے گوتم کے پاس آئے۔ مکمل خاموشی میں اُس سے ہاتھ ملایا اور ایسے چپ چاپ وہاں سے نکل گئے۔ جیسے کسی کے ہاں میت ہوگئی ہو اور اُسے پُرسہ دینے آئے ہوں۔ اخیر میں مسٹر شرما نے ہاتھ ملایا، گوتم کی کمر تھپکی جیسے ڈھارس دے رہے ہوں۔ پھر وہ بھی چلے گئے۔

اب صرف رادھابائی رہ گئیں۔ وہ بولیں۔ ''گوتم گھر چل رہے ہو؟''

''آپ چلیے۔'' گوتم نے کہا۔ ''میں آتا ہوں۔''

وہ بھی چلی گئی۔ اب کمرے میں صرف دو آدمی رہ گئے۔ گوتم اور اُس کے دادا جو تصویر کے شیشے میں سے اُسے گھور رہے تھے، اُسے اپنی طرف بُلا رہے تھے۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا گوتم اُن کی تصویر کے پاس گیا۔

''دادا جی۔'' اُس نے تصویر سے کہا۔ جیسے وہ زندہ ہو۔ ''آپ نے میرے پتا جی کو اپنی دولت سے مار ڈالا تھا لیکن میں آپ کی دولت سے اور آپ کے نام سے انیل جیسے غریب اور بیمار بچّوں کے لیے اتنا بڑا اسپتال بنواؤں گا کہ دُنیا آپ کو ہمیشہ یاد کرے گی۔'' پھر اُس نے تصویر کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے جج کسی کو پھانسی کا حُکم سُناتے ہوئے دیکھتا ہے...... نفرت سے بھی اور رحم سے بھی اور پھر ایک ایک لفظ کو چبا کر ادا کیا۔ ''یہی میرا انتقام ہوگا، دادا جی۔''

اور اُسے ایسے لگا جیسے اگربتیوں کے دھوئیں کی زنجیر دادا جی کی گردن کے گرد ایک پھانسی کی رسّی کی طرح حلقہ کیے ہوئے ہے۔

○

بندھے ہاتھ!

گوتم ابھی سو ہی رہا تھا کہ اُس کے بیڈروم میں اسپتال کی سفید یونیفارم پہنے ہوئے دو ہٹے کٹے پہلوان ٹائپ کے آدمی داخل ہوئے۔ ایک طرف ایک کھڑا ہو گیا۔ دوسرا دوسری طرف۔

اُن کے فوراً بعد ایک اچھی خاصی بھیڑ داخل ہوئی۔ آگے آگے رادھا بائی۔ اُن کے پیچھے مسٹر شرما جو صبح سویرے بھی سوٹ پہنے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کے صاحب ہاتھ میں ڈاکٹری بیگ لیے ہوئے۔ اُن کے پیچھے رادھا بائی کی نوکرانی۔ اُس کے پیچھے گوتم کا نوکر رامو۔

ان سب کے آنے کی آہٹ سے گوتم (جو زمین پر بستر لگائے سو رہا تھا) اُٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا: ”آنٹی۔ یہ سب کیا مذاق ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟“

رادھا بائی نے براہِ راست گوتم کو کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب۔ چار ہزار کا بیڈ خالی پڑا ہے اور رانا پرتاپ کی طرح ہمارا گوتم چندرا زمین پر سوتا ہے۔“

رادھا بائی نے قالین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جہاں گوتم کا پُرانا زنگ آلود باجا پڑا تھا ”اور وہ دیکھیے، دوسری نشانی۔“

”ہر وقت بچّوں کی طرح بجاتا رہتا ہے۔“ مسٹر شرما نے کہا۔

اب ڈاکٹر آگے بڑھا اور بڑے نرم ڈاکٹری لہجے میں کہا۔'' گوتم چندرا جی۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کا باجا۔''

''اُس نے ہاتھ بڑھایا اور گوتم چندرا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی وہ چلّا پڑا۔''نہیں دوں گا، نہیں دوں گا۔'' اور اُس نے لپک کر باجے کو اُٹھا کر ہاتھ پیچھے کر کے چھپا لیا۔ جیسے بچّے اپنے کھلونے کی حفاظت کرتے ہیں۔

رادھا بائی نے مسٹر شرما کی طرف دیکھ کر کہا۔'' دیکھا آپ نے مسٹر شرما'' اور پھر لوسی کے کان میں کچھ کھُسر پُسر کی۔

لوسی دوسرے کمرے میں گئی اور سنگار میز پر سے گوتم کا کھلا استرا اُٹھا کر لے آئی۔ ڈر کر ایسے اُٹھایا جیسے وہ کوئی خطرناک ایٹم بم ہو۔

رادھا بائی نے ڈرامائی انداز میں پوچھا:'' کیوں لوسی یہی ہے نا وہ ریزر......''

مسٹر شرما نے اُن کا فقرہ پورا کیا'' ......جس سے گوتم اپنا گلا کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''جی ہاں صاحب......یہی ہے۔'' لُوسی نے فوراً کہا۔

رادھا بائی پھر جذباتی انداز میں بولیں۔''وہ تو لوسی وقت پر پہنچ گئی ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا......''

اب گوتم (جو اُن سب کے چہرے دیکھ رہا تھا) لُوسی کے ہاتھ سے ریزر چھین کر بولا۔'' یہ معمولی ریزر ہے جس سے میں روز شیو کیا کرتا ہوں۔ جس سے پوجیہ دادا جی بھی کیا کرتے تھے۔ آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں۔ کیا میں پاگل ہوں جو اس سے اپنا گلا کاٹ لوں گا۔ یا اِس کا؟''

یہ کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھ سے لوسی کی طرف اشارہ کیا۔ مگر ہاتھ میں ریزر تھا۔ ڈر کے مارے لُوسی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ گوتم ہاتھ میں ریزر لیے ہنستا ہوا اپنے باتھ روم کی طرف چلا۔ ڈاکٹر نے سفید پوش پہلوانوں کی طرف سر کا اشارہ کیا اور انھوں نے آگے بڑھ کر گوتم کے ہاتھ پکڑ لیے اور اُس کے زور لگانے کے باوجود اُس کو بے بس کر دیا۔ اسی ہاتھا پائی میں ریزر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔

اب ڈاکٹر نے حکم دیا:'' آڈرلی۔ اب انہیں چھوڑ دو۔'' اور پھر قریب آ کر گوتم سے کہا!

''RELAX!RELAX''

مسٹر شرما نے گوتم کو سمجھایا۔'' بیٹا۔ یہ سب تمھاری بھلائی کے لیے ہے۔اس دماغی حالت میں ایک کھلا ہوا اُسترا تمھارے ہاتھ میں رہنا خطرہ پیدا کرسکتا ہے۔''

''کیسا خطرہ؟'' گوتم نے سوال کیا۔'' آپ کا خیال ہے کہ میں خودکشی کرلوں گا؟''

جواب ڈاکٹر نے دیا۔آتم ہتیا کا بھی خطرہ تھا۔مگر اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ ہمارے ساتھ کوآپریٹ کریں۔''

''کیا کرنا ہوگا؟'' گوتم نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔''پہلے تو میں آپ کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں پھر بلڈ پریشر۔''

''گوتم نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر کسی قدر گھبرا کر پوچھا'' مجھے کیا ہوا ہے ڈاکٹر؟''

''کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔نبض کسی قدر تیز چل رہی ہے اور بلڈ پریشر بھی ذرا بڑھا ہوا ہے مگر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کو صرف آرام کرنے کی ضرورت ہے؟''

''صرف آرام کرنے کی ضرورت ہے؟'' گوتم نے سوال نہیں کیا۔ڈاکٹر کے الفاظ دہرائے......

رادھابائی نے بڑی ملائمیت سے کہا:''گوتم بیٹا، یہ سب تمھاری صحت کے لیے کیا جارہا ہے۔''

ہاں، مسٹر شرما نے زور دے کر کہا۔'' ہم چاہتے ہیں کہ تم جلدی سے جلدی نارمل ہوکر اپنی بزنس سنبھالو اور ہم بڈھوں کو پنشن دو۔''

مگر جب انجکشن دے کر گوتم کو سلا دیا گیا تو رادھابائی اور مسٹر شرما کے چہروں کی سب بناوٹی ملائمیت غائب ہوگئی۔

جاتے جاتے مسٹر شرما نے کہا۔'' مجھے تو کل کی بورڈ میٹنگ میں ہی شبہ ہوگیا تھا...... بالکل پاگل پن کی باتیں کررہا تھا۔ میں اپنا روپیہ غریبوں میں بانٹ دوں گا!...... ہنہ!''

اپنے دفتر میں بیٹھی آشا اطمینان سے ٹیلیفون کا ڈائل گھما رہی تھی۔

نمبر ملا تو اُس نے کہا:''میں مسٹر گوتم چندرا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

اس کا جواب جو ملا اُسے سن کر آشا کے چہرے پر پریشانی اور فکر کے آثار نمایاں ہوگئے۔

''کیا کہا؟— اُن کی طبیعت خراب ہے؟۔ بہت خراب ہے؟''

گوتم کے چہرے سے تو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اگرچہ اُس کے چاروں ہاتھ پاؤں پلنگ سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایسے لیٹا ہوا تھا جیسے کسی کو صلیب پر چڑھا دیا گیا ہو۔

وہ لیٹا لیٹا سوچ رہا تھا۔ کیا میں اس زمانے کا ایک چھوٹا موٹا کرائسٹ ہوں جو مجھے اس طرح پلنگ پر لٹا کر سولی دے دی گئی ہے؟ مگر میرا قصور کیا ہے؟ کرائسٹ تو ایک انقلابی دھرم کا پرچار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے عبادت گاہ سے ساہوکاروں اور پیسہ بٹورنے والوں کو نکال دیا تھا۔ ''کیا ساہوکار اور پیسہ بٹورنے والے مجھ غریب سے بھی کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں—؟''

اتنے میں رادھا بائی، مسٹر شرما اور کل والا ڈاکٹر وہاں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ دونوں سفید پوش پہلوان بھی تھے، جنھوں نے رات کو سوتے ہوئے اُسے پلنگ سے جکڑ کر باندھ دیا تھا اور جب اُس نے جاگ کر پوچھا تھا کہ اُسے کیوں باندھا جا رہا ہے تو وہ یہ سن کر حیران رہ گیا تھا کہ اُن دونوں کا خیال تھا کہ اگر اُسے آزاد چھوڑا گیا تو وہ کھڑکی میں سے کود پڑے گا۔''

رادھا بائی نے روکھی صورت بنا کر ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب۔ آپ ہی بتائیے کل گوتم کھڑکی سے کود کر مر جاتا تو کون ذمہ دار ہوتا؟ ہمارے خاندان کا تو یہی ایک چراغ ہے۔ یہ بھی بُجھ گیا تو بس اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔''

ڈاکٹر نے انہیں اطمینان دلایا۔ ''آنٹی جی۔ میں گوتم کی طرف سے آپ کو وشواس دلاتا ہوں کہ اب ایسی کوئی بات نہیں ہوگی جس سے آپ کو پریشان ہونا پڑے'' اور پھر گوتم کی طرف دیکھ کر۔ ''تم ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرو گے نا؟''

گوتم نے پوچھا۔ ''کیا چاہتے ہیں آپ؟''

''ہم تمھیں ایک خاص اسپتال میں لے جانا چاہتے ہیں جہاں پر تمھارا علاج ہو سکے۔''

گوتم نے چونک کر سوال کیا: 'پاگل خانے میں؟'

مسٹر شرما نے بڑے ہی میٹھے انداز میں اُس کا جواب دیا۔ ''ارے بھئی اب نہ کوئی پاگل ہے

نہ پاگل خانے ہیں۔ صرف دماغی مریضوں کے لیے خاص اسپتال ہیں۔ جہاں اُن کے علاج کے لیے ہر قسم کا انتظام ہے۔ ائیر کنڈیشنڈ پرائیویٹ روم ہیں۔ سیر کرنے کے لیے باغ باغیچے ہیں۔ وہاں تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔''

ڈاکٹر نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اُسے گوتم کی طرف بڑھایا۔'' صرف ایک بار اس کاغذ پر دستخط کر دو اور باقی سب ہم پر چھوڑ دو۔''

اب گوتم نے طنز بھرے لہجے میں ڈاکٹر سے سوال کیا: ''ہاتھ بندھے ہوں تو آپ دستخط کر سکتے ہیں؟''

یہاں تو ڈاکٹر بھی لاجواب ہوگیا۔ آرڈرلی کو حکم دیا: ''گوتم صاحب کے ہاتھ کھول دو۔''

اُن دونوں نے آگے بڑھ کر بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔

''ڈاکٹر نے ایک بار پھر کاغذ آگے بڑھایا۔ گوتم نے کہا۔'' ٹھہرو۔'' وہ ابھی اس کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس نے تکیے کے نیچے سے اپنا باجا نکالا، اُسے منہ سے لگایا، اُس میں سے ایک دھیمی سی دُھن نکلی جس سے اُس کی آتما کو شانتی ملی۔ پھر اُس نے باجا رکھ کر کاغذ لیا اور ڈاکٹر کے فاؤنٹن پین سے ہی اُس پر دستخط کر دیے۔

دستخط ہوتے ہی ڈاکٹر کا لہجہ بدل گیا۔

'اب بولیے۔'' اُس نے بڑی شان سے کہا۔'' وہیل چیئر پر جانا پسند کریں گے یا اسٹریچر پر؟''

گوتم نے کہا: ''وہیل چیر پر۔''

اور وہیل چیئر پر ہی بیٹھا کر گوتم کو پاگل خانہ پہنچا دیا گیا۔ اُسے ایک پرائیویٹ وارڈ کے کمرے میں بند کر دیا گیا جو جیل خانہ تو نہیں تھا لیکن دروازے پر قفل ویسا ہی لگا ہوا تھا۔ گوتم دوسری بار کمرے میں بھی نہ جا سکتا تھا۔ صرف لوہے کی جالی لگے دروازے میں سے باہر جھانک سکتا تھا۔

رات کو اسی جالی سے لگا ہوا گوتم اپنے باجے پر وہی پرانی دُھن بجا رہا تھا۔

گوتم کمرے میں بندھا تھا باہر نہیں جا سکتا تھا مگر اُس کے باجے کی آواز باہر نکل سکتی تھی۔
اُس کی دُھن کو مَرد پاگلوں نے جنرل وارڈ میں سنا اور اُن کے دماغوں میں، اُن کے دلوں

میں، جیسے کسی نے بچپن کی یادوں کو اُجاگر کر دیا ہو۔ جو برسوں سے کبھی مسکرائے نہ تھے وہ چہرے کھل اُٹھے۔ مُردہ آنکھوں میں زندگی اور ذہانت کی روشنی آ گئی۔

وہاں سے ہوتی ہوئی یہ دُھن عورتوں کے وارڈ میں پہنچی۔ وہاں بھی پڑی ہوئی پاگل عورتوں کے من یہ دُھن سن کر جاگ اُٹھے، ناچ اُٹھے اور اس طرح یہ دُھن عورتوں کے پرائیویٹ وارڈ کے ایک کمرے کی جالی لگی کھڑکی میں سے ہوتی ہوئی ایک بوڑھی پاگل عورت تک پہنچی اور ایسا لگا کہ یہ مصیبت کی ماری برسوں سے اِسی دُھن کو سننے کے انتظار میں زندہ تھی۔

''میرا بچہ!'' کہتی ہوئی وہ دروازے تک دوڑی گئی۔ دروازہ کھلا ہوتا تو وہ باہر نکل جاتی۔ بند تھا، اسی لیے لوہے کی جالیوں والے دروازے پر سر پٹختی رہ گئی بیچاری۔

اگلی صبح کو پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب ڈاکٹر درشن اپنے دفتر میں بیٹھے اسی رات والے عجیب واقعہ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اُن کے چپراسی نے ایک کارڈ لا کر دیا۔

''آشا پریم چند۔ روزانہ 'آزاد اخبار' انھوں نے پڑھا اور چپراسی سے کہا آنے دو۔

انھوں نے دیکھا کہ سادہ سی ساڑی پہنے ایک نوجوان عورت ہے چہرے سے ذہین لگتی ہے مگر کوئی اندرونی پریشانی بھی بیچاری کو کھائے جا رہی تھی۔

''بیٹھیے'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''کہیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

آشا نے اپنے آنے کی غرض بیان کر دی۔ ''کیا میں آپ کے ایک مریض سے مل سکتی ہوں؟''

''نام؟''

''گوتم چندرا۔''

ڈاکٹر درشن بھی روزانہ 'آزاد اخبار' پڑھتے تھے۔ انھوں نے چند ہفتے ہوئے وہ رپورٹ بھی پڑھی تھی جس میں 'شکاری خود شکار ہو گیا' سُرخی کے نیچے آشا پریم چند نے بھگو بھگو کر گوتم چندرا جی کو جوتی لگائی تھیں۔

''تم پریس والے بڑے سنگدل ہوتے ہو'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''کوئی بیچارہ مرے یا پاگل ہو جائے مگر تمھیں فرنٹ پیج کا مصالحہ چاہیے۔''

''مگر یہ بھی تو سوچئے ڈاکٹر صاحب'' آشا نے کہا۔''اگر ہمارے جیسے اخبار بھی آواز نہ اُٹھائیں تو ظلم اور جرم، کرپشن اور کالے دھندے کتنے بڑھ جائیں اس دیش میں؟''

''گوتم چندرا کے کیس میں نہ تو ظلم ہے نہ جرم۔ وہ بیچارہ کل ہی یہاں آرام اور علاج کے لیے آیا ہے۔ بھئی مجھے افسوس ہے میں ایک پریس رپورٹر کو بھیج کر اُس کا دماغ اور پریشان نہیں کرنا چاہتا۔''

آشا نے تجربہ کار رپورٹروں والی چال چلی: ''مگر اتنا تو بتا دیجیے ڈاکٹر صاحب وہ کیسا ہے؟ وقت کیسے کاٹتا ہے؟''

ویسے تو بالکل شانت ہے۔ ڈاکٹر نے اُسے بتایا۔''رات اُس نے اپنا باجا بھی بجایا تھا اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔''

''عجیب بات ہوئی۔'' آشا دلچسپی اور حیرت سے کرسی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کیا ہوا، ڈاکٹر صاحب؟''

''گوتم چندرا کو کچھ نہیں ہوا مگر ایک بیچاری عورت جو بیس برس سے WOMENS WARD میں پڑی ہوئی ہے جو کبھی بولتی نہیں۔ ہم سمجھتے تھے وہ گونگی ہے۔ جیسے ہی اُس نے اس باجے کا سنگیت سنا۔ اُس نے اپنا سر جالی پر پٹخنا شروع کر دیا اور چلانے لگی جیسے کوئی اُس کے بچّے کو اس سے چھین کر لے جا رہا ہو۔ سو ہمیں گوتم چندرا کو REQUEST کرنا پڑا کہ وہ اپنا سنگیت بند کر دیں۔''

آشا کو ایسا لگا کہ جیسے گوتم کو ماضی کے اندھیرے میں دور سے ایک روشنی کی ننھی سی کرن چمکتی دکھائی دی ہو۔ اُس نے ڈاکٹر سے کہا۔''بڑی عجیب بات ہے ڈاکٹر صاحب، کم سے کم میں اس عورت سے تو مل سکتی ہوں۔''

ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر کہا: ''ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔'' اور اپنے چپراسی کو بلانے کے لیے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ایک ہاتھ مارا۔

چپراسی دروازہ کھول رہا تھا کہ جالی میں آشا نے دیکھا کہ بوڑھی پاگل عورت دیوار کی طرف منہ کیے اپنے پلنگ پر بیٹھی ہے۔

دروازہ کھلا، وہ داخل ہوئی۔ پھر دروازہ باہر سے بند کر لیا گیا مگر یہ آوازیں سن کر بھی اس بوڑھی عورت نے اپنا منہ نہ موڑا۔ وہ ویسے ہی سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔

آشا نے پاس جا کر بڑی نرمی سے آہستہ سے کہا۔''میں ڈاکٹر نہیں ہوں، وارڈر نہیں ہوں،

میں بھی کسی کو کھوجتی ہوئی آئی ہوں، تم میری مدد کرو گی، ماں؟''

ماں کا شبد آشا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

بوڑھی عورت نے اُس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ جیسے یہ لفظ اُس نے برسوں بعد سنا ہو—ایک دھیمی سی مسکراہٹ اُس کے سوکھے ہونٹوں پر کانپ رہی تھی۔

آشا نے سوچا شاید اس بیچاری کو میرا 'ماں' کہنا بُرا لگا ہو۔' معاف کرنا میرے ماں باپ مر چکے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا بھائی ہے۔ برسوں سے میں نے کسی کو ماں نہیں کہا۔'

وہ لرزتی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر آ گئی۔ بوڑھی جو گونگی سمجھی جاتی تھی۔ بولی: 'پھر کہو۔'

آشا نے کہا۔'ماں۔'

بوڑھی نے کہا۔'' پھر کہو، بیٹی!''

''ماں۔ میری مدد کرو۔ ماں۔''

اور اب اُس بوڑھی ماں کی آنکھوں میں سوئی ہوئی ممتا جاگ اُٹھی اور اُس نے آشا کو گلے سے لگا کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ڈرمت، گوتم۔ میرے لال، میرے ہوتے تجھے کون زبردستی لے جاسکتا ہے!''

گوتم کا نام سن کر آشا کے کان کھڑے ہو گئے۔ مگر گوتم تو کہتا تھا اُس کی ماں مر چکی ہے..... کیا مردہ بھی کبھی زندہ ہو سکتا ہے؟......

بوڑھی ماں بڑبڑا رہی تھی۔'' وہ آ رہے — ہیں— وہ آ رہے — ہیں!'' اور اس کی بوڑھی آنکھوں میں یاد نے برسوں پرانی آگ کی چنگاریوں کو پھر بھڑکا دیا تھا۔

آشا کو ایسا محسوس ہوا کہ آخر کار اُس نے گوتم کے ماضی کا راز پالیا ہے۔ اب اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اُس سے بچپن میں کیا چھینا گیا تھا اور کس نے اُس سے چھینا تھا اور کیوں چھینا تھا— جس کی وجہ سے آج تک کوئی، اُس کا باجا نذاق میں بھی اُس سے لیتا یا دیکھنا بھی چاہتا ہے تو وہ بھڑک اُٹھتا ہے؟......

دور ماضی کے اندھیرے میں۔ گوتم کے باجے کی دُھن سنائی دی۔

اور ماضی کا اندھیرے دور ہونے لگا......

اور اُس میں سے آہستہ آہستہ جھلکتی ہوئی دو شکلیں اُبھر آئیں۔

ایک نوجوان عورت اور ایک بچہ۔

یہ عورت وہی تھی جو آج پاگل کہلاتی تھی۔ بوڑھی کہلاتی تھی۔ جس کے چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔

مگر یہ نوجوان عورت اُس کا پچھلا جنم تھی۔ اُس کی جوانی تھی۔ مگر اُس کی مانگ میں سیندور نہیں تھا۔ اُس کی ساڑی سفید اور ملگجی تھی، وہ بیوہ تھی، جوان ودھوا۔ اور یہ سامنے چار پانچ برس کا چمکیلی آنکھوں اور کالے بالوں والا بچہ اُس کا بیٹا تھا۔ اُس کا گوتم تھا۔

ماں وہی باجا بجا رہی تھی۔ وہی دُھن بجا رہی تھی اور بچہ اُس کو غور سے بیٹھا سن رہا ہے۔ پھر ماں نے وہ باجا اپنے منہ سے ہٹا کر اپنے بیٹے کو دیا۔

بیٹے نے خوش ہو کر وہ باجا لے لیا اور اپنے منہ سے لگا کر بجانے لگا کوشش کرنے لگا کہ وہی دُھن بجا سکے جو اُس کی ماں کی دُھن تھی۔ جو ماں کی ممتا، ماں کی یاد کی طرح، اُس کے دل اور دماغ پر اس وقت بھی چھائی ہوئی تھی اور بیس برس بعد تک بھی چھائی رہے گی......

پھر دور سے...... پہلے آہستہ آہستہ پھر قریب آتی ہوئی۔۔ ایک خوفناک آواز آئی جسے سُن کر ہی ماں کی ممتا ایک بے نام خوف سے سہم گئی۔ یہ تھی چار بھیانک آدمیوں کے بھیانک پیروں کی بھیانک آواز...... چار آدمی۔

جن کے چہرے نہیں تھے۔

جن کی آنکھیں نہیں تھیں۔

جن کے ہاتھ نہیں تھے۔ کان نہیں تھے۔ ناک نہیں تھی۔

صرف کالے کالے ہیولے تھے۔ سائے تھے۔ بھیانک پرچھائیاں تھیں۔

وہ اُس کے اور اس کے بچے کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

آگے والے آدمی نے ایک بہت بڑا قانونی کاغذ نکالا۔ شاید کسی کی وصیت تھی۔ وہ گرجدار آواز میں پڑھنے لگا۔

''گوتم چندرا ولد اشوک چندر عرف اشوک بھارتی۔ سر اُتم چندرا کی وصیت کے انوسار

(مطابق) تم ان کی تمام جائیداد کے وارث ہو۔ آج سے تم اپنی ماں کے پاس نہیں اپنے دادا کے گھر چندراولا میں رہا کرو گے۔ جس کے تم قانونی حقدار ہو اور جس کا مستحق تمھیں بننا پڑے گا۔"

اور پھر ایک کالا، مہیب۔ جو ایک ہاتھ نہیں تھا۔ ایک پھنکاریں مارتا ہوا سانپ تھا۔ ایک شیطانی پنجہ تھا— آگے بڑھا— بڑھتا گیا— یہاں تک کہ اُس کے بچّے کے گلے تک پہنچ گیا اور اُس سے چھین کر لے گیا۔

اب وہ چاروں شیطان— اُس کے بچّے کو اٹھائے لیے جا رہے تھے اور وہ "نہیں۔ نہیں۔" کہتی، چلاتی اُن کے پیچھے بھاگی جا رہی تھی کہ!

دفعتاً ایک فولادی سلاخوں والا دروازہ اُس کے سامنے آ گیا اب وہ قید تھی...... جیل خانے میں یا پاگل خانے میں۔

اُس کے کانوں میں آوازیں آ رہی تھیں۔

"تم پاگل ہو! تم پاگل ہو! تم پاگل ہو!......"

ان آوازوں نے اُسے ڈرا دیا، اسے دہلا دیا، اُسے گونگا کر دیا، اُسے پاگل بنا دیا۔

اور وہ تھک ہار کر گر پڑی اور سلاخوں سے اپنا سر مارنے لگی۔

وہ سر مارتی گئی۔

اور وقت گزرتا گیا۔

یہاں تک کہ ماضی حال میں تبدیل ہو گیا۔ مگر وہ اب بھی اپنی کوٹھری کے دروازے کی فولادی جالیوں پر اپنا سر پٹک رہی تھی اور کہے جا رہی تھی۔ "نہیں— نہیں— نہیں۔"

اور آشا جس نے اُسے ماں کہا تھا...... اور جواب اُسے ماں کی طرح پچکار رہی تھی۔ اُسے دلاسہ دیے جا رہی تھی "ماں! ماں۔ میں آپ کو وچن دیتی ہوں کہ آپ کا گوتم پھر آپ کو مل جائے گا۔ آپ کا گوتم ماں— آپ کا گوتم!— گوتم!—"

جیسے طوفان تھم گیا ہو۔

اب بوڑھی نے کہا: بیٹی

اچھا لگتا ہے۔ آشا بولی۔ "پھر کہو، ماں!"

بیٹی۔

ہاں، ماں!

تم میرے گوتم کو جانتی ہو—؟

آشا نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

وہ اچھا تو ہے نا؟

ہاں۔ ہاں مگر وہ بھی آپ کی طرح بڑی مشکل میں ہے اور صرف آپ ہی اُس کی مدد کر سکتی ہیں۔ اگر آپ دُکھ کے سمندر میں ڈوب کر پھر سے چپ نہ ہو جائیں!'

ماں نے کہا۔ ''میں اپنے گوتم کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں!''

''آپ تو سب کچھ کریں گی۔'' آشا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اور پھر اپنے آپ سے۔ ''مگر ایک عورت اور ہے۔ جس کی گواہی گوتم کے لیے خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔''

مایا اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی ایک امریکن فیشن میگزین پڑھ رہی تھی کہ اُس کی نوکرانی نے ایک کارڈ لا کر دیا۔

''بلاؤ انہیں۔'' مایا نے کہا اور اُس کے ہونٹوں پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

آشا داخل ہوئی۔

مایا نے طنزیہ لہجے میں اُس کا کارڈ پڑھا۔ مس آشا پریم چند۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ۔ ''بیٹھیے بیٹھیے'' اور جب آشا بیٹھ گئی تو مایا نے کہا لگتا ہے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے؟ ہاں خوب یاد آیا۔ ہماری آپ کی تو رشتے داری ہے......''

''جی!'' آشا نے تعجب سے کہا۔

''ہاں۔ گوتم کے رشتے سے۔'' مایا نے بےشرمی سے کہا۔ ''لگتا ہے جھوٹا کھانا آپ کو اچھا لگتا ہے۔''

''دیکھیے مس مایا رانی۔'' آشا نے بھی تیزی سے کہا۔ ''میں جلی کٹی باتیں نہ کرنے آئی ہوں، نہ سننے آئی ہوں۔ یہ معاملہ بہت سیریس ہے۔ گوتم کی جان اور عزت دونوں خطرے میں ہے۔ کچھ لالچی اور ظالم لوگوں نے اُسے پاگل خانے میں بند کرا دیا ہے......''

''ضرور اُس نے پاگلوں جیسی حرکتیں کی ہوں گی!'' مایا نے بات کاٹ کے کہا۔

''آپ بھی اُس سے پیار کرتی تھیں یا کم سے کم وہ آپ سے پیار کرتا تھا۔''

''آپ چاہتی کیا ہیں؟'' مایا نے بڑے کاروباری انداز میں پوچھا۔

''میں نے سنا ہے مسٹر شرما آپ کو گواہ بنا کر عدالت میں پیش کرنے والے ہیں۔''

''وہ چاہتے ہیں'' مایا نے اقرار کیا۔ ''مگر میں نے ابھی تک ہاں نہیں کی۔''

اب آشا نے وہ بات کہی جس کو سن کر مایا حیران رہ گئی۔ گوتم کی وکیل کی حیثیت سے میں بھی چاہوں گی کہ آپ ضرور گواہی دیں۔''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری گواہی گوتم کے خلاف جا سکتی ہے؟''

''اگر آپ گوتم کو سچ مچ پاگل سمجھتی ہیں تو ضرور کہیے۔ میں آپ سے جھوٹ بولنے کو نہیں کہوں گی۔''

''بڑی مہربانی ہے آپ کی!'' مایا کی آواز میں طنز کا زہر گھلا ہوا تھا۔

مگر آشا پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ''لوگ کہتے ہیں کسی عورت کے پیار کو ٹھکرا دیا جائے تو وہ جلن کے مارے کچھ بھی کہہ سکتی ہے کچھ کر بھی سکتی ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ کوئی بھلی عورت کسی کو دکھ دینے کے لیے جھوٹ نہیں بولے گی۔''

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں ایک بھلی عورت ہوں؟'' مایا کی آواز میں طنز تو تھا ہی، خفت بھی تھی، غصہ بھی، ان سب پر جو اُسے چھچھوری چھوکری سمجھتے تھے۔ ''دیکھیے، مس پریم چند۔ میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کرتی۔ میں نے تو ابھی تک یہ بھی طے نہیں کیا کہ میں گواہی دوں گی یا نہیں۔'' اور پھر اُس نے آشا کو جانے کا اشارہ کیا۔ ''گڈ بائی، مس پریم چند!''

''نمستے مایا جی۔'' آشا نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازے پر ایک ادھیڑ عمر کے جوڑے سے مڈبھیڑ ہوئی آشا نے سوچا۔ ''ضرور مایا کے ڈیڈی ممی ہوں گے!''

مایا کی ممی۔ جو ایک بھڑکیلی ساڑی پہنے اٹھلا رہی تھیں۔ بیٹی سے بولیں۔ ''یہ کون تھی جو ابھی یہاں آئی تھی؟''

مایا کے ڈیڈی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''ہاں اس لڑکی کو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا!''

''تم چپ رہو جی'' جس طرح مایا کی ممی نے اپنے شوہر کو ڈانٹا اُس سے صاف ظاہر تھا اس گھر میں حکم کس کا چلتا ہے۔

مایا نے آشا کے بارے میں بتایا۔''ممی یہ لڑکی گوتم کی وکیل ہے اور اُس کی گرل فرینڈ بھی۔''

مایا،ممی نے کہا۔''اوہ! پھر یہاں کیوں آئی تھی۔؟''

مایا نے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔''میرے خیال میں تُوہ لینے آئی تھی کہ میں مقدمے میں پیش ہوئی تو کیا کہوں گی۔''

''تو پھر تم نے کیا کہا؟'' ڈیڈی نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تم چپ رہو نا پلیز۔'' ممی نے شوہر کو ڈانٹا۔ پھر بیٹی سے پوچھا۔''ہاں بیٹا۔ تم نے کیا کہا؟''

''ممی۔ میں نے کہا کہ میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ گواہی دوں گی یا نہیں......''

''لیکن بیٹا۔'' ممی نے سمجھایا۔''گواہی تو تمھیں ضرور دینی چاہیے۔ آخر تمھیں اس سے اچھا موقع کہاں مل سکتا ہے بدلہ لینے کے لیے؟ اُس نے تمھارا دل توڑا ہے نا اور وہ بھی ایک ایسی معمولی لڑکی کے لیے۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟''

''EXACTLY'' ڈیڈی بولے۔''یہی تو مسٹر شرما بھی کہہ رہے تھے۔''

''تم چپ رہو جی...... ماں بیٹی کے درمیان بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تمھیں۔''

اب شوہر کی ہمت نہیں تھی کہ بیوی کو کچھ کہہ سکے۔ لہٰذا غصہ نوکر پر اُترا۔

گووندا۔'' وہ چلّایا'' کہاں مر گیا اُلو کا پٹھا۔''

''جی حضور کہتا ہوا نوکر فوراً حاضر ہو گیا۔

''جاؤ وہسکی اور سوڈا ہمارے کمرے میں رکھ دو۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بیوی نے طنز بھرا جملہ کسا۔''بس ہو گئے شروع!...... جایئے جایئے۔ شراب پیجیے۔'' مطلب تھا کہ''اور کر بھی کیا سکتے ہیں آپ؟''

''پھر ممی نے بیٹی سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔''ہاں تو بیٹا کیا ارادہ کیا ہے تم نے؟''

مایا نے دماغ میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔''ممی۔ میں گواہی ضرور دوں گی۔''

O

دنیا کہتی مجھ کو پاگل......

سیشن جج کی کورٹ شروع ہونے والی ہی تھی کہ باہر برآمدے میں مسٹر شرما، بھیکو اور سوہن سے چپکے چپکے باتیں کرتے دکھائی دیے......

''تم دونوں گوتم کے ساتھ جیل میں تھے۔ تم نے تو اس کا پاگل پن ضرور دیکھا ہو گا۔''

''اپنی آنکھوں سے دیکھا، مسٹر شرما جی۔'' بھیکو نے انہیں یقین دلایا۔

''اور ان آنکھوں سے بھی دیکھا حضور' سوہن نے اُنہیں اپنی یاد بھی دلا دی۔

''بس جو آنکھوں سے دیکھا ہے کورٹ کو بتا دینا۔'' مسٹر شرما نے دونوں سے کہا اور اندر جانے والے تھے کہ بھیکو نے اپنی ٹوپی اُتار کر اُن کے سامنے کر دی۔

اور سوہن نے کہا: ' آپ تو جانتے ہیں اپن لوگ غریب آدمی ہیں۔'' اُس کے لہجے اور ٹوپی کے اشارے سے ظاہر تھا کہ اُن کا مطلب کیا ہے۔

''سمجھا۔ سمجھا۔'' مسٹر شرما نے اُنھیں اطمینان دلایا اور ساتھ میں چند سو سو کے نوٹ نکال کر ایک نیلا نوٹ بھیکو کی ٹوپی میں ڈال دیا اور دوسرا نوٹ چپکے سے سوہن کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''جب مقدمہ جیت جائیں گے تو اور بھی ملے گا۔''

لال وردی، لال لبادگلہ، لال پگڑی، اور سنہری پٹی اور سنہری چپراس پہنے ہوئے کورٹ کے حولدار نے اونچی آواز میں اعلان کیا۔

''چو—پ!''

اس کا مطلب تھا کہ نہ صرف سب ''چپ'' ہو جائیں بلکہ جج صاحب کی آمد کے لیے تیار ہو جائیں۔''

جج صاحب کالا کوٹ، کالا گاؤن پہنے، موٹے موٹے شیشوں کا کالا چشمہ لگائے داخل ہوئے۔ سب لوگ کھڑے ہو گئے۔

جج صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک اشارہ کیا۔ سب لوگ اپنی کرسیوں یا اپنی بینچوں پر بیٹھ گئے۔

جج صاحب نے سامنے رکھے ہوئے کاغذوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، ایک فائل نکالا۔ اُس کے ورق اُلٹے پھر بولے۔

''مسٹر گوتم چندرا کا وکیل کون ہے؟''

''میں ہوں یورورشپ۔'' اور آشا وکیلوں کی کالی گاؤن پہنے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ اُس سے چند قدم کے فاصلے پر گوتم بیٹھا ہوا تھا اور گوتم کے پاس ہی مینٹل اسپتال سے ساتھ آئی ہوئی ایک نرس بیٹھی تھی۔

اب جج صاحب نے کہا۔ ''اور چندرا انٹر پرائزز کی طرف سے کون وکیل ہے؟''

''آئی یورورشپ۔'' یہ بیرسٹر لال تھے۔ جو دُبلے پتلے تھے۔ ویسی ہی پتلی پتلی اُن کی نوکدار مونچھیں تھیں اور جن کی جرح کرنے کی قابلیت کا بڑے بڑے وکیل، بیرسٹر جج اور مجسٹریٹ لوہا مانتے تھے۔

انھوں نے بڑی حقارت سے آشا کی طرف دیکھا جیسے سوچ رہے ہوں۔ کیا اس ہاتھی کا مقابلہ یہ میاؤں کرنے والی بلّی کرے گی۔؟

اب جج نے آشا کو مخاطب کر کے کہا: ''مس آشا پریم چند۔ آپ اس عدالت میں مقدمہ لے کر آئی ہیں کہ مسٹر گوتم چندرا پاگل نہیں ہیں مگر ان کو پاگل قرار دے دیا گیا ہے۔ آپ کے خیال

میں اِس کے پیچھے کوئی بڑی سازش ہے۔''

بیرسٹر لال نے اپنی زوردار آواز سے رعب ڈالتے ہوئے کہا۔

''یورورشپ۔ سازش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے عدالت کے سامنے وہ کاغذات پیش کیے ہیں۔ جن پر خود مسٹر گوتم چندرا کے دستخط موجود ہیں جن میں انھوں نے لکھا ہے کہ اُنھیں کسی مینٹل ہاسٹل میں رکھا جائے۔''

مگر آشا ان کا رعب ماننے والی نہیں تھی ''یورورشپ۔'' اُس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے بیرسٹر لال کو جواب دیا۔ ''دنیا میں ایسے پاگل تو ہیں جو اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں لیکن کسی پاگل نے آج تک اپنے آپ کو پاگل نہیں کہا۔ سوائے مسٹر گوتم چندرا کے۔ میں پوچھتی ہوں کیا مسٹر گوتم ایک دوسرا بیان دیں کہ اب اُنہیں اپنی دماغی صحت پر کوئی شک وشبہ نہیں رہا تو کیا اُنہیں پاگل خانے سے چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا اُنہیں اپنی بزنس کی دیکھ بھال اور اپنی دولت کے استعمال کا اختیار دے دیا جائے گا؟''

بیرسٹر لال کرسی سے ایسے اُچھلے جیسے مداری کے پٹارے سے سانپ پھنکار مار کر سر اُٹھاتا ہے۔ 'یہ کبھی نہیں ہوسکتا، حضور۔ اب صرف مسٹر گوتم چندرا کا کہنا کافی نہیں ہے۔ ہمارے پاس اُنہیں پاگل ثابت کرنے کے لیے کتنے ہی گواہ موجود ہیں۔'

آشا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''تو میری اتنی درخواست ہے کہ ان گواہوں کو پیش کیا جائے۔''

کورٹ کلرک نے آواز لگائی۔ ''مس لوسی ڈیسوزا۔'

رادھا بائی کی نوکرانی لوسی ڈی سوزا گواہوں کے کٹہرے میں پیش ہوگئی۔

بیرسٹر صاحب نے پوچھا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ مسٹر گوتم چندرا خطرناک پاگل ہیں؟''

لوسی نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی ہاں صاحب بالکل پاگل۔ ایک دن گوتم صاحب اتنا بڑا کھلا ریزر لیے اپنا گلا کاٹنے والے تھے کہ میں چیخ پڑی......''

اور لوسی نے ایسا خوفزدہ منہ بنایا کہ کورٹ میں جتنے لوگ موجود تھے وہ سوچنے لگے کہ واقعی ایسی حرکتیں کرنے والا خطرناک پاگل ہے۔

کورٹ کلرک نے آواز لگائی۔ ''بابو رام راٹھور۔''

ڈرائیور بابو گواہوں کے کٹہرے میں موجود تھا اور کہہ رہا تھا۔

''حضور۔ گوتم صاحب جب بھی موٹر چلاتے تھے تو مجھے تو بہت ڈر لگتا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل چھوڑ کر باجا بجانے لگتے تھے۔ آخر ایک دن ایکسیڈینٹ ہو ہی گیا حضور۔''

کلرک نے پکارا۔ ''رام لال عرف رامو۔''

گوتم کا نوکر رامو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ حضور مجھے تو اُس وقت شبہ ہوا کہ گوتم صاحب کا دماغ ٹھیک نہیں ہے جب وہ مجھے رامو کی بجائے بھیکو کہہ کر بلانے لگے۔''

کلرک نے پکارا۔ ''رادھابائی اُتم چندر۔''

رادھابائی گواہوں کے کٹہرے میں کھڑی تھیں۔

بیرسٹر نے پوچھا۔ ''آپ کو کیسے شبہ ہوا کہ آپ کے بھتیجے کا دماغ خراب ہے؟''

رادھابائی آنکھوں میں آنسو بھر کے بولیں۔ ''مجھے تو شروع سے ہی شبہ تھا۔ اس کی ماں بھی پاگل تھی جناب والا۔ گوتم تو کبھی نارمل نہیں تھا۔ اتنا بڑا ہو گیا مگر بچّوں کا باجا بجاتا رہتا تھا۔ پاگلوں کی طرح موٹر چلاتا تھا اور آپ یقین نہیں کریں گے اپنا چار ہزار روپے کا پلنگ چھوڑ کر زمین پر سونے لگا تھا۔ مجھے تو اُس کی جان کی طرف سے بڑی چنتا تھی، جناب والا۔ پاگل کا کیا بھروسہ۔ کب جانے کیا کر بیٹھے۔''

بیرسٹر نے کہا۔ ''تھینک یو رادھابائی۔'' اور پھر آشا کی طرف مڑ کر ''آپ کا گواہ!'' تا کہ وہ جرح کر سکے۔

آشا وکیلوں کا گاؤن پہنے ہوئے جرح کرنے کھڑی ہوئی۔ ''شریمتی رادھابائی۔ کیا آپ کے خیال میں زمین پر سونا پاگل پن کی نشانی ہے؟''

''جی ہاں، بالکل'' رادھابائی نے بڑے یقین کے ساتھ جواب دیا۔

''تو کیا بمبئی کی آدھی آبادی پاگل ہے جو زمین پر سوتی ہے اور اس میں سے پانچ لاکھ آدمی فٹ پاتھ پر سوتے ہیں؟ کیا وہ سب پاگل ہیں؟''

اس پر عدالت میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

''جج نے میز پر ہتھوڑا مار کر رعب دار آواز میں کہا۔'' آرڈر آرڈر! اور پھر آشا کی طرف دیکھ کر۔ ''مس پریم چند۔ آپ عدالت پر ناجائز اثر ڈالنے کے لیے غیر ضروری سوال اُٹھا رہی ہیں۔''

آشا نے فوراً معافی مانگ لی۔'' معاف کیجیے جناب والا۔'' اور پھر رادھا بائی سے مخاطب ہو کر۔'' رادھا بائی۔ آپ نے کہا کہ گوتم کی ماں بھی پاگل تھی۔ اس تھی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

''بیس برس پہلے مر گئی بیچاری'' رادھا بائی نے غمزدہ منہ بنا کر جواب دیا۔'' پاگل پن کے دورے میں اُس نے اپنے کپڑوں میں آگ لگالی تھی۔''

آشا نے اب جج کو مخاطب کر کے کہا۔'' بیس برس پہلے مر گئی تھی رادھا بائی کا یہ بیان نوٹ کیا جائے، جناب والا۔''

اب کورٹ کلرک نے ''مسٹر دیوندر شرما'' کو پکارا۔

مسٹر شرما بڑی شان سے مونچھوں کو تاؤ دیئے، گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے جج کی طرف دیکھ کر جھک رہے تھے۔

''مسٹر شرما'' بیرسٹر لال نے پوچھا۔'' آپ کو کب شبہ ہوا کہ گوتم چندرا کا دماغ ٹھیک نہیں ہے؟''

مسٹر شرما نے کہنا شروع کیا۔'' ویسے تھوڑا سنکی تو وہ شروع سے تھا۔ اپنے آفس میں آتے ہی کواڑ بند کر کے کرسی پر لٹو کی طرح گھومنا شروع کر دیتا تھا۔ اور تو اور کلرک اور چپراسی بھی اُس پر ہنستے تھے۔ مگر کچھ دنوں سے یہ پاگل پن خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ اگر ڈاکٹرس اس کو پاگل CERTIFY کر کے مینٹل ہاسپٹل نہ بھجواتے تو اُس کا یہ پاگل پن اُس کی جان اور اُس کی خاندانی جائیداد کے لیے بڑا خطرہ پیدا کر سکتا تھا۔ یور آنر۔ اپنی کروڑوں کی جائیداد کے بارے میں اُس کے ارادے بہت ہی خطرناک تھے۔''

بیرسٹر نے کسی قدر پریشان ہو کر جلدی سے کہا۔THAT WILL DO, ME SHARMA لگتا تھا جلدی میں مسٹر شرما کوئی ایسی بات کہہ گئے تھے جو نہ کہنی چاہیے تھی۔

مگر ابھی آشا کی جرح باقی تھی۔ اُس نے کھڑے ہو کر پوچھا:'' مسٹر شرما، آپ بتا سکتے ہیں کہ اپنی جائیداد کے بارے میں مسٹر گوتم چندر کے یہ خطرناک ارادے کیا تھے؟''

مسٹر شرما نے کہنا شروع کیا۔'' جی۔ وہ۔ اسکیم۔؟'' پھر وہ رُک گئے۔

بیرسٹر لال نے مسٹر شرما کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ یہی وہ سوال تھا جس پر وہ جرح نہیں چاہتے تھے۔

مسٹر شرما نے گڑبڑا کر بیان جاری رکھا۔ میرا مطلب ہے ایسی کوئی اسکیم نہ تھی مگر ہو سکتی تھی۔ آخر ایک پاگل کا کیا بھروسہ؟''

آشا نے سوال کیا۔ '' مسٹر گوتم کے مینٹل ہاسپٹل میں جانے کے بعد کون اس جائیداد اور روپے کو کنٹرول کرتا ہے؟''

مسٹر شرما نے کہا۔ '' میں کنٹرول کرتا ہوں۔''

اور آشا نے جلدی سے کہا۔ '' تھینک یو، مسٹر شرما۔ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

کورٹ کلرک نے آواز لگائی۔ '' مس مایا سونا چند۔''

مایا ایک بھڑکیلا چست فیشن ایبل لباس پہنے گواہوں کے کٹہرے میں آ کھڑی ہوئی۔

بیرسٹر لال نے پوچھا۔ '' مس سونا چند۔ کیا آپ مسٹر گوتم چندرا کو جانتی ہیں؟''

مایا نے ایک نظر گوتم کی طرف دیکھا۔ پھر جج کی طرف دیکھ کر جواب دیا '' جانتی تھی۔ بہت قریب سے۔''

'' آپ کو کبھی اُن سے اکیلے میں ملنے کا اتفاق ہوا ہے؟''

مایا نے بلا جھجک کے جواب دیا۔ '' جی ہم اکثر اکیلے ہی ملا کرتے تھے۔''

'' آپ کو کبھی شبہ ہوا۔۔ کہ ۔۔۔ وہ پاگل ہیں؟''

'' جی ہاں اکثر ہوا ہے۔۔ آخری بار خاص طور پر......''

'' اُس وقت کیا ہوا تھا؟''

'' معاف کیجیے گا جناب والا۔'' مایا نے کہنا شروع کیا۔ '' مگر یہ سچ ہے میں گھر میں بیٹھی ایک دوست کے ساتھ شراب پی رہی تھی۔ گوتم اچانک ہاتھوں میں (پھولوں کا؟) گلدستہ لیے ہوئے آیا اور میرے دوست کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں سے آگ نکلنے لگی۔ اُس کے ہاتھ میں پستول ہوتا تو وہ ہم دونوں کا خون کر دیتا اور شاید اپنا بھی۔ پھر وہ دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ پھر میں نے سنا اس رات اُس کی کار کا ایکسیڈینٹ ہو گیا اور وہ جیل چلا گیا۔ یہ سب پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟''

مایا کی گواہی سن کر مسٹر شرما اور رادھا بائی کی باچھیں کھل گئیں۔ اب تو عدالت کو ماننا ہی پڑے گا کہ یہ چھوکرا پاگل ہے، خطرناک پاگل۔

بیرسٹر لال، مایا سے کہہ رہے تھے" تھینک یو، مس مایا۔" اور پھر وکیل مخالف کی طرف مڑ کر "آپ کا گواہ۔"

آشا نے کھڑے ہو کر مایا سے پوچھا۔" کیا یہ سچ ہے کہ گوتم آپ سے بہت محبت کرتا تھا۔؟"

"جی ہاں۔" مایا نے جواب دیا اور پھر ایک لمحے کے وقفے کے بعد۔ 'پاگلوں کی طرح۔'

مسٹر شرما نے معنی خیز نگاہوں سے رادھا کی طرف دیکھ کر گویا کہا۔" کیسی کار آمد گواہی دی ہے میرے اس گواہ نے؟"

آشا نے مایا کا جملہ دہرایا۔ 'پاگلوں کی طرح؟' مگر اب یہ ایک سوال بن گیا تھا۔

"جی ہاں۔" مایا نے بڑی شدّت سے کہا۔" وہ بیچارہ سچی محبت کرتا تھا۔ اسی کو لوگ آج کل پاگل پن کہتے ہیں۔" اور اب اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے" مگر اس پاگل پن کی قدر مجھے اُس وقت ہوئی جب وہ میری زندگی سے نکل گیا۔"

"مس مایا۔ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔" آشا نے جرح بند کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر بڑے خلوص کے ساتھ۔" تھینک یو، مایا!" کہا۔

مسٹر شرما اور رادھا بائی اور بیرسٹر لال صاحب کا چڑھا ہوا پارہ اُتر گیا۔

کورٹ کلرک نے اس بار دو نام ایک ساتھ پکارے۔" بھیکو چند۔ سوہن لال۔"

دونوں جیل کے پارٹنر ایک ساتھ کٹہرے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

جج نے حیرت سے چار ٹانگ کے گواہ کو دیکھا اور بیرسٹر صاحب سے سوال کیا۔" یہ دونوں گواہ آپ ساتھ میں پیش کریں گے۔؟"

بیرسٹر لال نے درخواست کی۔" یور ورشپ۔ پلیز۔ یہ دونوں ساتھ میں ہی گواہی دینا چاہتے ہیں۔"

بھیکو اور سوہن نے ساتھ ہی اپنی منڈیاں ہلائیں۔

جج صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔" آل رائٹ۔ ایز اے اسپیشل کیس۔" AS A SPECIAL CASE

بیرسٹر نے سوال کیا۔ ''تم لوگوں نے مسٹر گوتم چندرا کو پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا؟''
سوہن نے کہا: 'جیل میں سرکار' عدالت میں تعجب کی لہر دوڑ گئی۔
بھیکو نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ ''سرکار میں نے پہلے دن ہی سوہن سے کہہ دیا تھا اپنا گوتم سیٹھ بالکل پاگل ہے۔'' (مسٹر شرما بڑے اطمینان اور خوشی سے گواہی سن رہے تھے)
''اتنا پاگل حضور'' سوہن نے کہا: ''کہ جیل کے وارڈروں کو اُس نے کبھی رشوت دینے کی کوشش بھی نہیں کی۔''
گوتم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اب اُسے ان دونوں کے گواہوں کا اصل مقصد سمجھ میں آ رہا تھا۔
''بھیکو نے کہا۔'' سرکار۔ یہ گوتم سیٹھ پاگل نہیں ہوتا تو ہمارے جیسے چور اُچکوں کو اپنی فیکٹری میں نوکری دیتا؟''
سوہن نے لقمہ دیا ''اور ہمیں اپنے ساتھ بٹھا کر چائے پلاتا کیک کھلاتا؟''
بھیکو نے اُسے یاد دلایا۔ ''سمو سے تو تو بھول ہی گیا۔ وہ بھی تھے سرکار۔''
مسٹر شرما کا چہرہ غصے سے لال ہوتا جا رہا تھا۔ سوہن کے کہنے پر کہ۔ ''یہ گوتم سیٹھ بالکل پاگل ہے حضور۔'' بھیکو نے مسٹر شرما کا سارا بھانڈا ہی پھوڑ دیا۔ عین اُن کی طرف دیکھ کر یہ کہہ کے۔ ''سرکار۔ عقلمند آدمی تو جھوٹی گواہی کے لیے سوسو روپے کے نوٹ دیتے ہیں'' اور سر سے ٹوپی اُتار کر اندر رکھا ہوا سو کا نوٹ بھی جج کو دکھا دیا۔
سوہن نے مسٹر شرما کے زخم میں مرچیں بو دیں یہ کہہ کر: '' اور اس پاگل نے ہمیں ایک روپیہ بھی نہیں دیا۔''
اور بھیکو نے اپنی اور اپنے ساتھی کی گواہی کو بہت جذباتی سطح پر لا کر ختم کر دیا۔ ''سرکار۔ بھگوان کرے دُنیا میں سیٹھ بھائی جیسے دو چار پاگل اور پیدا ہو جائیں۔''
بیرسٹر لال جو آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے ایک دم کھڑے ہو کر چلّانے لگے۔ ''جناب والا۔ یہ دونوں جھوٹے ہیں، چور ہیں، جیب کترے ہیں گرہ کٹ ہیں، تالا توڑ ہیں۔ اور۔ اور—''
دونوں آپ کے گواہ ہیں۔'' آشا نے کھڑے ہو کر بیرسٹر صاحب کا فقرہ پورا کر دیا۔

بیرسٹر صاحب نے اس الٹی گواہی کا توڑ پیش کرنے کے لیے اپنے ایک نئے گواہ کا تعارف کرایا۔ ''جناب والا۔ اور اب میں ایک ایسا گواہ پیش کروں گا جس کی رائے دماغی بیماریوں کے بارے میں آخری اور قطعی سمجھی جاتی ہے۔''

کورٹ کلرک نے آواز لگائی۔ ''ڈاکٹر سیٹھی۔''

اب بیرسٹر صاحب نے کہا: ''ڈاکٹر سیٹھی۔ آپ نے مسٹر گوتم چندرا کو کب دیکھا تھا؟''

ڈاکٹر نے اپنی ڈائری دیکھ کر جواب دیا۔'' آٹھ دن ہوئے۔ اس مہینے کی سات تاریخ کو۔''

''اور دیکھنے کے بعد آپ نے کیا رائے قائم کی؟''

ڈاکٹر صاحب نے جواب انگریزی میں دینا مناسب سمجھا:

IT WAS AN ADVANCED CARE OF DEEP MELANCHOLIA PLUS SCHIZOPHRENIC ALICRITION TEADING TO ALIENATION FIRST OF AGGRESSIM AND SELF DISTRUCTION."

یہ سن کر تو جج، وکیل اور عدالت میں جتنے لوگ حاضر تھے سب اپنے سر کھجانے لگے۔

بیرسٹر نے کہا۔'' کیا آسان زبان میں اپنی رائے بتا سکتے ہیں؟''

''ڈاکٹر نے کہا۔ بھیانک اور بھینکر پاگل پن۔''

''روگی کو اسپتال میں رکھنا کیوں ضروری تھا؟''

''ایسی حالت میں وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ آتم ہتیا کر سکتا تھا۔ کسی کا خون کر سکتا تھا!''

''کیا ایسا روگی کروڑوں روپے کی بزنس کی دیکھ بھال کر سکتا ہے؟''

''ہرگز نہیں۔''

مسٹر شرما کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی مسکراہٹ!

بیرسٹر صاحب نے کہا۔'' تھینک یو ڈاکٹر'' اور آشا سے۔'' آپ کا گواہ۔''

آشا نے آرام سے کھڑے ہو کر پوچھا۔ ڈاکٹر سیٹھی۔ گوتم چندرا جی کو دیکھنے آپ کو کس نے بُلایا تھا؟''

''مسٹر شرما نے۔'' ڈاکٹر کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا اگر چہ یہ بات خود مسٹر شرما کو بہت پسند نہیں آئی۔

''اور فیس کتنی ملی تھی آپ کو؟''

''ایک ہزار روپے۔'' ڈاکٹر نے بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔ مگر بعد میں گڑ بڑا کر۔'' مگر اس کا کیس سے کیا تعلق ہے؟''

''تھینک یو، ڈاکٹر۔'' آشا نے کہا۔'' مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اور ڈاکٹر'' اگر۔ مگر'' کرتے ہوئے گواہوں کے کٹہرے سے باہر نکل گیا۔

بیرسٹر صاحب نے کھڑے ہو کر بڑی رعب دار آواز میں کہا۔'' یور ورشپ ہم نے گواہوں کی مدد سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ گوتم چندرا کو دماغی اسپتال میں رکھنا ضروری تھا۔ اُن کی جان کی خاطر۔ اُن کی بزنس کی خاطر "THATS ALL, YOUR WORSHIP"

بیرسٹر صاحب بیٹھ گئے تو جج نے آشا سے پوچھا۔'' مس پریم چند آپ کو کچھ کہنا ہے؟ کوئی گواہ پیش کرنا ہے؟''

''جی ہاں، یور ورشپ۔'' آشا نے کھڑے ہو کر کہا۔'' یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ بیماری گوتم چندرا کو ورثے میں اپنی ماں سے ملی ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک گواہ پیش کرنا چاہتی ہوں۔''

کورٹ کلرک نے اعلان کیا۔'' پاروتی دیوی۔'' مسٹر شرما اور رادھا بائی حیران اور پریشان رہ گئے۔ اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جیسے انہوں نے ایک مردہ کو زندہ ہوتے دیکھ لیا ہو۔

وہی بوڑھی سفید بالوں والی عورت جو آشا سے پاگل خانے میں ملی تھی اب اندر لائی جا رہی تھی۔

ماں نے بیس برس کے بعد اپنے بیٹے گوتم کو دیکھا۔ گوتم نے ماں کو پہلی بار دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

آشا اب اپنے گواہ کا تعارف کراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔'' جناب والا جن لوگوں نے مسٹر گوتم چندرا کو پاگل بنایا ہے اُن ہی لوگوں نے اس بیچاری کو پاگل خانے میں ڈال رکھا تھا۔ رادھا بائی نے اپنی گواہی میں کہا ہے کہ گوتم کی ماں مر چکی ہیں تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ پھر یہ کون ہیں؟'' اور اُس نے گواہوں کے کٹہرے کی طرف اشارہ کیا۔

بیرسٹر فوراً اُچک کر کھڑا ہو گیا۔ ''یور ورشپ۔ یہ ایک پاگل عورت ہے اور قانون ایک پاگل عورت کی گواہی کو مان نہیں سکتا۔''

جج نے آشا سے سوال کیا: ''مس پریم چند۔ کیا یہ سچ ہے کہ تمھاری گواہ اس وقت پاگل خانے سے لائی گئی ہے۔''

آشا بڑبڑا کر بولی۔ ''جی— جناب— مگر وہ—''

جج نے انگریزی میں کہا۔ " I AM SORRY MISS PREM CHAND"

OBJECTION SUSTAINED بیرسٹر لال کا اعتراض قانوناً بالکل صحیح ہے۔ ہم ان کی گواہی نہیں سن سکتے۔ جب تک اِن کے پاس MENTAL FITNESS کا سرٹیفکیٹ نہ ہو۔'' اور پھر نرس سے مخاطب ہو کر جو پاروتی دیوی کے ساتھ آئی تھی۔ ''نرس، ان کو آرام سے لے جایئے یہاں سے۔''

گوتم کی ماں جج صاحب سے، اپنے بیٹے گوتم سے— بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، سننا چاہتی تھی، لیکن وہ عدالت سے واپس لے جائی گئی اور پاگل خانے کے ایک الگ کمرے میں بند کر دی گئی۔

اب آشا کی آواز غصے سے کانپنے لگی۔ اس نے کہا: ''یور ورشپ مسٹر گوتم چندرا کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہوئی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے روپے اور جائیداد کو غریبوں کے فائدے کے لیے استعمال نہ کر سکیں اور اُس سے پہلے کہ یہ لوگ (مجھے) پاگل ثابت کر کے میرا بھی منہ بند کر دیں میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ چندرا انٹر پرائزز کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کی آخری میٹنگ میں مسٹر گوتم چندرا نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے تمام شیرس بیچ کر اپنی ساری دولت سے بچّوں کا ایک اسپتال کھولنا چاہتے ہیں۔''

بیرسٹر لال بھی غصے میں سچ مچ لال ہو کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر بڑے زور سے کہنے لگے۔ ''یور ورشپ۔ یہ سب ایک فرضی کہانی ہے۔ مجھے مسٹر شرما نے بتایا ہے کہ نہ ایسی کوئی میٹنگ ہوئی نہ مسٹر گوتم چندرا نے کوئی تجویز پیش کی۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید مسٹر گوتم چندرا کے بیمار دماغ نے کوئی سپنا دیکھا ہے۔ پاگل پن اسی کو کہتے ہیں جب انسان سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ سمجھنے لگتا ہے۔''

دونوں وکیلوں کی اونچی اونچی آوازوں سے جج صاحب بھی بوکھلا گئے۔ کس کی بات مانیں کس کی نہ مانیں؟ آشا کو سمجھاتے ہوئے انھوں نے کہا: ''مس پریم چند آپ بہت بڑا الزام لگا رہی ہیں۔ آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے کہ ایسی کوئی میٹنگ ہوئی تھی اور اُس میں گوتم چندرا نے ایسی کوئی تجویز پیش کی تھی۔''

آشا نے سامنے رکھی ہوئی میز پر گھونسہ مار کر کہا: ''ثبوت پیش کرنے کے لیے مجھے وقت چاہیے۔''

اور جج صاحب نے اپنے قانونی ہتھوڑے کو میز پر پیٹتے ہوئے کہا: ''مقدمہ کل کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے۔''

○

......میں کہتا دنیا کو پاگل!

پاگل خانے کے ایک کمرے میں گوتم آشا سے کہہ رہا تھا: ''مقدمہ ملتوی نہیں ہوا ہم مقدمہ ہار گئے۔''

آشا نے یوں جواب دیا: ''یوں کھو اتنی جلدی ہمت ہار گئے۔ ابھی تو تم نے دُنیا سے مقابلہ کرنا شروع کیا ہے۔''

''میں تو یہاں اس لیے آیا تھا'' گوتم نے کہا: ''کہ تم اس معاملے کو کورٹ میں لے جاسکو گی۔''

''تو تم نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ مقدمہ عدالت میں آ گیا۔ کتنے ہی لوگوں نے تمھارے حق میں گواہی دی۔ سوہن نے، بھیکو نے، یہاں تک کہ مایا نے بھی۔''

''میں اُن سب کا ابھاری ہوں۔'' گوتم بڑے جذباتی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''مگر بھری عدالت میں میری ماں کا کتنا اپمان ہوا۔ اُنہیں پاگل کہہ کر نکال دیا گیا۔'' پھر آشا سے کہنے لگا۔ ''تم نے پوری کوشش کر لی۔ اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ شاید میں سچ مچ ہی دیوانہ ہوں ممکن ہے یہ بورڈ میٹنگ بھی میرے پاگل دماغ میں ہوئی ہو۔''

آشا پورے وشواس کے ساتھ بولی: ''نہیں گوتم تم پاگل بالکل نہیں ہو۔ یہ سب اُن لوگوں کی سازش ہے۔'' پھر کچھ سوچ کر۔ ''اُس میٹنگ کا ضرور کوئی رکارڈ ہوگا۔''

''میٹنگ ہوئی ہوگی تو رکارڈ بھی ضرور ہوگا۔'' گوتم نے جواب دیا۔''ہر میٹنگ کا پورا حال نیلے رنگ کی MINUTES BOOK میں لکھا ہوتا ہے۔'' مگر پھر مایوس ہوکر۔''مگر کمپنی کے ایسے سب ضروری کاغذات مسٹر شرما کے کمرے کی لوہے کی الماری میں بند رہتے ہیں۔''

اب آشا کو دور کی کوڑی سوجھی:''یہ بتاؤ۔ وہ سوہن جو تمھارے ساتھ جیل میں تھا۔ کیا جرم کیا تھا اُس نے؟''

گوتم کو جواب دینا پڑا:''سوہن نے کسی بینک کی سیف کا تالا توڑا تھا۔''

سوہن واقعی تالا توڑ تھا۔ اُس کے چھ پھل کے چاقو کی ایک نوک ہی اندر گئی تھی کہ ایک ہلکی سی کڑک کی آواز آئی اور لوہے کی الماری کا تالا کھل گیا۔

بھیکو اُسے ٹارچ کی لائٹ دکھا رہا تھا بول اُٹھا۔''ارے واہ تو تو کمال کا ہے، یار۔''

''اپن کا پُرانا دھندا ہے، پارٹنر۔'' سوہن نے بڑے رعب داب سے الماری کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔ اُس کے اندر فولاد کا ایک اور چور خانہ تھا۔ اُس کے تالے میں اپنے اوزار کو پھنساتے ہوئے سوہن بولا''مگر یار بھیکو۔ میں نے سیٹھ بھائی سے قسم کھائی تھی کہ اب یہ کام کبھی نہیں کروں گا۔''

بھیکو نے اسے اطمینان دلایا۔ ارے یہ کام بھی تو ہم سیٹھ بھائی کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ تو کھول۔''

اور اُس وقت اندر کے خانے کا پٹ بھی کھل گیا۔

ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی تو دیکھا کئی جلد بندھے رجسٹر سے رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کو سوہن نے اُٹھایا تو دیکھا کہ نیچے سو سو، بیس بیس، دس دس کے نوٹوں کی کتنی ہی تھپیاں رکھی ہوئی ہیں۔ سوہن اور بھیکو کی تجربہ کار نگاہوں نے اندازہ لگایا کہ کم سے کم بیس پچیس ہزار روپے ہوں گے۔

سوہن نے سو سو کے نوٹوں کی چار پانچ گڈیاں اُٹھاتے ہوئے کہا:''کھو یار کر دوں پار؟''

بھیکو بولا:''نہیں نہیں یار۔ وہ دیکھ رہا ہے۔''

سوہن نے ڈر کے مارے پوچھا:''کون؟''

بھیکو نے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چپکے سے کہا:''بھگوان!''

''تم ٹھیک بولتا ہے'' سوہن نے نوٹ واپس رکھتے ہوئے کہا۔ برا کام چھوڑ دیا تو چھوڑ دیا۔
اب تینوں رجسٹر بھیکو کے ہاتھ میں دیکھ کر سوہن بولا: ''ذرا تو دیکھ کون سا چوپڑی چاہیے۔ اپن کو تو لکھنا پڑھنا آوے نہیں۔''
بھیکو نے رجسٹروں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک پر جو لیبل لگا تھا اُس کو اٹک اٹک کر پڑھا'' بورڈ آف ڈائریکٹرس......ار......ہاں— یہ نیلی والی ہے۔''

اور اب یہ ہی نیلا رجسٹر آشا کے ہاتھ میں تھا اور آشا عدالت میں تھی اور اپنی جگہ پر کھڑی بڑے زور سے کہہ رہی تھی۔ ''جناب والا۔ یہ ہے ثبوت کہ میٹنگ ہوئی ہے۔ اور اس میں گوتم چندرا نے اپنے شیرس کے روپے سے اسپتال کے لیے ٹرسٹ بنانے کی تجویز پیش کی۔ یہ ہے اُس سازش کی بنیاد جو مسٹر شرما، رادھا بائی اور ڈائریکٹروں نے گوتم چندرا کو پاگل ثابت کرنے کے لیے تیار کی۔''
مسٹر شرما کے اشارے پر بیرسٹر صاحب اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔
''جناب والا۔ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک سازش کا ثبوت عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔''
''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' جج نے پوچھا۔
بیرسٹر صاحب نے آشا کی طرف دیکھتے ہوئے: ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مس آشا پریم چند گوتم چندرا سے پریم کا ناٹک کھیل رہی ہیں......''
گوتم نے مسکرا کر سوچا۔ ''بیرسٹر صاحب! آپ کو کیا معلوم اُس ناٹک میں کتنی گمبھیر اصلیت ہے!''
آشا نے سوچا: ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب وکیل بھی فلمی اخباروں کی طرح لوگوں کی ذاتی زندگی کو عدالتوں میں گھسیٹنے لگے ہیں۔''
اور بیرسٹر صاحب کا بیان جاری تھا۔ ''مس پریم چندرا ایک بھولے بھالے مگر کمزور دماغ کے نوجوان سے شادی کر کے اُس کی لاکھوں کی جائیداد کی مالک بننا چاہتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مس آشا پریم چندرا کو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے۔''

''مس پریم چندرا۔'' جج نے سوال کیا۔'' کیا آپ گواہی دینے کے لیے تیار ہیں؟''

''جی ہاں، جناب والا۔'' آشا نے کہا۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ پھر کچھ خیال آیا۔ ایک وکیل گواہی نہیں دے سکتا۔ اُس نے اپنے کندھوں سے کالا گاؤن اُتار ڈالا۔ بیرسٹر صاحب کی بازاری باتوں کے بعد جیسا کالا گاؤن وہ پہنے ہوئے تھے ویسا ہی گاؤن پہنے اب آشا کو شرم آنے لگی تھی۔ جیسے نڈر انقلابی کندھے سیدھے کر کے پھانسی کے تختے پر چڑھ جاتے ہیں اُسی شہیدانہ انداز سے، اپنی صلیب آپ اُٹھائے، وہ گواہوں کے کٹہرے کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے کیا گندگی اُچھالی جائے گی مگر اُس کی آنکھوں میں کوئی خوف، کوئی ڈر نہیں تھا۔

بیرسٹر صاحب نے بڑے ملائم انداز میں کہا: مس پریم چند۔ آپ یہ کہتی ہیں کہ آپ گوتم چندرا سے محبت کرتی ہیں؟''

بیرسٹر کا خیال تھا کہ آشا اس بیان کو جھٹلائے گی یا جواب دینے سے انکار کرے گی یا کہے گی کہ مخالف وکیل کو ایسے سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن جو جواب ملا، اُس کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔

آشا نے کہا۔'' میں یہ کہتی نہیں!'' اور پھر گوتم کی طرف دیکھ کر:'' میں اُن سے محبت کرتی ہوں۔''

بیرسٹر نے قانونی پینترہ بدل کر دوسرا وار کیا:'' آپ کو آزاد اخبار سے تنخواہ کیا ملتی ہے؟''

آشا نے توقف کے بغیر جواب دیا۔'' پانچ سو پچیس روپے ماہوار۔''

بیرسٹر صاحب کی جرح جاری تھی'' اور جس وقت آپ کو محبت کا بخار چڑھا اُس وقت مسٹر گوتم چندرا کی جائیداد کی مالیت کتنی ہوگی۔؟''

آشا کو معلوم تھا کہ انھوں نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔ اُس نے چڑ کر جواب دیا۔'' مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی اُن کی جائیداد میں۔''

''دلچسپی تھی یا نہیں اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔'' بیرسٹر صاحب کی گرج دار آواز کورٹ میں گونجی اور پھر میٹھے اور ٹھنڈے مگر زہریلے انداز میں کہا،'' اس جائیداد کی مالیت کے بارے میں کچھ اندازہ تو ہوگا آپ کو؟''

''اب آشا کو جواب دینا ہی پڑا۔'' کہا جاتا ہے پچاس ساٹھ لاکھ سے زیادہ کی جائیداد ہے۔''

بیرسٹر صاحب نے فوراً آشا کے اس بیان سے فائدہ اُٹھایا "سو جب آپ نے مسٹر گوتم چندرا سے محبت کی تو آپ کو معلوم تھا کہ وہ بہت امیر آدمی ہے۔ آپ سے کئی سو گنا امیر آدمی؟"

"جی ہاں" آشا نے گڑ بڑا کر کہا "مگر۔" وہ کہنا چاہتی تھی کہ محبت کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ ایک دوسرے کے پاس کتنا روپیہ ہے۔"

مگر بیرسٹر کی گونجتی ہوئی آواز نے اُسے موقع ہی نہیں دیا۔

"جناب والا۔ کچھ دیر پہلے مس آشا پریم چندر سازش اور CONSPIRACY کی بات کر رہی تھیں۔ یہ ہے وہ اصل سازش۔ ایک غریب مگر چالاک لڑکی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر کمزور دماغ کے امیر نوجوان کی جائیداد کی مالک بننا چاہتی ہے۔......"

اب آشا سے نہ رہا گیا۔ وہ چلاّ پڑی۔ "یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے۔ آپ میری عزت پر، میری محبت پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور بیرسٹر صاحب بڑے اطمینان کے ساتھ کیونکہ اُن کا کام تو ہو چکا تھا ایک ہلکی سی زہریلی سی کامیاب مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہے تھے: "بس مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور آشا گواہوں کے کٹہرے سے گزر کر گوتم کے سامنے سے ہوتی ہوئی اپنی کرسی کی طرف جا رہی تھی۔ گوتم کا جی چاہا اُسے روک لے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی محبت کا، اپنی وفاداری کا یقین دلائے اُس کو دلاسہ دے تسکین دے مگر وہ جانتا تھا کہ عدالت میں کوئی ایسی بات کرنا خلاف قانون ہوگا۔ اُس نے سوچا۔ قانون بیرسٹر صاحب کو آشا کے دل میں زہریلے نشتر چبھونے کی اجازت دے سکتا ہے، ایک پاکباز عورت پر گندگی اُچھالنے کی اجازت دے سکتا ہے لیکن یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی کسی کے زخمی دل پر پیار کا پھایہ رکھ سکے۔

اس سوچ میں گوتم نے یہ بھی نہیں سنا کہ جج صاحب اُس سے کچھ کہہ رہے ہیں۔

جب انھوں نے دوبارہ پوچھا: "مسٹر گوتم چندرا آپ کو کچھ کہنا ہے؟" تو اُس کا سر ہلا کر انکار کرنے کو بھی نہیں چاہا۔ اس عدالت کی کارروائی میں حصہ لینے سے فائدہ بھی کیا؟ اس نے سوچا۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ چپ ہی رہا جائے۔ فیصلہ تو بہر حال میرے خلاف ہی جانے کو ہے۔ اُس کے دل میں تو کہنے کو بہت کچھ تھا۔ سوچا تھا یہ کہوں گا وہ کہوں گا۔ مگر (پھر اُس نے

سوچا) فائدہ کیا؟

اور پھر اُس کے کانوں میں ایک جانی بوجھی بچکانی آواز آئی: ''گوتم بھیا! دیدی! ڈاکٹر نے میری ٹانگوں کا پلاسٹر اُتار دیا ہے۔ دیکھو اب میں چل سکتا ہوں۔!''

اُس نے، آشا نے، جج صاحب نے، عدالت میں ہر آدمی نے، مڑ کر دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بچّہ نیکر اور شرٹ پہنے، موزے اور جوتے پہنے چلا آ رہا ہے۔ اگلے لمحے گوتم اُسے گلے لگا رہا تھا۔ انیل کے بدن کی نرمی اور گرمی سے گوتم کی روح کو جیسے ایک سہارا مل گیا ہو۔ روتی ہوئی آشا بھی بھائی کو دیکھ کر مسکرا دی۔

جج صاحب نے ایک بچّے کے چلّانے کی آواز کو عدالت کی کارروائی میں مداخلت قرار دیا۔'' آرڈر! آرڈر!'' اُن کا ہتھوڑا دوبارہ میز پر پڑا۔'' یہ کون بچّہ ہے؟ اس کو کورٹ سے باہر لے جاؤ۔'' تب انھوں نے دیکھا کہ گوتم جواب تک خاموش بیٹھا تھا کھڑا ہو کر کچھ کہہ رہا ہے۔

''جناب والا۔ اس بچے کو کچھ مت کہیے۔'' انیل کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔'' اس بیچارے کی ٹانگیں میری موٹر سے کچل گئی تھیں۔ اس کی وجہ سے میری زندگی میں پریورتن آیا اور آج اگر میں کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں تو صرف اس کے کارن۔''

جج صاحب نے ایک پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے کہا: ''اجازت ہے۔''

گوتم نے انیل کو سلیم چاچا کے سپرد کیا جو اُس کو ساتھ لے کر سیدھے اسپتال سے یہاں آئے تھے اور آشا کی طرف ایک نظر دیکھ کر گواہوں کے کٹہرے کی طرف چلنے لگا۔ اُس کی ماں کو بولنے نہیں دیا گیا تھا۔ آج اُسے موقع ملا ہے تو وہ سب کچھ کہہ ڈالے گا جو اُس کے من میں تھا۔

''جناب والا۔'' گوتم نے مسٹر شرما، آنٹی رادھا بائی اور بیرسٹر کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔'' اِن لوگوں کا کہنا ہے کہ میں پاگل ہوں اس لیے کہ میں پرانا باجا بجاتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کوئی بھی باجا بجانا نہ پاپ ہے نہ جرم اور نہ ہی پاگل پن کی کوئی نشانی ہے۔ جب بھی آدمی بہت خوش ہوتا ہے یا پریشان ہوتا ہے یا کسی بات پر بہت سوچ بچار کرتا ہے تو اپنے دماغ کے سہارے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ کوئی باجا بجاتا ہے۔''

اب اُس نے خاص طور سے مڑ کر مسٹر شرما کی طرف دیکھ کر کہا: ''اور کوئی مونچھیں مروڑتا ہے۔''

جج صاحب دیکھ کر مسکرا دیے کہ مسٹر شرما نے جو اُس وقت مونچھیں ہی مروڑ رہے تھے، جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

گوتم نے کہا! ''کوئی گیت گنگناتا ہے اور کوئی پنسل چباتا ہے۔'' اور بیرسٹر صاحب کی طرف دیکھا جو حسبِ معمول اُس وقت بھی لال رنگ کی پنسل چبا رہے تھے۔ انھوں نے گھبرا کر پنسل منہ سے باہر نکال لی۔

جج صاحب یہ دیکھ کر پھر مسکرا دیے اور بے خیالی میں پیپر ویٹ کو بلاٹنگ پیڈ پر لٹو کی طرح گھما دیا۔

اور گوتم نے اب جج صاحب کی میز کی طرف دیکھ کر کہا: ''اور کوئی پیپر ویٹ کو لٹو کی طرح گھماتا ہے...... جیسے معاف کیجیے گا اس وقت آپ کر رہے ہیں۔'' جج صاحب نے کھسیا کر گھومتے ہوئے پیپر ویٹ کو تھما دیا۔

اب گوتم کے چہرے پر سے طنزیہ مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اُس کی جگہ ایک سنجیدہ اور جذباتی تاثر اُبھر آیا۔ ''مگر یہ باجا صرف باجا ہی نہیں۔ یہ میرا بچپن ہے۔ یہ میری ماں کی نشانی ہے۔ یہ میری غریب ماں نے مجھے پانچویں سالگرہ پر دیا تھا۔ جس کے دو دن بعد ہی مجھے اُس کی گود سے چھین کر دولت کی گود میں ڈال دیا گیا۔ میرے باپ تو پہلے ہی میرے دادا کی ایک ٹرک کے نیچے آ کر اپنی جان دے چکے تھے (اب اُس کی آواز غصّے سے اونچی ہوتی جا رہی تھی) مجھے کہا گیا تھا کہ میری ماں نے پاگل پن میں اپنے کپڑوں کو آگ لگائی تھی مگر مجھے معلوم ہوا کہ وہ نہ مری تھی نہ پاگل ہوئی تھی بلکہ اُنہیں جھوٹ موٹ پاگل بنا کر پاگل خانے میں بند کرا دیا گیا تھا۔''

جج صاحب گوتم کا بیان بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ اُن کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک بڑی دردناک اور ڈرامائی کہانی اُن کے سامنے سنائی جا رہی ہے۔ گوتم جو جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا اب سانس لینے کے لیے رُکا اور اُس کی آواز میں پھر طنز کی کڑواہٹ آ گئی۔ ''جنابِ والا۔ میں پہلے بھی ہاتھ چھوڑ کر موٹر چلاتا تھا۔ پہلے بھی ماؤتھ آرگن بجاتا تھا۔ پہلے بھی کٹ تھروٹ ریزر سے شیو کیا کرتا تھا۔ تب کسی کو خیال نہیں آیا کہ میں پاگل ہوں۔ اس لیے کہ میری آمدنی کا بڑا

حصّہ اُن لوگوں کی جیبوں میں جاتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میری بزنس کو اپنے ڈھنگ سے اور اپنے کالے دھندے کے فائدے کے لیے چلائیں۔ گورنمنٹ کو اور شیئر ہولڈرس دونوں کو دھوکہ دیں لیکن جب میں نے اُن کے ہت کنڈے جان لیے اور بزنس کو اُن کے ہاتھوں سے لے کر سارا منافع اور اپنے شیرس کی ساری قیمت ایک بچّوں کے اسپتال کو دان کرنے اور اُس کا ٹرسٹ بنانے کا ارادہ کیا۔ تب میں اُن کو پاگل نظر آنے لگا۔.....''

اُس کی آواز بہت اونچی ہوگئی تھی: اس لیے کہ اُسے مسٹر شرما اور بیرسٹر صاحب اپنے دشمن اور اُس طاقت کے نمائندے نظر آرہے تھے جو اُس کو اپنا انسانی فرض ادا کرنے سے روکنے پر تلی ہوئی تھی۔

مگر اب اُس نے اپنی نگاہیں اپنی پھوپی یعنی رادھا بائی کے اوپر جمادیں جو اپنی سفید سلک کی ساڑی میں لپٹی ہوئی '' آدرش بھارتیہ استری'' کا روپ بنی بیٹھی تھیں۔'' مجھے افسوس ہے کہ ان لوگوں میں میرے پتا جی کی چھوٹی بہن بھی شامل ہیں جن کو میں نے بچپن سے آج تک اپنی ماں کی جگہ سمجھا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ کیکئی جیسی ماں ثابت ہوئیں۔ فرق صرف اتنا ہے کیکئی نے رام کو بن باس دیا اور انھوں نے گوتم کو پاگل خانہ۔''

اُس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔ اُس میں وہ غصہ اور کڑواہٹ جھلکنے لگی جو اُسے جیل میں کامریڈ کرانتی سے ملی تھی۔

''بیرسٹر صاحب کو، اُن کے گواہوں کو، اور ممکن ہے کہ آپ کو بھی میں اس وقت پاگل نظر آتا ہوں مگر حضور مجھے تو یہ دُنیا ہی پاگل نظر آتی ہے۔ جہاں ایک آدمی اکیس کمروں میں رہتا ہے اور اکیس آدمی ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ جہاں کتّوں کو سنگ مرمر کے ٹب میں نہلایا جاتا ہے اور لاکھوں آدمی دو بوند پانی کو ترستے ہیں۔''

''یہ دُنیا جہاں ایک ایٹم بم بنانے پر اتنے کروڑ روپے خرچ کیے جاتے ہیں جن سے ہزاروں اسپتال اور اسکول بنائے جاسکتے تھے۔ کروڑوں بھوکے بچّوں کو دودھ پلایا جاسکتا تھا!''

اب اُس کی نظر جج اور وکیلوں اور عدالت سے بہت دور کے اُفق پر تھی۔

''یہ دُنیا جہاں انسان نے کروڑوں اربوں روپے خرچ کر کے زمین سے چاند تک کی سڑک

بنائی ہے لیکن ایسی کوئی سڑک آج نہیں بنا سکا جو ایک انسان کے دل سے دوسرے انسان کے دل تک جاتی ہے۔"

اور پھر اُس نے پیار بھری نظروں سے آشا کی طرف دیکھا اور جج سے دھیمی آواز میں کہا۔

"زمین اور آسمان کا فاصلہ کم ہوگیا ہے لیکن انسان اور انسان میں فاصلہ کم نہیں ہوا جناب والا۔"

اب وہ بولتے بولتے تھک گیا تھا۔ آواز بھی مشکل سے نکلتی تھی۔ جج کی طرف دیکھ کر اُس نے کہا:

"اب آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ پاگل کون ہے؟ میں یا یہ دُنیا۔ تھینک یو یور ورشپ۔" اور ادب کے ساتھ جھک کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا گواہوں کے کٹہرے سے نکل گیا۔

آشا کی نگاہیں کہہ رہی تھیں: "شاباش گوتم، شاباش" مگر گوتم خود مایوس تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اُس نے اتنی بک بک کر کے اپنا مقدمہ خراب کر لیا تھا اور جج صاحب کو یقین ہو گیا ہوگا کہ وہ واقعی پاگل ہے۔

اب تو ساری عدالت۔ آشا، بھیکو، موہن، سلیم چاچا، انیل اور دوسری طرف بیرسٹر، مسٹر شرما اور رادھا بائی۔ جج صاحب کے فیصلہ کی بے چینی اور گھبراہٹ کے ساتھ منتظر تھی۔

مگر جج صاحب نے جذبات سے خالی اپنا قانونی چہرہ لگا لیا۔ اُن کے انداز سے بلکہ اُن کے شروع کے الفاظ سے بھی یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا فیصلہ گوتم کے حق میں ہوگا کہ اُس کے خلاف۔ اُس کی آزادی واپس مل جائے گی یا اُسے پاگل خانے واپس بھیج دیا جائے گا؟ وہ اپنی دولت سے بچوں کے لیے اسپتال بنا سکے گا یا وہ دولت مسٹر شرما اور رادھا بائی جس طرح چاہیں گے استعمال کریں گے؟ جج صاحب نے فیصلہ سنانا شروع کیا۔

"اس عدالت میں جو گواہیاں ہوئی ہیں اور جو بیان دیے گئے ہیں اُن سب پر سوچ بچار کرنے کے بعد اس عدالت کا فیصلہ ہے کہ مسٹر گوتم چندرا پاگل ــــ (پھر وہ رُک گئے۔ تب جا کر فقرہ پورا کیا) بالکل نہیں ہیں۔ وہ شاید اس پوری عدالت میں سب سے زیادہ سمجھ دار آدمی ہیں اگر کوئی اُن کو پاگل کہتا ہے تو اس پاگل دُنیا کو کتنے ہی اور ایسے پاگلوں کی ضرورت ہے۔"

عدالت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تالیاں بجنے لگیں۔ آشا کے چہرے پر فتح کے احساس کی

مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بھیکو اور سوہن تو پیاں اُچھالنے لگے اور کمال یہ تھا کہ جج صاحب نے ایک بار پھر آرڈر۔آرڈر،'' نہیں کہا۔ بیٹھے مسکراتے رہے صرف جب انھوں نے شرما اور رادھا بائی کو اُٹھتے ہوئے دیکھا تو ڈانٹ کر کہا:'' مسٹر شرما، آپ کدھر جا رہے ہیں بیٹھ جایئے۔ عدالت ابھی برخواست نہیں ہوئی، فیصلہ ابھی پورا نہیں سنایا گیا۔ عدالت حکم دیتی ہے کہ چندرا انٹر پرائزز کے حساب کتاب کی پوری پوری جانچ کی جائے اور مسٹر شرما اور رادھا بائی پر جھوٹی گواہیاں پیش کرنے کے لیے مقدمہ چلایا جائے۔''

عدالت سے نکل کر آشا نے گوتم سے کہا:'' چلو گوتم—ماں جی کے پاس چلیں۔ اب ماں اور بیٹے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہا۔''

جیل خانے کے وارڈ میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جب کامریڈ کرانتی نے اخبار پڑھ کر دوسرے قیدیوں کو بتایا:'' ارے ہمارا گوتم پاگل سماج کی قید سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا ہے۔''

سورج نکلا ہی تھا......

ایک نیا دن شروع ہوا ہی تھا کہ پاگل خانے کا دروازہ کھلا اور اندر سے گوتم اپنی ماں کو ساتھ لیے ہوئے باہر نکلا اُس کے ساتھ ہی اُس کی آشا بھی تھی جو ماں کو سہارا دیئے ہوئے تھی اور دوسری طرف اُس کا بھائی انیل بھی تھا۔

انیل۔

آشا۔

گوتم۔

گوتم کی ماں جو بیس برس کے بعد آزادی کی، انسانیت کی، ہمدردی اور محبت کی ہوا میں سانس لے رہی تھی۔

ان کے لیے یہ زندگی کے سفر کا ختم نہیں تھا یہ ایک نئی شروعات تھی۔

واقعی اُن کے لیے ایک نیا دن شروع ہو رہا تھا۔

O

تین پہیے

یہ ناولٹ ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ جی ٹی روڈ شاہدرا دہلی۔32 سے شائع ہوا۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن یہی ناولٹ ''تین پہیے، ایک پُرانا ٹب اور دنیا بھر کا کچرا'' کے عنوان سے ماہنامہ شاعر بمبئی کے ناولٹ نمبر 1971 میں بھی شریکِ اشاعت ہے۔

تین اونچے نیچے پہیے

(1)

بھیکو نے خالی کھنارے کو دھکیلتے ہوئے سوچا۔ میری زندگی بھی اسی کھنارے کی طرح ہی تو ہے جس کو بمبئی بھر میں گھسیٹتا پھرتا ہوں — جوہو سے باندرہ، دادر، ورلی، گرگام ہُوراس روڈ، محمد علی روڈ۔ کالبا دیوی ہوتے ہوئے میرین ڈرائیو تک، جہاں بلڈنگیں شاندار ہیں اور سمندر کی ہوا خوشگوار — پھر بھی شام کو ان کوڑے کے بدبودار ڈھیروں کے کنارے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں ہی لوٹ کر آنا پڑتا ہے۔ دن بھر میں جتنا کچرا اکٹھا ہوا — ٹین کے پرانے ڈبے، خالی بوتلیں، ردّی کاغذ، موٹروں کے ٹوٹے پھوٹے کل پرزے — اس کا سودا کچرا والا سیٹھ سے کرتا ہوں۔ جو شام کا اندھیرا ہونے تک اپنی لمبی کالی موٹر میں بیٹھا سب کھنارے والوں کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ کام کی چیز کوئی نظر پڑ گئی تو اس نے پانچ کا نوٹ دکھا دیا ورنہ روپے دو روپے میں کھنارا خالی کروالیا اور پھر اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلا گیا۔

کالینہ اور کرلا کے بیچ کا یہ سارا میدان کچرا والا سیٹھ کا تھا — اس پر پڑی ہوئی کوڑے کی ڈھیریاں بھی اس کی تھیں۔ پرانے زنگ لگے ہوئے لوہے اور ٹین کے انبار بھی اُسی کے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی موٹروں کی باڈیز جن میں انجن نہیں تھے اور پہیے نہیں تھے وہ بھی کچرا والا سیٹھ کی تھیں۔

بھیکو کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ سیٹھ ان سب بے کار چیزوں کا، ان بدبودار کوڑے کے ڈھیروں کا کیا کرتا ہے۔ مگر کوئی دھندا تھا ضرور ہر دوسرے تیسرے دن بڑی بڑی ٹرکیں آتی تھیں

اور کاٹھ کباڑ اٹھا کر لے جاتی تھیں اور ان کی جگہ بھیکو جیسے سینکڑوں کھٹارے والے شہر بھر سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کچرا لاتے رہتے تھے اور سیٹھ کو روپے دو روپے پانچ روپے کے عوض بیچتے رہتے تھے اور پھر قریب ہی تاڑی خانے میں جا کر (جو کچرا والا سیٹھ ہی کا تھا) تاڑی پیتے تھے یا ٹھرے کی نوٹا تک چڑھاتے تھے اور جب وہ نشے میں دھت ہو جاتے تھے تو اپنی اپنی جھونپڑیوں میں اپنی بیویوں کے پاس جا کر سو جاتے تھے اور کبھی کبھی نشے کی حالت میں اور اندھیری جھونپڑیوں میں کبھی بھول سے اور کبھی جان بوجھ کر بیویوں کی ادلا بدلی بھی ہو جاتی تھی لیکن اُس سب پر رات کے اندھیرے کا پردہ پڑا رہتا تھا اور کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا تھا اور نہ شکایت کرتا تھا۔

یہ سب جھونپڑیاں کوڑے کے ڈھیروں سے گھری ہوئی تھیں اور ان کی بدبو کو بغیر تاڑی یا ٹھرا پیے ہوئے کوئی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ تب ہی تو کھٹارے والوں کو جو کچھ سیٹھ سے ملتا تھا اس میں سے آدھا تو دارو خانے کے ذریعے سے پھر سیٹھ کی جیب میں پہنچ جاتا تھا۔ باقی جو بچتا تھا اس میں سے بھی کافی حصہ جھونپڑیوں کے کرائے کی شکل میں سیٹھ کے آدمی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو وصول کر لیتے تھے۔

یہ تین اونچے نیچے پہیوں کا کھٹارا بھی سیٹھ کا ہی تھا جس کا کرایہ پانچ روپیہ مہینہ پر کھٹارے والے کو دینا پڑتا تھا۔ تب ہی تو بھیکو سوچ رہا تھا کہ اس کی زندگی بھی اس کھٹارے کی طرح ہے جس کو دھکیلتا وہ ہے مگر جس کا مالک اور مختار کچرا والا سیٹھ ہے۔

اس کھٹارے کے تین پہیے ہیں بھیکو نے سوچا۔ مگر تینوں الگ الگ سائز کے۔ دائیں کو ایک بڑا پہیہ ہے۔ شاید کسی موٹر کا ہٹا ٹائر کا زنگ لگا ہوا پہیہ ہے جو کئی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے۔ بائیں کو ایک اسکوٹر کا چھوٹا سا پہیہ ہے جس کا ٹائر شاید کسی کی غلطی سے اب تک سلامت ہے اور سامنے سب سے چھوٹا پہیہ لگا ہے جو کسی بچے کی ٹرائسکل سے چرایا ہوا ہے۔

(2)

اسی طرح میری زندگی کے بھی تین پہیے ہیں۔ بھیکو نے کھٹارے کو دھکیلتے ہوئے سوچا۔ یہ دائیں طرف کا ٹوٹا، زنگ لگا ہوا پہیہ تو میں خود ہوں۔ کبھی میں بھی آدمی تھا، جوان تھا، اپنے آپ کو خوب صورت سمجھتا تھا۔ فلموں میں ہیرو بننے کے خواب دیکھتا تھا تو وہ سپنے چکنا چور ہو گئے تھے۔

کبھی اسٹوڈیو کے گیٹ کی فولادی سلاخوں سے اُلجھ کر، کبھی فٹ پاتھ کے بے رحم پتھروں پر گر کے، کبھی کارخانوں کی اونچی دیواروں پر لگے ہوئے 'کوئی جگہ خالی نہیں' کے بورڈوں سے ٹکرا کر۔

بیکار سے بے گار بھلی۔ مگر آزادی کے اس دور میں کون کسی سے بیگار کام کرا سکتا ہے؟ ہاں ان سنگدل شہروں میں بیکاری سے چوری بہتر ہے، جیب کاٹنا بہتر ہے۔ آنکھوں میں پسی ہوئی مرچیں جھونک کر یا چاقو دکھا کر دن دہاڑے لوٹ لینا تو بہت ہی بہتر ہے اور قید ہو جائے تو سب سے بہتر ہے۔ کیوں کہ کھانا پینا مفت اور تعلیم بالغان کا بہترین انتظام۔ ایک سے ایک قابل پروفیسر بنا فیس لیے لیکچر دے رہا ہے۔ کوئی چوری پر، کوئی ڈکیتی پر، کوئی دھوکے بازی چار سو بیسی پر، کوئی مار دھاڑ قتل و خون پر سب کو سبق پڑھا رہا ہے۔ پہلی بار جیل میں گیا تھا بالک رام۔ دوسری بار گیا تو رامو، تیسری بار گیا تو وہ بھیکو بن چکا تھا۔ وہ اب تک جرم کے اس کالج سے بہت اونچی ڈگری یا ڈپلومہ لے چکا تھا لیکن دل کے ہاتھوں چوری چکاری کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

سو بھیکو اب کچرے کا کھنارا لیے پھرتا تھا— اور سارا دن اُس گھڑی کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ جب وہ اپنی جھونپڑی میں واپس جائے گا۔ جہاں بالو چراغ جلائے اس کی راہ دیکھتی ہوگی۔

(3)

بالو اس کی زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ تھی۔ اس کی بیوی تھی مگر ان دونوں نے اگنی کے گرد سات پھیرے نہیں لگائے تھے، قاضی جی نے ان کا نکاح نہیں پڑھایا تھا، نہ وہ چرچ میں گئے تھے نہ سرکاری شادی کرنے رجسٹرار کے دفتر میں مگر پھر بھی وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کی گھر والی تھی۔ کاش وہ یہ بھی کہہ سکتا کہ وہ اس کے بچے کی ماں تھی۔ بچے کی ماں ضرور تھی مگر وہ جانتا تھا اور بالو جانتی تھی— دنیا میں اور کوئی نہیں جانتا تھا— کہ وہ بھیکو کا بچہ نہیں ہے۔

جب فٹ پاتھ پر اس کی ملاقات بالو سے ہوئی۔ بالو جس کی آنکھوں میں جادو تھا اور جس کا جوان گدرایا ہوا جسم اس کی پھٹی ہوئی چولی اور میلی ساڑی میں سے پھٹا پڑتا تھا— تو بھیکو کو ایسا لگتا تھا جیسے فٹ پاتھ پر یک بیک پھول کھل گئے ہوں۔ جیسے اس کے جیون میں بہار آ گئی ہو۔

اس زمانے میں بھیکو کھوٹا دھندا کرتا تھا۔ روپے پیسے سے اس کی جیب بھری رہتی تھی پہلے

دن ہی اس نے کہا تھا۔ ''سنیما چلتی ہے؟''

''چلو۔'' بالو نے بلا جھجک ہاں کر دی تھی۔

بھیکو نے سوچا یہ لونڈیا تو چالو معلوم ہوتی ہے۔

سنیما میں اندھیرا ہوا، فلم شروع ہوئی تو بھیکو نے بالو کی ران پر ہاتھ رکھ دیا۔

بالو نے بھیکو کا ہاتھ وہاں سے ہٹا دیا۔

کچھ دیر بھیکو خاموش بیٹھا فلم دیکھتا رہا۔ جب ہیرو ہیروئن نے پیڑ کے گرد گھوم گھوم کر گانا شروع کیا تو بھیکو کی کہنی بالو کے سینے سے ٹکرائی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بھیکو کی ہمت بڑھی اور جہاں کہنی تھی وہاں اس کا ہاتھ آ گیا۔ ایک پل کو تو معلوم ہوا جنگلی کبوتر پکڑا گیا۔ پھر دفعتاً بالو اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی اور اندھیرے میں لوگوں کے پیروں کو روندتی ہوئی باہر چلی گئی۔

رات کو فٹ پاتھ پر پھر ان کی ملاقات ہوئی۔ بھیکو نے کہا۔ بڑی شرافت کا ڈرامہ کرتی ہے۔ بھاؤ بڑھا رہی ہے کیا؟''

بالو نے جواب دیا۔ ''کچھ بھی کر رہی ہوں تمھیں اس سے کیا؟''

بھیکو نے کہا۔ ''جانتی ہے میں کون ہوں؟''

بالو نے چمک کر جواب دیا۔ ''جانتی ہوں۔ چور۔ اُچکا۔ جیب کترا چار سو بیس ہو۔ دو بار تڑی پار ہو چکے ہو۔ تین بار جیل جا چکے ہو۔''

بھیکو نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔ ''جانتی ہے میں تیرا کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم میرا کچھ نہیں کر سکتے۔ سمجھے۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اور آئندہ سنیما جانا ہو تو فوراس روڈ سے ایک چھوکری ساتھ لے جایا کرو۔''

بھیکو کا جی چاہا ایک زناٹے دار تھپڑ دے اس کو۔ مگر نہ جانے کیوں وہ خاموش رہا اور وہاں سے کھسک آیا۔ اگلے کئی دن اس نے اس فٹ پاتھ کا رخ نہیں کیا۔ مگر اب اُس کا اپنے پرانے دھندے میں جی نہیں لگتا تھا۔ نہ قسمت ہی ساتھ دیتی تھی۔ جس کی جیب کاٹتا تھا خالی نکلتی تھی۔ کبھی ہاتھ بھی آتا تو ریلوے کا پاس یا ڈائری وہ تنگ آ کر اُن کو کسی ڈاک کے ڈبے میں ڈال دیتا۔ اگر اس کے کام نہ آ سکے تو اصل مالک کے پاس ہی واپس پہنچ جائے۔

(4)

اُس کی جان پہچان فوراس روڈ کی ایک طوائف سے تھی جو جنگلی جانوروں کی طرح سلاخوں لگے ایک 'پنجرے' میں رہتی تھی۔ اس جیسی اور سینکڑوں لڑکیاں رہتی تھیں—یا رہنے پر مجبور تھیں۔ ایک دن شام کو وہ ایک خفیہ دارو خانے میں (جو بہت خفیہ بھی نہیں تھا) بیٹھا پی رہا تھا کہ دفعتاً اسے بالو کا کہنا یاد آیا۔ ''آئندہ سنیما جانا ہو تو فوراس روڈ سے ایک چھوکری ساتھ لے جایا کرو۔'' اس کے نشے سے دھندلے ہوتے ہوئے دماغ نے سوچا۔ ''سالی سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟ میرے دھندے میں یہ چونچلے نہیں چلتے۔ نیلا بھی کیا بری ہے۔ مانا کہ رنگ کالا بلکہ نیلا ہے۔ مانا کہ سالی بڑی بدزبان ہے۔ مگر بدن کتنا گٹھا ہوا ہے اور اپنے کو لینا بھی کیا ہے؟ چلو وہیں چلتے ہیں آج پھر؟'' اور ایک بار پھر اُس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم فوراس روڈ پہنچ گئے تھے...... مگر اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اُس کی نیلا سے آخری ملاقات ہوگی۔ کھولی کے اندر جانے سے پہلے اُس نے گندی نالی کے پاس کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ بڑی بدبو آرہی تھی۔ نالی میں سے کہ کھولی میں سے یا خود اُس کے اندر سے؟ پاس ہی ایک خارش زدہ کتا نالی کے گندے پانی کو پی رہا تھا۔ بھیکو کو ایک ابکائی سی آئی۔ مگر اس نے پتلون میں بٹن لگاتے ہوئے سوچا۔ آج تو ٹانک کے ساتھ مچھلی جو کھائی تھی وہ شاید سڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ نیلا کی کھولی کے اندر چلا گیا۔

وہ خالی بیٹھی اپنے بالوں میں (جو ناریل کے تیل میں ڈوبے ہوئے تھے) پھولوں کی وینی لگا رہی تھی۔ اس کا بدن تنگ فراک میں سے اُبلا پڑتا تھا بھیکو کو دیکھ کر وہ اُٹھی اور ایک نقلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا— ''بڑے دنوں میں آئے ہو؟ کسی اور چھوکری کے چکر میں ہو کیا؟ یا پھر بڑے گھر کی ہوا کھانے چلے گئے تھے؟''

''نہیں ری۔ دھندے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ آج تھوڑا ٹائم ملا تو سوچا نیلا کے ہاں ہو آؤں۔''

''تو آؤ۔'' نیلا نے کمرے کے اندر کے حصے کی طرف اشارہ کیا۔

''کچھ ایڈوانس ملے گا؟'' بھیکو نے اس کے بہت قریب آتے ہوئے اس کے اودے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''ملے گا۔ ملے گا۔ سب ملے گا۔'' نیلا کو بھی یہ بانکا نوجوان پسند تھا جو محنت کرتا تھا مگر دام

واجبی دیتا تھا۔

بھیکو اُن اودے ہونٹوں کو چومنے کے لیے جھکا۔ نیلا نے بناوٹی شرمیلے انداز سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

ناریل کے تیل اور موتیا کے پھولوں کی ملی جلی میٹھی میٹھی خوشبو کا ایک بھپکا آیا جس میں پاس ہی بہنے والی گندی نالی کی بدبو بھی شامل تھی۔ اودے ہونٹوں پر لگی گھٹیا لپ اسٹک کا مزا چکھا ہی تھا کہ بھیکو کو ایک اورا بکائی آئی اور اس کا سر گھوم گیا۔

''چل جلدی کر' اس نے اپنی طبیعت پر قابو پاتے ہی نیلا سے کہا نیلا نے اپنا وایاں ہاتھ آگے پھیلا دیا۔ ''میں نے اڈوانس دیے اب تم بھی پیشگی دلواؤ۔''

بھیکو نے دوروپے ہاتھ پر رکھ دیے۔

نیلا نے سر ہلا کر انکار کیا۔ ''ایک روپیہ اور لاؤ۔''

''وہ کاہے کا؟''

''مہنگائی بھتہ۔ ہر چیز کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے بھی اپنی قیمت بڑھا دی ہے۔''

''سالی کہیں کی!'' بھیکو بڑبڑایا اور پھر ایک اور روپیہ نکال کر اس کی لالچی ہتھیلی پر دھر دیا۔

''اب چل اندر۔'' نیلا نے اپنا ہاتھ بھیکو کی کمر میں ڈالتے ہوئے اور پردے کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں پردے کے اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ باہر سے کسی کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ نیلا نے جھانک کر دیکھا تو منگو کو کھڑا پایا۔ منگو جو اس کا دلال تھا۔

اُس نے اشارے سے پوچھا۔ کتنا ملا؟ نیلا نے دوروپے دکھائے۔

منگو نے غصے سے کہا۔ ''میں نے کہا نہیں کہ ریٹ بڑھ گیا ہے۔ دوروپے نہیں چلیں گے۔''

نیلا نے تیسرا روپے کا نوٹ بلاؤز کے اندر سے نکال کر دکھایا۔

منگو نے دوروپے چھینتے ہوئے کہا۔ ''چل جلدی کر۔ دھندے کا ٹائم ہے۔''

اندر گئی تو نیلا نے دیکھا کہ بھیکو نے اب تک کپڑے نہیں اتارے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے بیٹھا ہے۔

''کون تھا؟'' اُس نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

''منگو۔ میرا دلال کیوں تمھیں کیا ہوا؟''

''سر میں درد ہو رہا ہے۔''

''اتنے دنوں میں میرے پاس آؤ گے تو سر میں درد ہی ہوگا؟'' نیلا نے اپنے فراک کے پیچھے لگا ہوا ''زپ'' کھولتے ہوئے کہا۔

اب بھیکو نے سر اُٹھایا۔

سامنے بالو ننگی کھڑی تھی۔

'نہیں نہیں۔ بالو نہیں۔ نیلا۔

نیلا۔ بالو۔ نیلا۔ بالو۔ تصویر جیسے سنیما کے پردے پر پلک جھپکا رہی تھی۔

پلنگ کے پاس تپائی پر ایک ادھ جلا چار مینار کا سگریٹ مٹی کی ڈھوبری میں پڑا تھا جو ایش ٹرے کا کام دیتی تھی۔ راکھ میں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔

''سگریٹ پیو گے؟'' نیلا نے اسی ادھ جلے سگریٹ کو اٹھا کر بھیکو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کس کا ہے؟ کیا تو اب سگریٹ پینے لگی ہے؟''

''میں بھی کبھی کبھی ایک سٹا لگا لیتی ہوں۔'' نیلا نے ہنس کر سگریٹ کو اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ تو تم سے پہلے جو گاہک آیا تھا وہ جلدی میں چھوڑ گیا ہے۔ وہ پریم کے بعد سگریٹ ضرور پیتا ہے۔''

''پریم؟'' بھیکو نے تعجب سے دہرایا۔

نیلا اب اُسے سگریٹ پیش کر رہی تھی۔ ''لو تم پریم کرنے سے پہلے پی لو۔''

بھیکو نے سگریٹ نیلا کے ہاتھ سے لے لیا۔ اب اس کا سر اور چکرا رہا تھا۔ ہونٹوں کے قریب لایا تو دیکھا اب اس سگریٹ پر نیلا کی لپ اسٹک کی مہر لگی ہوئی ہے۔

دفعتاً اس کے دماغ کے سنیما کی مشین جیسے ٹوٹ گئی ہو اور ان مل بے جوڑ تصویریں ایک کے بعد ایک کر کے پردے پر جھلکنے لگی ہوں۔

نیلا۔

بالو۔

لپ اسٹک لگا سگریٹ۔

نیلا کا پہلا گاہک اس سگریٹ کو پی رہا تھا۔

منگو دلال۔

پھر لپ سٹک لگا سگریٹ۔

گندی نالی۔

خارش زدہ کتا گندا پانی چپڑ چپڑ کر کے پی رہا تھا۔

نہیں وہ کتا نہیں تھا۔ وہ خود تھا۔ بھیکو۔

اُسے ایسا لگا کہ اس کے ہونٹوں کے ذریعے سگریٹ کا دھواں نہیں جارہا تھا بلکہ گندی نالی کا گندا سڑا ہوا پانی تھا، جو وہ پی رہا تھا۔

اور ایک دم اسے بڑے زور کی ابکائی آئی۔ پیٹ کے اندر سے ڈکار نکلی تو اس میں دارو اور سڑی ہوئی مچھلی کی بو آئی۔ پھر اسے ایسا لگا کہ پیٹ کی سب انتڑیاں زور لگا کر باہر نکل رہی ہیں۔ ساتھ میں اس کا بھیجا بھی سر پھاڑ کر نکلنا چاہتا تھا۔ نیلا کا ننگا جسم اب بڑے زور سے کمرے کے گرد گھوم رہا تھا یا سارا کمرہ ہی گھوم رہا تھا۔ اس نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔ مگر اس بار متلی کی لہر آئی تو اس کو ایسا لگا اس کے پیٹ میں جو کچھ بھی تھا۔ سڑی ہوئی مچھلی، شراب، گندی نالی کا بدبودار پانی— سب کچھ اُچھل کر اس کے منہ سے باہر نکل آیا۔

''ارے ارے۔'' نیلا چلائی۔ ''تو نے تو سارے میں الٹی کر دی۔ چل باہر نکل یہاں سے!''

بھیکو کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ نہ صرف اس کے پیٹ سے بلکہ اُس کے دماغ سے اس کے دل سے تمام گندگی باہر نکل گئی ہو۔ اب اس کا سر نہیں چکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تصویریں نہیں ناچ رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ سامنے ایک کالی، بدصورت عورت ننگی کھڑی چلاّ رہی ہے۔ اس کا بھلا مجھ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا اور وہاں سے باہر نکل آیا مگر بڑی احتیاط سے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس گندگی میں جو اس کے اندر سے باہر نکلی تھی اس کا پیر پھسل جائے۔

اور اس رات کو نل پر جا کر وہ صابن مل کر خوب نہایا۔ پھر دھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ پھر وہ فٹ پاتھ کے اس کونے میں آیا جہاں بالو سوتی تھی۔ وہ بیٹھی اپنے لمبے ملائم بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

''بالو۔ سنیما چلے گی؟''

بالو نے نگاہ اٹھا کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ایک شرط پر۔''

شرط مجھے منظور ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوگی۔''

وہ سنیما دیکھنے چلے گئے اور پہلی بار بھیکو کو کسی لڑکی کے برابر میں بیٹھنا ہی اچھا لگا۔ ان کے شریر ایک دوسرے کو نہیں چھو رہے تھے مگر ایک نرم نرم لہر اُن کے درمیان دوڑ رہی تھی۔

واپسی میں ایک بج چکا تھا۔ سارا شہر سنسان پڑا تھا۔ اِکّا دُکّا موٹریں سڑکوں پر دوڑ رہی تھیں۔ نیون سائن اپنی آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ شیشے کی دیواروں کے پیچھے دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا سارا شہر صرف ان کے لیے سجایا گیا ہے۔ چلتے چلتے بھیکو نے پوچھا۔

''بالو مجھ سے بیاہ کرے گی۔؟''

''میں بیاہ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں تین مہینے سے فٹ پاتھ پر رہتی ہوں، وہیں سوتی ہوں۔ اور وہاں پاپ کے لیے کوئی دروازہ بند نہیں ہے۔''

''بالو میں نے بھی مدتوں گندی نالی کا پانی پیا ہے۔ بول اب کیا کہتی ہے۔؟''

''کل جواب دوں گی۔ ہمارا فٹ پاتھ آ گیا ہے۔ لوگ اُٹھ جائیں گے اب تم جاؤ۔ رات بھر میں تم بھی سوچ سمجھ لینا۔''

اور بھیکو اس سے کل ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ آج کی رات ہوا چل رہی ہے اور ساری دنیا میں پھول ہی پھول کھلے ہیں!

اگلے دن بھیکو نے پھر بالو سے وہی سوال دہرایا۔

''بالو مجھ سے بیاہ کرے گی؟''

''میں بھی ایک سوال کروں؟''

"پوچھ۔ پوچھ۔ کیا سوال کرنا چاہتی ہے۔"

"چوری چکاری، کھوٹا دھندا چھوڑ دو گے؟"

"مگر بالو۔ کھوٹا دھندا نہیں کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے؟ تجھے کہاں سے کھلاؤں گا؟ کھولی جھونپڑی کا کرایہ کہاں سے دوں گا؟ نوکری تو پہلے بھی نہیں ملتی تھی۔ لیکن اب تو میں دو بار تڑی پار ہو چکا ہوں۔ تین بار جیل کا ٹھپہ لگ چکا ہے۔ ایسے کو کون کام دے گا۔؟"

"کرنا چاہو تو کچھ بھی کر سکتے ہو" بالو نے کہا۔

"تو ہوں بتا کیا کروں۔"

بالو نے دیکھا کہ سڑک پر ایک آدمی کھٹارا لیے جا رہا ہے جس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا ہے اور پھر کھٹارے کو ٹھہرا کر وہ کچرے کے ڈرم کے پاس کھڑا ہوا اس میں سے خالی ٹین کے ڈبے نکال کر اپنے کھٹارے میں ڈال رہا ہے۔

"جو کام وہ کرتا ہے وہی تم بھی کر سکتے ہو۔"

"تو کہتی ہے تو میں بھی کر لوں گا۔ پھر تو تو میرے ساتھ رہے گی نا؟"

بالو نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

بھیکو نے سوچا۔ اس کھٹارے کا تیسرا پہیہ ہمارا بچہ منو ہے۔

ہمارا بچہ؟

یا صرف بالو کا بچہ؟

بھیکو نے دل ہی دل میں سوال دہرائے اور پھر دل ہی دل میں اُن کا جواب دیا۔

بالو میری ہے (کیا ہوا اگر پنڈت نے اشلوک نہیں پڑھے اور اگنی کے گرد ہم نے سات پھیرے نہیں لگائے، زندگی کی آگ میں تو اکٹھے کود ہی پڑے ہیں؟) اور منو نے بالو کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ منو میرا نہیں تو پھر کس کا بچہ ہے؟ اگر کسی نے اسے مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں اس کا منہ نوچ لوں گا اور پھر آج تو ہمارے منو کی سالگرہ ہے۔ اسی دن پچھلے برس اس نے جنم لیا تھا۔ تب ہی تو بھیکو آج کے دن زیادہ سے زیادہ کچرا اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ آج وہ سیٹھ سے پورے دس روپے وصول کرے گا۔ پانچ روپے اس نے پہلے سے بچا رکھے تھے۔ پندرہ میں سے پانچ روپے

کی مٹھائی تو وہ اپنے پڑوسیوں میں تقسیم کرے گا۔ پانچ روپے کے کھلونے منو کے لیے لائے گا اور پانچ روپے میں بالو کو ساتھ لے جا کر سنیما دکھائے گا۔ آج کی رات وہ عیش کریں گے۔ آج منو کی سالگرہ ہے نا؟

مگر ڈیڑھ برس پہلے جب اُس کو معلوم ہوا تھا کہ بالو ماں بننے والی ہے تو وہ خوش نہیں ہوا تھا۔ وہ دن یاد کر کے آج بھی اُسے جھرجھری آ جاتی تھی۔

ابھی اُنہیں ساتھ رہتے ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے اور دونوں مل کر اپنی جھونپڑی کی چاردیواریں بنا کر اُس پر چھپر ڈال رہے تھے کہ کام کرتے کرتے بالو ایک دم سے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بھیکو پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا گرلا سے ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے بالو کا معائنہ کرنے کے بعد بھیکو کو ایک طرف لے جا کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں بہت جلد ہوش آ جائے گا۔ تمھاری بیوی ماں بننے والی ہے!''

ڈاکٹر فیس لے کر چلا گیا لیکن بھیکو کو دنیا گھومتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہتوڑے کی طرح سوالوں کی مار اس کے دماغ پر پڑ رہی تھی۔ ابھی تو ہمیں رہتے ہوئے تین دن ہی ہوئے ہیں!

پھر یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

بالو کو ہوش آیا تو اس نے پوچھا۔ ''مجھے کیا ہوا تھا بھیکو۔

اور بھیکو نے گالی دے کر اس کو خوش خبری سنا دی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

بالو کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ''ہے بھگوان۔ یہ کیا ہوا؟''

''بھگوان کو کیوں دوش دیتی ہے'' بھیکو نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔ ''اس شیطان کو یاد کر جس کا نطفہ تیرے پیٹ میں پل رہا ہے۔'' بول وہ کون تھا؟''

ایک زناٹے دار تھپڑ بالو کے گال پر پڑا۔ ''بول۔ بول کون تھا؟'' اور پھر ایک اور تھپڑ۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔

''مارو۔ مارو۔ مجھے خوب مارو۔'' بالو روتی جا رہی تھی۔ مجھے مار ہی ڈالو۔ میں نے پاپ کیا ہے۔ مجھے اس کی سزا ملنی ہی چاہیے مگر میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں بیاہ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔''

بالو کو مار پیٹ کر بھیکو باہر نکل گیا۔ کتنے ہی دنوں کے بعد بار دارو پی۔ اور پھر دارو خانے میں بھی چین نہیں ملا تو وہ نہ جانے کتنی دیر سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ رات اندھیری تھی۔ سردی کا زمانہ تھا۔ ماہم کے چوراہے کے پاس ایک جگہ روشنیاں جلتی دیکھیں اور اندر بھیڑ بھی کافی تھی تو وہ اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ عیسائیوں کا گرجا گھر ہے۔ اندر خاصی گرمی تھی۔ سب لوگ دوزانو ہو رہے تھے سو بھیکو بھی دوزانو ہو گیا۔ سامنے کتنی ہی مورتیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک آدمی تھا خوب صورت، جوان، بھوری بھوری داڑھی والا۔۔ جس کو نہ جانے کس ظالم نے سولی پر چڑھایا ہوا تھا۔ کئی مورتیاں ایک عورت کی دکھائی دیں جس کے چہرے پر بڑی معصومیت اور مامتا تھی۔ گود میں بچہ تھا۔ اس کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بھیکو کی آنکھوں میں اس کی اپنی مری ہوئی ماں کی صورت گھوم گئی۔

''یہ عورت کون ہے؟'' اس نے مورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''ان کا نام ماتا مَیری ہے۔ اُن کی گود میں ان کا بچہ ہے جو آگے چل کر حضرت عیسیٰ کے نام سے مشہور ہوا۔''

''اور اس بچہ کا باپ؟''

''اس کا کوئی باپ نہیں تھا۔ اس کا باپ خدا تھا۔ بھگوان تھا۔

اور بھیکو کو دفعتاً ایسا محسوس ہوا کہ اس کے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔ جس بچّے کا کوئی باپ نہیں ہوتا اس کا باپ خدا ہوتا ہے۔ بھگوان ہوتا ہے۔ تو پھر کیا......؟ اور ایک دم جیسے طوفان تھم گیا ہوا۔ اور اس کا نشہ اتر گیا ہو۔ اور اب وہ سوچنے لگا کیا میں نے بالو کو، اس بالو کو جو مجھے جان سے زیادہ پیاری ہے، واقعی مارا پیٹا۔ نہیں وہ کوئی اور ہوگا۔ مگر وہ شیطان میرے اندر رہتا ہے۔ اب میں اسے نکال کر باہر کروں گا۔

اور وہ گھر واپس آ گیا۔ دیکھا کہ جھونپڑی میں لالٹین جل رہا ہے۔ کھانا پکا رکھا ہے۔ پاس ہی منہ دھونے کو پانی ہے۔

اس کو دیکھ کر بالو نے کہا۔ ''لو کھانا کھا لو۔''

''تو نے نہیں کھایا؟''

''گھر والے سے پہلے گھر والی کیسے کھا سکتی ہے؟''

بھیکو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔ ''کتنی اچھی ہے میری بالو۔'' اس نے سوچا۔ ''میں کتنا خوش قسمت ہوں۔''

ہاتھ منہ دھوتے ہوئے اس نے جھوٹ موٹ کی ڈانٹ پلائی ''چل ہاتھ دھو کے تو بھی بیٹھ جا۔ آج ہم اکٹھے کھانا کھائیں گے''......

اور جب وہ دونوں کھانے بیٹھے تو بھیکو نے کہا۔ ''اب تیرے لیے فکر کرنی پڑے گی۔ تو ماں بننے والی ہے نا؟''

بالو نے شرما کر نظریں جھکالیں۔

بھیکو نے ایک نوالہ اپنی بیوی کو کھلاتے ہوئے کہا۔ ''اری شرماتی کیوں ہے؟ اگر تو ماں بننے والی ہے تو میں بھی باپ بننے والا ہوں۔''

اب بالو کو یقین ہوگیا کہ بھیکو نے اس کے سب گناہ معاف کر دیے ہیں۔ اس نے خاموش نظروں سے شکریہ ادا کیا اور بھیکو کے ہاتھ پر اپنا نرم ہاتھ رکھ دیا۔

سات مہینے کے بعد بالو نے بچہ جنا۔ دائی نے باہر آکر بھیکو سے کہا۔ ''مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے!''

بھیکو نے پڑوسیوں میں مٹھائی بانٹی۔ بچے کا نام منوہر لال رکھا گیا۔ مگر ماں باپ اور اڑوس پڑوس والے سب اُسے منو ہی کہتے تھے۔

اور آج وہی منو سال بھر کا ہوگیا ہے......

(5)

یہاں تک ہی بھیکو نے سوچا تھا کہ سامنے جوہو کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں باہر کچرے کے ڈرم کے پاس ایک پرانا ٹب پڑا دیکھا۔ ٹھٹھک کر اس نے سوچا ہوٹل کے آس پاس تو بہت کام کا مال ملتا ہے۔ دارو کی بوتلیں۔ خالی ٹین جن میں کبھی مچھلی یا گوشت ہوتا تھا۔ مگر اتنی بڑی چیز جیسی کہ وہ ٹب تھا۔ اس نے آج پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ نہ جانے کیوں اچھے خاصے ٹب کو کوڑے پر پھینک دیا گیا تھا۔

ہوٹل میں ہڑتال ہو رہی تھی۔ اس لیے بیس بائیس بیرے، ویٹر وغیرہ ہوٹل کے باہر ہی

کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک سے بھیکو نے "ٹب" کی طرف دیکھ کر کہا۔
"کیوں بھائی یہ پرانا بے کار ٹب لے لوں؟"

بیرے کی سفید وردی پہنے ہوئے ایک نوجوان بولا۔ "لے لو بھائی کون منع کرتا ہے۔ ہماری طرف سے یہ سارا ہوٹل ہی لے لو۔ یہ ٹب تو انہوں نے جان بوجھ کر یہاں پھینکوائی ہے۔ تم اسے لینا چاہتے ہو تو لے لو۔ مگر اس کی کہانی بھی جانتے ہو؟"

بھیکو نے سر ہلا کر انکار کیا۔ مگر اس نے دیکھا کہ وہ بیرہ ٹب کے اندر کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہا ہے۔ اب بھیکو نے غور سے دیکھا۔ اندر کی طرف ایک دھبہ پڑا تھا کتھئی رنگ کا جو زمانے کے ساتھ اڑتا جا رہا تھا۔ مگر ابھی تک تھا! "پان کی پیک؟ یا پینٹ کا دھبہ؟" بھیکو نے اس بیرے سے سوال کر ہی دیا۔ جواب ملا۔ "یہ نہ پینٹ ہے نہ پان کی پیک ہے۔ یہ کسی کے خون کا دھبہ ہے!"

○

خون بھرے ٹب کی کہانی

(1)

ٹب سفید تھا، چکنا تھا، گرم پانی سے بھرا ہوا تھا۔ پاس ہی دو بڑے اور چار چھوٹے تولیے لٹکے ہوئے تھے۔ خوشبودار صابن کی ٹکیہ رکھی ہوئی تھی۔ اوپر شاور باتھ کا فوارہ لگا تھا۔ ریکھا نے اپنی انیس برس کی عمر میں نہ اتنا خوب صورت باتھ روم دیکھا تھا نہ ایسا شاندار ٹب۔

اُس کی زندگی تو ایک چھوٹے سے قصبے میں بسر ہوئی تھی۔ باپ ایک اسکول میں ٹیچر تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ ایک چھوٹی بہن اور دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے۔ باپ نے ریکھا کو اسکول میٹرک تک تعلیم دلائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ٹیچرس ٹریننگ کا سرٹیفکٹ لے کر وہ بھی وہیں گرلز اسکول میں ٹیچر ہو جائے اور اپنی تنخواہ سے گھر بسانے میں اور بھائی بہنوں کی تعلیم میں مدد دے۔ مگر ریکھا کو ٹیچری کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی کلاس میں کئی لڑکیاں امیر خاندانوں کی تھیں۔ کوئی کسی کنٹراکٹر کی بیٹی، کوئی کسی افسر کی بہن، کوئی بمبئی ہو آئی تھی اور وہاں کی رنگین زندگی کے قصے سناتی تھی۔ اور ایک سندھی تاجر کی بیٹی تو اپنے باپ سے ملنے ہانگ کانگ تک چلی آئی تھی اور وہاں سے لائی ہوئی شیفون، نائلون کی ساڑیاں پہن پہن کر دوسری لڑکیوں کا دل جلاتی تھی۔ یہ سب لڑکیاں ہر وقت ساڑیوں، سلیکس، بیل باٹم، اسٹریچ پینٹس کی باتیں کرتی تھیں۔ ان کی

بڑی آزاد زندگی تھی جس کو غریب ریکھا رشک سے دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں سوچتی تھی کہ کاش میرے پاس بھی ایسے خوب صورت، قیمتی اور فیشن ایبل کپڑے ہوتے۔

بمبئی سے انگریزی میں عورتوں کے کئی رسالے نکلتے تھے۔ ریکھا کو جو پانچ روپے مہینہ جیب خرچ ملتا تھا، اس میں سے وہ ہر مہینے یا ہر پندرہ روز پر یہ سارے رسالے خریدتی تھی اور ان میں عورتوں کے نئے فیشن، نئے بالوں کے سنگھار کے طریقے، خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں، امیر گھروں کے سجاوٹ کی تصویریں، یہ سب دیکھا کرتی تھی۔ ان رسالوں میں سے ایک نے اعلان کیا تھا کہ ''مس انڈیا'' کا انتخاب ہوگا اس کے لیے پندرہ سے لے کر پچیس برس کی لڑکیاں اپنی تصویریں بھیجیں۔ جو لڑکی ''مس انڈیا'' منتخب ہوگی اس کو نہ صرف تاج پہنایا جائے گا بلکہ دس ہزار روپے نقد، امریکہ کا سفر مفت اور مختلف کمپنیوں کی طرف سے ساڑیاں ڈریس، زیور، ریڈیو اور ٹرانسسٹر انعام میں ملیں گے۔ ریکھا کو ایسا لگا کہ اس کے لیے اپنی قسمت بدلنے کا یہی ایک موقع ہے۔ کیوں کہ قدرت کی طرف سے اس کو یہی دو تحفے تو ملے تھے۔ اچھی خاصی صورت اور سڈول اور خوشنما بدن۔ صورت تو لوگوں کو ریکھا کی ملگجی ساڑیوں میں بھی اچھی لگتی تھی۔ مگر اپنے بدن کی نمائش کرنے کا موقع ابھی تک اس کو نہ ملا تھا۔ صرف اپنے گھر کے غسل خانے میں جب وہ نہانے جاتی تو خود ہی خود اپنے بدن کو دیکھ کر خوش ہو لیا کرتی تھی یا کچھ سوچ کر خوش ہو جایا کرتی تھی۔

اس مقابلے میں شریک ہونے کے لیے پہلی شرط یہ تھی کہ ہر لڑکی اپنی تین تصویریں بھیجے جن میں سے ایک تصویر ''سوئمنگ کاسٹیوم'' میں ہو، تاکہ صورت کے ساتھ اس کے بدن کی خوشنمائی کا بھی اندازہ کیا جا سکے۔ ریکھا کے لیے سوال یہ تھا کہ یہ تصویریں کہاں کھنچوائی جائیں۔ اس کے پاس تو اتنے پیسے تھے نہیں کہ فوٹو گرافر کی دکان پر جا کر تصویریں کھنچوائے۔ پھر اس نے اپنی ایک سہیلی شیلا سے مشورہ کیا۔ جس کا باپ مقامی سنیما کا مالک تھا۔ وہ خود اس مقابلے میں حصہ نہیں لے رہی تھی کیوں کہ اس کی ایک آنکھ بھینگی تھی جس پر وہ ہر وقت ایک فیشن ایبل کالا چشمہ چڑھائے رکھتی تھی۔ اس نے ریکھا کو یقین دلایا کہ تصویروں کا انتظام ہو جائے گا۔ اس کے بھائی کے پاس بہت اچھا جرمن کیمرہ ہے اور اسے خوب صورت لڑکیوں کی خوب صورت تصویریں کھینچنے کا شوق بھی ہے۔

(2)

ایک دن اپنے باپ سے یہ بہانہ کر کے کہ اس کی سہیلی کی سال گرہ ہے ریکھا اپنی بہترین ساڑی پہن کر شیلا کے ہاں پہنچی۔ وہاں شیلا نے اس کی ملاقات اپنے بھائی گووند سے کرائی۔ گووند نے ریکھا کو گھور کر دیکھا۔ جیسے اسے ''ایکسرے'' کر رہا ہو یا اس کے مقابلۂ حسن میں آنے کے امکانات پر غور کر رہا ہو۔ پھر شیلا سے بولا: ''تمھاری سہیلی کو پچاس فی صدی چانس مانو ہے۔ شرط یہ ہے کہ تصویریں اچھی بن جائیں۔''

''وہ تو بن ہی جائیں گی ـــ جب تم خود فوٹوگرافر ہو۔'' شیلا نے کہا۔ اور پھر ریکھا کی طرف مخاطب ہو کر۔ ''اچھا ریکھا۔ بائی بائی۔ میں تو ممی ڈیڈی کے ساتھ ایک لنچ پر جا رہی ہوں۔ گووند بھیا بیچارے صرف تمھاری وجہ سے نہیں جا رہے۔ وہ تمھاری دیکھ بھال کریں گے۔ اور۔ اور۔ تم ان کی دیکھ بھال کرنا!'' اس پر گووند اور شیلا نے ایک ایسا قہقہہ لگایا جس کو سن کر ریکھا کسی قدر سٹ پٹا گئی۔ ''ہاں میرے کپڑے جو چاہے تم فوٹوگرافی کے لیے استعمال کر سکتی ہو'' اور پھر اپنے بھائی سے۔ گووند بھیا۔ جس چیز کی ضرورت ہو وہ میری الماری سے نکال لینا۔

سب لوگ چلے گئے اور وہ دونوں شیلا کے بیڈ روم میں اکیلے رہ گئے تو گووند ریکھا کی طرف بڑھا اور اس کی ساڑی کا پلّو نیچے گرا دیا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' ریکھا گھبرا کر بولی۔

''ڈرو مت۔ میں صرف فوٹوگرافر کی حیثیت سے تمھیں ہر زاویے سے دیکھ رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نہ یہ ساڑی چلے گی نہ یہ بلاؤز۔ اور ـــ اور نہ یہ بریسیر جو تم نے بلاؤز کے اندر پہن رکھا ہے۔ تمھارے بال لمبے اور ملائم ہیں لیکن یہ جوڑا نہیں چلے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ریکھا کا جوڑا کھول کر اس کے بال شانوں پر لہرا دیے۔

''یہ بہتر ہے۔ مگر کوئی معقول ساڑی، بلاؤز اور بریسیر تلاش کرنے ہوں گے۔''

یہ کہہ کر گووند نے شیلا کی الماری کھولی اور اس میں سے ساڑیاں، بلاؤز، پیٹی کوٹ، بریسیر نکال کر بستر پر ڈال دیے۔ ایک ایک ساڑی کھول کر اس نے ریکھا کے شانے پر ڈال کر دیکھا۔ کبھی کبھی ''غلطی'' سے اس کا ہاتھ ریکھا کی چھاتی کے ابھاروں کو بھی لگ گیا۔ ریکھا کے تن بدن

میں ایک جھرجھری سی آگئی۔ آخر کار ایک سلک کی ساڑی پسند آئی۔ پھر اس کے ساتھ کا بلاؤز بھی تلاش کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے شیلا اور ریکھا کا قد و قامت ایک جیسا ہی تھا۔ مگر پھر بھی بلاؤز کو اس کے بدن پر رکھ کر دیکھنا پڑا کہ گلے کا کٹاؤ کافی گہرا ہے کہ نہیں۔

''بس اب ایک بریسیر رہ گیا ہے۔'' گووند نے اعلان کیا اور پھر ایک ایک کر کے بریسیروں کو اٹھا اٹھا کر اُن کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک بریسیر پسند آیا کیوں کہ اس کا رنگ ریکھا کی جلد کی رنگ کے مطابق تھا۔ بڑی بے شرمی سے بریسیر کی کٹوریوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور ریکھا کی چھاتیوں کی طرف دیکھتے ہوئے جو ساڑی کے پلّو گر جانے سے اپنے بلاؤز کے اندر کسمسا رہی تھیں۔ گووند نے کہا: ''بس اب ٹھیک ہے۔ تم باتھ روم میں جا کر کپڑے پہن لو — اور میں اپنا کیمرہ ٹھیک ٹھاک کر لیتا ہوں!''

بریسیر اور ساٹن کا پٹی کوٹ پہن کر اور بال شانوں پر بکھرا کر ریکھا نے باتھ روم کے آئینے میں دیکھا تو اسے بالکل کوئی اور ہی لڑکی دکھائی دی۔ کیا میں واقعی اتنی خوب صورت ہوں؟ اس نے سوچا۔ ''ماڈل'' لڑکیوں کو ایسے لباس پہنے ہوئے اس نے اکثر رسالوں میں چھپی ہوئی تصویروں میں دیکھا تھا۔ لیکن آج اُسے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی ''ماڈل'' سے کم نہیں ہے۔ ''ایک دفعہ بمبئی پہنچ جاؤں تو بیوٹی کوئین بنوں نہ بنوں کامیاب ماڈل تو میں ضرور بن جاؤں گی۔'' یہ سوچتے ہوئے اس نے بلاؤز پہن کر ساڑی کو لپیٹنا شروع کیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ ماڈل ''لڑکیاں کس طرح کس کر ساڑی باندھتی ہیں جس سے بدن چھپتا نہیں اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی انداز سے ریکھا نے ساڑی باندھی اور پھر اس کو پن لگا کر جسم سے چپکا ہوا ولایتی ڈریس بنا لیا۔ پلّو کو ایک کندھے پر سے گزار کر کمر کے گرد باندھ لیا گیا۔ جس سے اس کا سینہ جو پہلے ہی بلاؤز کے گہرے کٹاؤ سے باہر نکلا پڑتا تھا اور بھی نمایاں ہو گیا۔

ریکھا شرماتی، کسی قدر ڈرتی، ہچکچاتی ہوئی باہر نکلی تو گووند نے واقعی کیمرہ لگایا ہوا تھا۔ فوٹو گرافروں والے بجلی کے تین لیمپ بھی رکھے تھے۔ ریکھا کے بیٹھنے کے لیے ایک گول گھومنے والا اسٹول رکھا تھا۔ ریکھا کے آنے کی آہٹ ہوئی تو گووند نے مڑ کر دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے ایک سیٹی بجی — جیسے ریکھا نے کبھی کبھی بازار میں گزرتے ہوئے آوارہ لوگوں کو بجاتے

ہوئے سنا تھا۔ وہ ایک دم بوکھلا گئی۔

گووند نے اسے اطمینان دلایا: "گھبراؤ مت ریکھا۔ میں آج صرف ایک فوٹوگرافر ہوں......

" ریکھا کو محسوس ہوا کہ لفظ آج پر ہلکا سا زور ہے۔ گووند نے اپنا جملہ پورا کیا۔ "......آج میں کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جو فوٹوگرافر نہیں کرتے لیکن اچھی تصویر کھنچوانے کے لیے "ماڈل" کو چھپنا یا شرمانا نہیں چاہیے۔ اب تم اطمینان سے اسٹول پر بیٹھ جاؤ۔"

ریکھا بیٹھ گئی۔

لیمپوں کو اِدھر اُدھر کیا گیا تا کہ روشنی ٹھیک زاویے سے اس کے چہرے پر پڑے۔ بجلی کی روشنی میں بھی گرمی ہوتی ہے یہ آج معلوم ہوا مگر ریکھا کے گالوں پر یہ آنچ اچھی لگ رہی تھی۔

"ادھر دیکھو۔"

ریکھا نے ادھر دیکھا۔

"نہیں۔ نہیں اُدھر دیکھو۔"

ریکھا نے اُدھر دیکھا۔

"تھوڑا بائیں کو۔۔۔ نہیں نہیں دائیں کو............ اس فائل میں ہونا چاہیے۔ پھر پیچھے کی طرف مڑ کر کیمرے کی طرف دیکھو............ یہ ٹھیک ہے۔"

ریکھا کو محسوس ہو رہا تھا کہ گووند کیمرے میں سے اُس کے سینے کے ابھاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کو ریشمی بلاؤز کے نیچے چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔" یہ کہتا ہوا گووند اس کی طرف آیا اور اس نے بالکل پاس آ کر ریکھا کے گالوں کو چھو کر ادھر اُدھر کیا پھر ٹھوڑی کو ہاتھ سے اٹھایا۔ "ذرا اوپر۔۔۔ گردن کا خم برا نہیں ہے۔ یہ بھی تصویر میں آ جانا چاہیے۔۔۔" مگر اس تمام عرصہ اُس کی انگلی شاید غلطی سے ریکھا کے سینے کو چھوتی رہی۔ اور خود ریکھا کو تعجب ہوا کہ اس نے ایک بار بھی گووند کو پرے ہٹنے کو نہیں کہا۔ شاید اُس کا انداز ریکھا کے لاشعور کو اچھا لگ رہا تھا۔

آخر کار گووند اپنے کیمرے کے پاس گیا۔ تصویریں لینی شروع کیں۔

'ادھر دیکھو۔"

کلک۔

''اُدھر دیکھو۔''

کلک۔

''اوپر دیکھو۔''

کلک۔

ایک کے بعد ایک تصویریں کھنچتی جارہی تھیں اور گووند کا کیمرہ ریکھا کے پاس آتا جارہا تھا۔اب کیمرہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''ریکھا۔اب ہونٹوں کو ایسے کرو جیسے کسی کو پیار کررہی ہو۔''

ریکھا نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا تھا۔سوائے اپنے چھوٹے بھائی بہن کو۔ویسے ہی اس نے ہونٹ آگے کردیے۔

کلک۔

تیز روشنی۔گرمی۔ریکھا کے گال تمتمارہے تھے۔سارے تن بدن میں ایک ہیجان مچ رہا تھا۔سوئے ہوئے سپنے جاگتے جارہے تھے۔مگر ریشمی بلاؤز، ساٹن کے پیٹی کوٹ، شیفون کی ساڑی کے لمس سے نیندسی آرہی تھی۔لیمپوں کی تیز روشنی عین اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔روشنیوں کے سوا کچھ بھی تو نظر نہیں آتا تھا۔نہ گووند کا کیمرہ۔نہ کمرہ۔بس ایک ہی آواز کان میں آرہی تھی۔کلک! کلک! کلک!

پھر ایک دم روشنیاں غائب ہوگئیں۔اور ریکھا کو ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کی لہروں نے اسے ایک دم کنارے پر لا پٹخا ہو۔

ایک ہاتھ نے ریکھا کے بالوں کو چھوا پھر انگلیاں گالوں پر اُتر آئیں گالوں پر سے ہو کر بغیر آستین کے بلاؤز میں سے نکلے ہوئے شانے کو سہلاتی ہوئی اور نیچے......

''گووند بھیا!'' ریکھا چلائی جیسے خطرہ اس نے پہلی بار محسوس کیا ہو۔

گووند الگ ہٹ گیا۔دیکھو۔میں کسی خوب صورت لڑکی کا بھیا و یا بننا پسند نہیں کرتا ہوں مگر آج میں صرف فوٹو گرافر کا رول ادا کروں گا۔بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔جاؤ اب

سوئمنگ کاسٹیوم پہن لو۔ یہ تصویر بھی ہو جائے۔''

''سوئمنگ کا سٹیوم پہن کر ریکھا آئی تو لجاتی ہوئی۔مگر گووند نے کہا۔''دیکھو، بیوٹی کوئین بننا ہے تو یہ سب نہیں چلے گا۔سمجھیں۔ مجھ سے مت ڈرو۔ مجھے کیمرے کا ہی ایک حصہ سمجھو۔ میں نے کہہ دیا ہے آج کے دن میں کوئی گڑ بڑ نہیں کروں گا۔''

ریکھا کیمرے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

گووند نے کیمرے کے اندر دیکھتے ہوئے فوکس ٹھیک کیا۔

''نظر اٹھاؤ۔''

ریکھا نے نظر اٹھائی۔ دیکھا کہ گووند اُس کو صرف کیمرے کے اندر سے دیکھ رہا ہے۔

''اب دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ بالکل سیدھے نہیں۔تھوڑا خم ہونا چاہیے۔ جیسے ہاتھوں میں ایک فٹ بال پکڑے ہو۔ پاؤں ایک دوسرے سے پرے کرو۔اب ایڑیاں اٹھا کر لمبا گہرا سانس لو۔سانس روکو— شاباش......''

کلک۔

اب گووند نے کیمرے سے اپنا چہرہ ہٹایا اور اس کی نظروں نے ریکھا کے بدن کا جائزہ لیا۔ کتنی بھوکی نگاہیں تھیں اس کی۔ جیسے ریکھا کو کچا چبا جائیں گی۔ ریکھا کو ایسا محسوس ہوا کہ گووند کی نگاہیں اس کے بدن سے سوئمنگ کا سٹیوم بھی اتارنا چاہتی ہیں۔ ریکھا کو اس کا اس طرح گھورنا بہت برا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی اسے گالی دے رہا ہو۔ اور سب اچھا بھی لگ رہا تھا جیسے اُسے گالی کھانے کی عادت پڑتی جا رہی ہو۔

''جاؤ کپڑے بدل لو، ریکھا۔اب وہ لوگ واپس آنے والے ہی ہوں گے۔''

ریکھا جلدی سے باتھ روم کی طرف چلی۔

''مگر سنو......''

ریکھا گھبرا کر رک گئی۔

''ادھر دیکھو۔''

ریکھا نے مڑ کر دیکھا۔

''میرا انعام؟''

''میں کیا انعام دے سکتی ہوں؟''

''بہت کچھ دے سکتی ہو۔ مگر میں یہ انعام صرف اس صورت میں معاف کروں گا اگر میری فوٹوگرافی کا جادو ''بیگم'' کے ایڈیٹروں پر چل گیا اور تم بیوٹی کوئین چن لی گئیں۔ وعدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمھاری خاموشی کو ہاں سمجھوں گا نا کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ صرف اس صورت میں۔ میں کیمرہ میں سے فلم نکال کر سب تصویریں ابھی خراب کر دوں گا۔''

ریکھا کا جی چاہا کہ ایک بار کہہ دے۔ ''نا۔ نا۔ نا۔ ہزار بار تصویریں جائیں چولہے میں۔ ان کا جو جی چاہے کرو مگر میں تمھاری بات ماننے والی نہیں۔

مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے باتھ روم کے اندر چلی گئی۔ وہاں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ باہر سے گووند کے دیا سلائی گھس کر سگریٹ جلانے اور پھر سیٹی بجانے کی آواز آئی۔

(3)

تصویریں بھیجنے کے ڈیڑھ مہینے بعد ''بیگم'' کے ایڈیٹر کا خط آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ ہزاروں اُمیدواروں میں سے ریکھا کو پہلی دس لڑکیوں میں چن لیا گیا ہے۔ اب اس کو بمبئی آنا ہوگا۔ ٹکٹ کا خرچہ ''بیگم'' کے ایڈیٹر دیں گے، ہوٹل میں اپنے خرچے پر رکھیں گے اور پھر ان دس لڑکیوں کو ایک بھرے مجمع کے سامنے پیش کیا جائے گا اور تب ''مس انڈیا'' کا انتخاب ہوگا۔

ریکھا جس نے ایسے ہی اپنی تصویریں کھنچوا کر چپکے سے بھیج دی تھیں۔ خط پڑھ کر خوشی سے پاگل ہوگئی۔ اس کو تو کامیابی کی ذرا سی بھی امید نہیں تھی۔ سارے ہندوستان کی خوب صورت، امیر اور فیشن ایبل لڑکیوں نے اپنی تصویریں بھیجی ہوں گی اُن سب سے بازی لے جانا کوئی معمولی بات تھوڑا ہی تھی۔ خط ملتے ہی وہ بھاگی بھاگی اپنے باپ کے پاس گئی اور خط دکھایا پڑھتے ہی اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ ''بیٹی۔ یہ کس چکر میں تو نے اپنے آپ کو پھنسا دیا ہے؟''

''پتا جی۔ آپ تو اگلے وقتوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اتنا بڑا اخبار ہے۔ سارے ہندوستان کی تعلیم یافتہ خواتین پڑھتی ہیں۔ اس کی ایڈیٹر ایم اے پی ایچ ڈی ہے۔ اس مقابلۂ حسن کے

سات جج جو ہیں، ان میں سے منسٹر، ڈاکٹر، بیرسٹر، ایڈیٹر سب ہی ہیں۔ بھلا کوئی بری بات ہوتی تو یہ معزز لوگ اس میں شریک تھوڑا ہی ہوتے؟"

"بیٹی۔ ان لوگوں کی اور بات ہے ان کے لیے تو گھڑی دو گھڑی کی تفریح کا ذریعہ ہے مگر تیری تو ساری زندگی کا سوال ہے۔ عزت و آبرو کو لیے کونے میں بیٹھے ہیں تو کیوں دنیا کے سامنے آ کر اپنی اور میری جگ ہنسائی کا سامان کرتی ہے؟"

"پتا جی" وہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی: "آپ تو کبھی اپنے بچوں کی ترقی کی سوچتے ہی نہیں ہیں۔ جانتے ہیں جسے اول انعام ملے گا، اسے دنیا کے سفر کو بھیجا جائے گا۔ واپسی پر فلم اسٹار بننے کا کنٹراکٹ بھی مل سکتا ہے؟ اول انعام نہیں بھی ملا تو "ماڈل" کا کام تو دس کی دس لڑکیوں کو مل جائے گا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ماڈلنگ میں آج کل کتنی آمدنی ہے۔ ہزار، پندرہ سو روپے ماہوار تک کماتی ہیں لڑکیاں اور پھر کپڑے، ساڑیاں، جوتے وغیرہ جن کو پہن کر تصویر کھنچواتے ہیں وہ سب مفت۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔"

اس کے باپ نے ٹھنڈی سانس لے کر ہتھیار ٹیک دیئے۔ "بیٹی ہمارا کام تو سمجھانا بجھانا تھا۔ تو نے فیصلہ ہی کر لیا ہے کہ یہ خراب قدم اٹھائے گی تو جا۔ تجربہ کر کے دیکھ لے۔" اور اس نے عملی مشکلات کی طرف اشارہ کیا۔ "تو وہاں پہنے گی کیا۔ تیرے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔"

"اُس کی فکر مت کرو پتا جی۔" ریکھا نے اپنے باپ کو یقین دلایا ہے کہ میری سہیلی شیلا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سب کپڑے مجھے اُدھار دے دے گی۔ جب لوٹوں گی تو اسے واپس کر دوں گی۔"

اور پھر شیلا کے پاس وہ گئی تھی اور شیلا نے کمال فیاضی کے ساتھ اپنی ساری وارڈ روب کھول کر رکھ دی تھی۔ "جو جی چاہے لے جاؤ۔"

کپڑوں کا چناؤ۔ ریکھا کی زندگی کا سب سے انوکھا سب سے پیارا موقع تھا۔

"یہ چار ساڑیاں لے لوں؟"

"لے لو۔"

"اور یہ چار بلاؤز بھی؟"

''بڑی خوشی سے۔''

اس چوڑی دار پائجامے کے ساتھ یہ قمیض کیسا رہے گا؟''

''بہت اچھا''

''مگر اس کے ساتھ کا دوپٹہ؟''

''اب ڈراپ دوپٹہ کا زمانہ ہے۔دلہنوں کی طرح دوپٹہ اب کوئی نہیں اوڑھتا۔''

''یہ ڈریسنگ گاؤن بھی لے لوں؟''

''ضرور لے لو۔''

''اور یہ بیل باٹم؟''

''یہی تو آج کل کا فیشن ہے۔یہ ضرور پہننا۔''

کپڑوں کا چناؤ ہو گیا تو شیلا نے راز دارانہ طریقے سے ریکھا سے باتیں کیں۔

''ریکھا۔تیری صورت شکل جسم تو بہت اچھا ہے۔تو مس انڈیا بن سکتی ہے۔مگر مجھے ایک بات کی فکر ہے۔''

''وہ کس بات کی؟''

''تو وہاں جا کر گاؤں والوں کی سی باتیں کرے گی تو امپریشن اچھا نہیں پڑے گا اور یہی بیوٹی کوئین بننے میں ایک رکاوٹ بن سکتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہاں بمبئی کے امیر اور روشن خیال نوجوان تمھیں لینے اسٹیشن آئیں گے۔تمھیں اپنی موٹروں میں لیے پھریں گے۔تمھاری مہمان داری کریں گے۔اگر تم نے ان کی دل شکنی کی تو اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔''

''جب وہ میری اتنی مہمان داری کریں گے تو میں اُن کا دل کیوں توڑوں گی؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ تمھیں ڈرنک کرنے کو کہیں اور تم پرانے خیال کی لڑکیوں کی طرح انکار کر دو۔''

''مگر میں نے تو شراب کبھی چکھی بھی نہیں۔''

''کامیابی کا بھی تو تجربہ نہیں ہوا تمھیں۔ وہاں یہ سوشل ایٹی کیٹ میں شامل ہے۔ پسند نہ ہو تو بھی ایک گھونٹ پی لینی چاہیں تاکہ..........''

''ان لوگوں کی دل شکنی نہ ہو؟''

''بالکل۔ اب تم بات سمجھتی جارہی ہو۔ ان میں سے کئی فلم پروڈیوسر ڈائریکٹر ہوں گے جو تمھیں فلم اسٹار بنا سکتے ہیں۔ کئی ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کے مالک اور افسر ہوں گے۔ جب تم فلم اسٹار نہ بنیں تو ''ماڈل'' کا کام تمھیں دے سکتے ہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں ''ماڈلنگ'' کرتے کرتے فلم اسٹار بن گئی ہیں۔ سمجھ گئیں نا؟''

''سمجھ گئی۔''

''ہاں ایک بات اور ہے وہ گووند بھیا سے کیا شرط ہوئی ہے تمھاری؟''

''شرط؟ میری؟ — اوہ۔ وہ تو ایسے ہی تصویریں کھینچتے وقت مذاق کر رہے تھے۔''

''خیر۔ جو بھی ہو۔ وہ کہتے ہیں ریکھا کو یاد دلانا کہ مس انڈیا بن جائے تو میری شرط — اور میرا انعام — نہ بھولے۔ گووند بھیا بڑے اچھے ہیں نا؟''

''ہاں شیلا۔ بہت اچھے ہیں۔ انھوں نے میری اتنی اچھی تصویریں نہ کھینچی ہوتیں تو آج یہ دن دیکھنا کبھی نصیب ہوتا؟''

(4)

اور اب ریکھا باتھ روم میں کھڑی دروازے میں لگے قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

کہاں سے میں کہاں آ گئی ہوں! اس نے سوچا۔ مگر اُس نے یہ بھی سوچا کہ اس حالت میں کیا کچھ سوچنے کے قابل ہوں؟ سنا تھا کہ شراب پینے سے عقل خبط ہو جاتی ہے، انسان کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر اس نے تو شامپین کے کئی گلاس پیئے تھے۔ اس کے سر میں زور کا درد ہو رہا تھا، سر چکرا بھی رہا تھا یا یہ باتھ روم چکر کھا رہا تھا؟ اسے بار بار اُبکائی آتی تھی اور ہر ڈکار میں شامپین کا کھٹا میٹھا پھیکا کڑوا مزا تھا۔ کیا اسی کو نشہ کہتے ہیں؟ اس نے لاپرواہی سے کپڑے اتارتے ہوئے سوچا۔ کیونکہ آئینہ میں اسے اپنی صورت کے علاوہ وہ ٹب بھی نظر آ رہا تھا اور وہ گرم

پانی سے بھرا سفید خوب صورت ٹب اسے بلا رہا تھا کہ آؤ میری بانہوں میں آ جاؤ، اپنے بدن کو، اپنی ہستی کو، اپنی مستی کو، اپنی زندگی کو میرے پانی میں ڈبو دو، میری قبر جیسی گہرائی میں دفنا دو۔

میں بھی کہاں سے کہاں آ گئی ہوں! اس نے پھر سوچا جیسے شرابیوں کو ایک ہی بات کے دہرانے کی لت لگ جاتی ہے اس کو ایک ہی خیال بار بار آ رہا تھا۔ کبھی اس کو گدگداتا تھا، کبھی اسے چھیڑتا تھا، کبھی اس کا منہ چڑاتا تھا، کبھی اس کو آئینہ دکھاتا تھا۔ میں بھی کہاں سے کہاں آ گئی ہوں۔

مدھیہ پردیش کے قصبہ رائے پور سے بمبئی۔

رام گلی سے جوہو کے سن رائز ہوٹل میں۔

ایک ٹوٹے پھوٹے مکان سے ہوٹل کے اس کمرے میں جس کا باتھ روم اتنا بڑا تھا جتنا ان کا سارا آنگن۔ جہاں گرمی کے موسم میں تین چار پائیاں بچھا کر ان کا سارا خاندان سویا کرتا تھا۔

اور گووند جیسے بھدی اور بھونڈی حرکتیں کرنے والے چھوکرے سے رمیش جیسے امیر، خوب صورت، اسمارٹ، مہذب اور شریف آدمی تک، اس نے اپنی میل ملاقات کے حلقے میں کتنی ترقی کی ہے! مانا کہ رمیش کے بال کھچڑی ہو گئے ہیں مگر جیسا اس نے بتایا وہ نزلے کی وجہ سے بچپن سے ہی ایسے ہی ہیں۔ مگر کتنا شاندار اور مردانہ جسم پایا ہے اس نے۔ کتنی نرم گفتگو کرتا ہے وہ جیسے اس کے منہ میں گلاب جامن گھلے ہوئے ہوں۔ جب سے ریکھا کو اس نے ریلوے اسٹیشن پر ''مس انڈیا'' کے مقابلے کی کمیٹی کی طرف سے خوش آمدید کہا تھا اس کا کتنا خیال رکھتا تھا وہ۔ اپنی لمبی چوڑی موٹر میں خود ڈرائیو کر کے وہ ریکھا اور اس کے ٹوٹے پھوٹے ٹین کے سوٹ کیس کو ہوٹل تک لایا تھا۔ راستے میں کتنی مزیدار باتیں کی تھیں۔ بمبئی کی مشہور عمارتیں دکھائی تھیں۔ ریکھا کا کمرہ اس نے پہلے سے پسند کر رکھا تھا۔ اس کو پہنچانے وہ کمرہ تک آیا تھا۔ اس کے آرام کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ سنگھار میز پر ہر قسم کا میک اپ کا سامان لگا ہوا تھا۔ بستر پر ایک ہلکا نیلا نائلون کا جھاگ جیسا نائٹ گاؤن پڑا تھا۔ نیچے نازک سے ہلکے نیلے سلیپر پڑے تھے باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس نے دکھایا تھا۔ ''دیکھیے ٹب میں گرم پانی بھی موجود ہے آپ کے غسل کے لیے۔''

''تو میں نہا لوں؟''

''ضرور نہایے۔ راستے کی تکان دور ہو جائے گی۔ آج رات کو میری ایڈورٹائزنگ کمپنی کی

طرف سے جو اس ''مس انڈیا'' کے مقابلۂ حسن کا سارا خرچہ برداشت کر رہی ہے ان سب لڑکیوں کی دعوت ہے جو اس مقابلے کے لیے آئی ہیں۔''

ریکھا انتظار کرتی رہی کہ رمیش صاحب جائیں تو میں اپنا سوٹ کیس کھولوں۔ کپڑے نکالوں اور نہانے کے لیے جاؤں۔ کیوں کہ اس شاندار ماحول میں اس کو اپنے ٹین کے سوٹ کیس کو ہاتھ لگاتے شرم آتی تھی۔ مگر رمیش وہیں صوفے پر بیٹھا ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ جلاتا رہا۔

''پہلے کچھ پی لیجیے۔'' آخر اس نے مسکراتے ہوئے تجویز کیا۔

''کیا؟— چائے؟ منگا لیجیے۔'' ریکھا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ سوچا چائے پی کر یہ چلے جائیں گے تو میں اطمینان سے نہا کر کپڑے بدل سکتی ہوں۔ ''چائے؟'' اور رمیش اس طرح کھل کھلا کر ہنسا جیسے ریکھا نے کوئی بڑا مذاق کیا ہو۔'' بھئی واہ کیا بھولی بات کی ہے آپ نے ریکھا جی!۔ آپ اپنی زندگی کے حسین ترین موڑ پر کھڑی ہیں اور صرف چائے پینا چاہتی ہیں؟ آج کے دن تو آپ وہسکی، برانڈی، جن ورموتھ کی بھی فرمائش کرتیں تو میں رد کر دیتا۔ آج تو صرف شامپین پینے کا دن ہے، ریکھا جی— کیوں؟''

ریکھا نے ایک رسالے میں تصویر دیکھی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی شامپین کے گلاس ہاتھ میں لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ بڑا رومانی منظر تھا۔

پھر بھی اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''شامپین میں نشہ زیادہ تو نہیں ہوتا؟'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے آج تک کبھی شراب چکھی نہیں مگر شیلا کی وارننگ یاد آ گئی۔ ''میں زیادہ پینے کی عادی نہیں ہوں، رمیش جی۔''

''تو آپ کو زیادہ پینے کو کون کہہ رہا ہے۔ بس آپ کی کامیابی کے لیے ایک جام صحت پئیں گے۔ اور یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ شامپین میں نشہ ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ نشہ تو کوکا کولا میں ہوتا ہے۔''

اور یہ کہہ کر اس نے بجلی کی گھنٹی بجائی اور جب بیرا داخل ہوا تو اس کو آرڈر دیا۔ ''بیرا جو شامپین کی بوتل ہم نے برف میں لگا رکھی ہے وہ لے آنا اور دو شامپین گلاس۔''

بیرا گیا تو ریکھا نے پوچھا۔ ''رمیش جی۔ شامپین میں کیا ہوتا ہے؟''

"شامپین تو بس انگوروں کا رس ہوتا ہے۔ مگر یہ انگور فرانس کے خوب صورت مقام شامپین میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے ان میں فرانس کا حسن، فرانس کی نزاکت، فرانس کی کلچر گھلی ہوتی ہے۔"

بیرا ایک چاندی کے ٹرے میں رکھ کر "آئس پیل" میں لگی ہوئی شامپین کی بوتل اور دو نازک سی ڈنڈی کے بلوری گلاس لایا اور میز پر رکھ کر چلا گیا۔

رمیش نے بوتل کو برف میں سے اٹھایا، اسے چھو کر دیکھا، پھر مشاقانہ ہاتھوں سے کاک کھولا...... دفعتاً ایک پٹاخے جیسی آواز ہوئی جسے سن کر ایک لمحے کے لیے تو ریکھا ڈر گئی کہ کہیں بوتل نہ پھٹ گئی ہو۔

"ڈر گئیں، ریکھا جی؟" رمیش نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تو آپ کی نئی زندگی کو شامپین کی بوتل نے سلامی دی ہے۔" اور پھر اس نے دونوں گلاسوں میں ایک ہلکے سنہری رنگ کی سیال ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ انگوروں کا رس نہیں ہے، ریکھا جی۔ یہ حسن اور جوانی کا رس ہے۔ نوش فرمائیے۔"

ریکھا نے ہچکچاتے، ڈرتے ڈرتے گلاس اٹھایا۔ گلاس کی ٹھنڈک اس کی انگلیوں کو اچھی لگی۔ خوشبو بھی بری نہیں تھی۔ "شاید مزیدار بھی ہو۔ انگوروں کا رس ہی تو ہے۔"

رمیش نے ریکھا کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا اور کہا۔ "ہیرز ٹو یور سکسیس۔ یہ آپ کی کامیابی کے لیے ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونٹ لیا اور ہونٹوں سے چٹخارا لیا۔ "بہت بڑھیا ہے۔ آپ لیجیے نا، ریکھا جی۔"

دل کڑا کر کے ریکھا شامپین کا ایک گھونٹ پی ہی گئی۔ کچھ کھٹا۔ میٹھا۔ کچھ پھیکا۔ عجیب سا مزا تھا۔ مگر یہ ہلکی ہلکی سی آنچ اس کے گلے میں کیسی محسوس ہو رہی تھی؟

"لیجیے لیجیے۔ ایک گھونٹ اور پیجیے نا۔ ریکھا جی۔"

ریکھا نے ایک گھونٹ اور پیا اور ہنس پڑی۔ میں شامپین پی رہی ہوں" میں رائے پور کی رہنے والی ریکھا! شیلا دیکھے گی تو کتنی جلے گی! بھنگی کہیں کی! اور یہ سوچ کر وہ پھر ہنس پڑی۔

اُس کا گلاس کب خالی ہوا اور کب بھرا گیا یہ کچھ ٹھیک سے نہ معلوم ہو سکا۔ مگر گلاس میں شامپین کے بلبلے ہنس رہے تھے جیسے ریکھا خود ہنس رہی تھی۔ بلبلے بنتے تھے، ٹوٹتے تھے، ابلتے

تھے، اس کے ہونٹوں کو گدگداتے تھے۔ اس کی زبان پر سے پھسلتے ہوئے اس کے حلق میں گرتے جاتے تھے۔ کیا یہ بلبلے آگ کے بنے ہوئے ہیں؟ اس نے سوچا۔ اگر آگ نہیں ہے تو پھر میرے تن بدن میں یہ آنچ کہاں سے آئی، گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ساڑی کے پلّو سے اپنے آپ کو پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔

''گرمی لگ رہی ہے کیا؟'' رمیش نے گلاس میں شامپین انڈیلتے ہوئے پوچھا مگر اس کی نگاہیں وہاں تھیں جہاں کچھ عرصے پہلے ساڑی کے پلّو نے سینے کو ڈھانپا ہوا تھا۔

نہ جانے کیوں جواب میں ریکھا ہنس دی۔ ''جی ہاں۔ گرمی کیا۔ ایسا لگتا ہے سارے بدن میں آگ لگ رہی ہے؟''

اب رمیش بھی ہنس پڑا۔ گلاس بڑھاتے ہوئے بولا۔'' آگ لگ رہی ہے تو اس آگ کو شامپین سے بجھایئے۔''

ریکھا نے گھور کر رمیش کو دیکھا۔ اُسے وہ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ کتنا اچّھا آدمی ہے! اور کتنا سمجھدار۔ آگ بجھانے کے لیے شامپین فوراً حاضر کر دی۔

''شکریہ، رمیش جی'' اور اس نے گلاس گلے میں انڈیل لیا۔

''دیکھو بھئی اب یہ رمیش جی ریکھا جی والا تکلف نہیں چلے گا۔ کیوں ریکھا؟''

ریکھا کو بھی رمیش جی کہنا نہایت نامناسب معلوم ہوا۔ ''یس، رمیش۔'' اس نے کہا۔

''ریکھا!''

''ہاں، رمیش!''

''ریکھا!'

یس رمیش!''

''ریکھا ڈیر!''

''تم کتنی اچھی ہو کتنی سویٹ!''

''تم کتنے اچھے ہو رمیش۔''

پھر دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ اتنے قریب کہ رمیش کا گرم سانس ریکھا

اپنے گالوں پر محسوس کر سکتی تھی۔

اور پھر دفعتاً اس کے اندر کی سوئی ہوئی ریکھا بیدار ہو گئی۔

''نہیں۔نہیں'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا، ریکھا؟ میرے پاس آؤ۔''

''نہیں نہیں۔''

''کیوں نہیں۔''

''بوتل خالی ہو گئی!'' ریکھا نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھتے نہیں میرے تن بدن میں آگ لگی ہے۔اس آگ کو بجھانے کے لیے اور شامپین چاہیے۔آپ نے ہی تو کہا تھا۔''

''تو ریکھا ڈیر۔اب تم نے کافی پی لی ہے۔ بلکہ کافی سے بھی زیادہ۔تم اب باتھ روم میں جاؤ۔نہانے کے لیے۔میں ابھی آتا ہوں۔''

ریکھا پھر ہنس پڑی۔

''آپ آئیں گے نا؟''

''ہاں ہاں ضرور آؤں گا۔''

ریکھا نے خالی بوتل کی گردن پکڑ کر اٹھالی اور اسے ہتھیار کی طرح سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اور اگر آپ نہیں آئے؟''

''تو جو چور کی سزا سو میری سزا۔ بائی بائی، ڈارلنگ۔'' یہ کہا اور وہ چلا گیا۔اور اس وقت ریکھا اس بات پر چونکنے ہونے کے قابل نہیں تھی کہ رمیش باہر نہیں گیا بلکہ اندر کے ایک دروازے سے برابر والے بیڈ روم میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

(5)

اور اب ریکھا کپڑے اتار کر اپنے آپ کو قدم آدم آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ واقعی میں ہوں؟ اس نے سوچا اور پھر آپ سے آپ مسکرا دی۔ رمیش اس حالت میں اسے دیکھ لے تو کیا سوچے، کیا کہے، کیا کرے؟ وہ باتھ روم میں ننگی کھڑی تھی لیکن اس کے بدن میں آگ ابھی تک

لگی ہوئی تھی۔ آگ لگے تو کیا کرنا چاہیے؟ رمیش نے کہا تھا شامپین پینی چاہیے۔ آگ بجھانے کے لیے آگ؟ بھئی واہ یہ تو خوب بات ہوئی۔ ریکھا خود ہی خود ہنس پڑی۔ پھر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو پیچھے سفید ٹب نظر آیا جس میں لبالب بھرا ہوا پانی چھلک رہا تھا۔ گلاس میں بھری ہوئی شامپین کی طرح۔ اب اس نے مڑ کر ٹب کو دیکھا جو گویا بانہیں کھول کر اس کو اپنی آغوش میں بلا رہا تھا۔ پانی میں کوئی خوشبو بھی ملی ہوئی تھی۔ ٹب کا پانی گرم تھا۔ اس میں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور بھاپ کے ساتھ مستی بھری خوشبو کا بھپکا ریکھا کے نتھنوں کو گدگدا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ڈبو کر دیکھا۔ پانی گرم تھا لیکن صرف خوشگوار حد تک۔

اس نے پہلے ایک ٹانگ ٹب میں دھری پھر دوسری، پھر پانی میں بیٹھ گئی، پھر لیٹ گئی۔ آج اسے اپنے جسم کے حسین ہونے کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر پیار آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اپنے سارے جسم کا جائزہ لے رہے تھے، سوئے ہوئے احساسات جاگ رہے تھے اور اس کے دماغ کو نیند آ رہی تھی۔ نرم گرم پانی تھپک تھپک کر لوریاں سنا تا رہا اور آخر کار ٹب کی آغوش میں اُسے نیند آ گئی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ پریوں کے دیس میں ہے اور اڑنے والے مخملی قالین پر لیٹی ہوئی ہے۔ قالین ساری دنیا کے اوپر سے اُڑتا جا رہا ہے اور دنیا والے کہہ رہے ہیں، وہ دیکھو، ملکۂ حسن سندرتا کی رانی۔ بیوٹی کوئین ریکھا کی سواری آ رہی ہے اور ریکھا کو خواب میں بھی یہ محسوس ہوا کہ اُس کے تمام سنہری سپنے سچے ہو گئے ہیں۔

مگر پھر نہ جانے کہاں سے ایک طوفان آیا۔ تیز ہوا کے جھکڑ، آندھی، بارش، موسلا دھار گیلا ہو کر اُڑنے والا قالین اڑنے کے قابل نہ رہا۔ ریکھا نے محسوس کیا کہ وہ تیزی سے زمین کی طرف جا رہی ہے اور بارش کے قطرے جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں اور تیروں کی طرح تیز ہیں اس پر موسلا دھار برس رہے ہیں اور اس کو نہیں معلوم کہ یہ تیر پہلے اس کے سینے کے پار ہو جائیں گے یا وہ آسمان سے زمین پر گر کر پاش پاش ہو جائے گی۔

جب اس کو ہوش آیا تو وہ بدستور ٹب کے گرم پانی میں لیٹی ہوئی تھی مگر اس کے اوپر "شاور باتھ" کے فوارے سے ٹھنڈی بوندوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سر پر ٹھنڈے پانی کی مار سے شامپین

کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی ریکھا نے سوچا۔ یہ فوّارہ تو بند تھا اسے کس نے کھولا؟

جواب میں ایک مردانہ قہقہہ سنائی دیا۔ نظر اُٹھا کر دیکھا کہ رمیش ایک تولیے کی باتھ گاؤن پہنے باتھ روم میں کھڑا ہے اور ایک بڑا تولیہ اس کی طرف بڑھا رہا ہے۔

''ڈارلنگ بہت سوچ چکیں۔ اب ٹب سے باہر نکل آؤ تو کام کی بات کریں۔''

دفعتاً ریکھا کو یاد آیا کہ وہ پانی سے باہر نکلے گی تو برہنہ ہوگی اس لیے وہ ٹب میں اور نیچے سرک گئی۔

''آپ یہاں کیسے آئے؟ باتھ روم کے باہر جایے۔ تب ہی میں نکل سکتی ہوں۔''

''ڈارلنگ ریکھا۔ میں تو سمجھتا تھا آدھ گھنٹہ تمھارے غسل کے لیے کافی ہوگا۔ کیا معلوم تھا تم یہاں سو رہی ہو۔ وہ تو اچھا ہوا میں آگیا ورنہ حیادار لڑکیوں کے لیے ڈوبنے کے لیے ٹب کا پانی بھی کافی ہوتا ہے۔''

رمیش کو مسکراتا دیکھ کر ریکھا کو احساس ہوا کہ بے خیالی میں سینے تک اس کا دھڑ پانی سے باہر آگیا ہے۔ وہ فوراً اندر کو ہو گئی مگر اب اس کا نشہ کافور ہو چکا تھا۔ وہ ڈانٹ کر بولی۔

''مسٹر رمیش، میں بھی ایک حیادار لڑکی ہوں۔ آپ باہر جایے۔''

''یہ کیا تکلف ہے ڈارلنگ۔ یہ لو میں تولیہ لیے کھڑا ہوں۔ تمھیں شرم آتی ہے تو اس کا پردہ کیے لیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے تولیے کو ان دونوں کے درمیان دیوار بنالیا اور منہ دوسری طرف کرلیا۔

ریکھا کن انکھیوں سے رمیش کو دیکھتی ہوئی، پانی چھلکاتی ہوئی ٹب کے باہر نکلی اور تولیہ جھپٹ کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔

اب رمیش نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈارلنگ۔ اب تو تم اور بھی سندر دکھائی دیتی ہو۔ پارٹی میں جانے کو گھنٹہ بھر باقی ہے۔ کیوں نہ اس وقت کا کوئی خوب صورت استعمال کیا جائے۔''

یہ کہہ کر وہ ریکھا کی طرف بڑھا۔ اور تولیے سمیت اس کو اپنی بانہوں میں گرفتار کرلیا۔ اب ریکھا نے رمیش کے چہرے کو اپنی آنکھوں کے بالکل قریب دیکھا۔ ایسا لگتا تھا یہ چہرہ اس نے پہلی بار دیکھا ہے۔ گالوں پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بال نزلے سے سفید نہیں ہوئے تھے،

آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں مگر ان میں ہوس کی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ دن بھر کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور منہ سے بدبو کا بھپکا اُٹھ رہا تھا اور اب یہ بھپکا اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''ڈارلنگ میں زبردستی کبھی نہیں کرتا۔ بلانے سے آتا ہوں۔''

ریکھا نے اپنی مجبوری اور لاچاری کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا اگر اس کو دھکا دے کر علیحدہ کرتی ہے تو تولیہ کا پردہ بھی جائے گا اور اگر نہیں کرتی تو......

''آپ کو کس نے بلایا تھا؟''

''ڈارلنگ ریکھا۔ بھولتی ہو۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ اگر نہ آئے تو جو چور کی سزا ہوتی ہے وہ دوں گی؟''

شاہین کے نشے میں اس نے کیا کہا تھا، کیا نہیں کہا تھا، اس پر بحث کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ریکھا نے کہا۔ ''رمیش جی۔ مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔''

اب رمیش کے چہرے پر ایک خوفناک کرختگی کے آثار پیدا ہوئے تھے ''دیکھو، ریکھا۔ تم لڑکیاں ہر چیز کو مذاق سمجھتی ہو۔ جب جی چاہا انگلی کے اشارے سے بلا لیا۔ جب جی چاہا دھتکار دیا۔ رمیش کے ساتھ یہ چوہے بلی کا کھیل نہیں چلے گا۔''

''رمیش جی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ میں آپ کی بیٹی کے برابر ہوں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

'تو پھر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگو۔'' اور اس نے ریکھا کو اپنی پکڑ سے آزاد کر دیا۔

وہ سمجھی جان بچ گئی۔ تولیے کو کندھے پر ڈالتے ہوئے ہاتھ جوڑے ہی تھے کہ رمیش کے بے رحم ہاتھوں نے اس کے بدن سے تولیہ جھپٹ لیا اور سارا باتھ روم ایک خوفناک قہقہہ سے گونج اٹھا۔

''ڈارلنگ۔ ایسا خوب صورت جسم چھپاتی ہو؟ تمھیں تو اس کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرنی چاہیے۔ بڑے کام کی چیز ہے۔ سچ کہتا ہوں کل۔۔۔''

اس سے آگے رمیش کچھ نہ کہہ سکا۔ سر سے پیر تک ننگی ریکھا میں نہ جانے کہاں سے اس بلا کی ہمت اور طاقت آ گئی تھی کہ شیرنی کی طرح وہ جھپٹ پڑی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ہی ایک ہتھیار بنا کر رمیش کے منہ پر دے مارا۔ اس کے ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ پنجوں کی

طرح نوچنے کھسوٹنے کے کام آئے۔ ایک حملے ہی میں رمیش کے چہرے پر خراشیں ابھر آئیں۔

"حرام زادی!" اب تو رمیش بھی اپنی اصلیت پر اتر آیا تھا۔ ہاتھا پائی میں گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ "حرام زادی۔ شریف آدمیوں پر ہاتھ اٹھاتی ہے۔" ریکھا کا ہاتھ اس کی پکڑ میں آ گیا تو اس کو ہی اس نے مروڑ دیا۔ ریکھا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ رمیش نے بانہوں کو اور مروڑا۔ ریکھا ڈرتی تھی کہ ذرا اور دبایا تو اس کی کلائی ٹوٹ جائے گی۔ رمیش کا منہ اس کے منہ کی طرف آ رہا تھا۔ "کیوں سالی بول۔ اب کیا کہتی ہے؟"

ریکھا نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہونٹ بھینچ لیے۔ جب بدبودار بھپکا اس کے قریب آ گیا تو اس نے بظاہر لاچاری سے ہونٹ کھول دیئے۔ رمیش کے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹ میں پیوست ہو گئے اور اس کی گرفت کلائی پر سے ڈھیلی ہو گئی۔ اس دم رمیش کو ایسا محسوس ہوا کہ رانی کے دانتوں نے اس کے ہونٹوں کو کاٹ کھایا ہے۔ درد سے بلبلا کر اس نے بے تحاشا اس زور کا دھکا دیا کہ ریکھا کا سر پہلے دیوار سے اور پھر ٹب کے تیز کنارے سے اور اُنیس برس کی لڑکی کے تمام سنہری خواب، اس کی تمام امنگیں اور حسرتیں اس کے تمام ارمان ابلے ہوئے خون کے بھنور میں ڈوب گئے۔

رمیش نے گھبرا کر پہلے لڑکی کی پتھرائی ہوئی مگر کھلی آنکھوں کو دیکھا جو خاموشی سے اسے تکے جا رہی تھیں، پھر تکلیف کا احساس ہوا تو ہاتھ میں جو گیلا تولیہ تھا اس سے اپنے ہونٹوں کو چھوا۔ دیکھا تو تولیہ کے کنارے پر خون کا بڑھتا ہوا دھبہ پایا۔

اس نے تولیہ پانی کے ٹب میں پھینک دیا۔ پھر خاموشی سے جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر ہونٹوں کے زخموں پر یوڈی کولون لگائے۔ پھر شیو کیا تاکہ معلوم ہو شیو کرتے ہوئے غلطی سے کٹ گیا ہے۔ پھر کپڑے بدل کر اس نے گھنٹی بجائی اور اسی بیرے کو بلایا جس نے انہیں شامپین دی تھی۔

"شامپین کا بل لاؤ۔"

"ابھی لایا صاحب۔"

بیرہ جب بل لے کر واپس آیا تو صاحب کو ٹیلی فون پر برابر کے کمرے والی میم صاحب

سے باتیں کرتے پایا۔

''ہیلو ریکھا'' وہ کہہ رہا تھا۔ تم اب تک نہا کر تیار نہیں ہوئیں مجھے تو انتظام کرنے کے لیے پہلے جانا ہے۔ میں جا کر موٹر بھجوائے دیتا ہوں۔ تم گھنٹہ بھر میں تیار رہنا۔ اچھا۔ بائی۔ بائی۔''

فون نیچے رکھ کر رمیش نے بل کے علاوہ بیرے کو دس روپیہ ٹپ دیا۔ پھر بیرے کو کمرہ ٹھیک کرنے کے لیے چھوڑ کر وہ سیٹی بجا کر باہر نکل گیا اور موٹر لے کر اپنی پارٹی میں چلا گیا۔

(6)

اگلے دن جب بیوٹی پریڈ ہوئی تو صرف نو لڑکیاں حاضر تھیں۔

اُس دن کے اخبار میں چھپا تھا کہ مس ریکھا رام داس رائے پور کی انیس سالہ حسینہ اپنے ہوٹل کے باتھ روم میں مری ہوئی پائی گئی۔ اس افسوسناک موت کی وجہ ایک صابن کی ٹکیہ بتائی گئی جس پر پھسل جانے سے بے چاری لڑکی سر کے بل ٹب کے تیز فولادی کنارے پر جا گری تھی۔

مگر مہینوں تک ہوٹل میں اُترنے والے مسافر کمرہ نمبر تیرہ میں ٹھہرنے سے انکار کرتے رہے کیوں کہ اس کے باتھ روم کے ٹب پر وہ خون کا نشان اب تک پایا جاتا تھا اور اس کو کسی تیزابی مسالہ سے بھی دور نہ کیا جا سکا۔ آخر کار ہوٹل کے مالک نے کمرہ کا نمبر بدل کر بارہ (اے) کر دیا اور وہ ٹب نکال کر باہر کمپاؤنڈ میں کوڑے پر پھنکوا دیا جہاں سے بھیکو نے اسٹرائیک کرنے والے بیروں کی مدد سے اُسے اٹھا کر اپنے کھنڈر پر رکھ لیا۔ ٹب کے بعد تو کھنڈر پر رکھنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں رہی تھی لیکن بھیکو نے سوچا چھوٹی موٹی چیزیں ملیں تو ٹب کے اندر ہی رکھ لوں گا۔

ایک چھوٹی موٹی اور کام کی چیز تو تھوڑی دور پر ہی ایک مکان کے پاس پڑی مل گئی۔ یہ ایک پیتل کا اسٹوو تھا جو جل جانے سے کالا پڑ گیا تھا مگر شاید تھوڑی سی مرمت کر کے اب بھی اسے چالو کیا جا سکے اور بھیکو سوچتا رہا کہ ایسی کام کی چیز کو کس بیوقوف نے کوڑے پر پھینک رکھا ہے — اور کیوں؟

O

قصہ ایک جلے ہوئے اسٹوو کا!

(1)

شانتا اپنے کچن میں کھڑی پرائمس اسٹوو میں ہوا بھر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ساری بمبئی میں اب گیس کے سلنڈر استعمال ہوتے ہیں صرف ہمارے گھر میں یہ دقیانوسی اور خطرناک چولہا کیوں ہے؟

اس کا شوہر شیئر بازار کا دلال تھا۔ ہزار پندرہ سو روپے ہر مہینے گھر میں لاتا تھا۔ وہ اب بھی دو کمروں کے فلیٹ میں ہی رہتے تھے جس کا پرانا کرایہ صرف پینتالیس روپیہ ماہوار تھا مگر فلیٹ میں ضرورت کی سب چیزیں موجود تھیں صرف ایک گیس کا چولہا نہیں تھا۔ اچھا بڑھیا ریڈیو تھا کیونکہ ہر شام کو چھگن لال مارکیٹ کی خبریں بڑے غور سے سنتا تھا۔ اور اپنا لال کھاتہ لے کر اس میں بازار کی اونچ نیچ کر جاتا تھا۔ ریفریجریٹر تھا۔ کیوں کہ چھگن لال اور اس کی ماں کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ذرا سا بھی بچا ہوا کھانا پھینک دیا جائے یا کسی بھکاری کو دے دیا جائے۔ دو بھاری بھاری فولادی الماریاں تھیں۔ ایک میں سب کے کپڑے رہتے تھے۔ دوسری الماری میں چھگن لال اپنے بہی کھاتے رکھتا تھا۔ ویسی وہسکی کی بوتل رکھتا تھا۔ جس میں سے ناپ تول کر دو پیگ ہر رات پیتا تھا۔۔ ایسی باقاعدگی اور اہتمام سے جیسے کوئی پوجا کرتا ہے۔

پہلے وہ نہاتا دھوتا، پھر دُھلی ہوئی دھوتی باندھتا، اور پھر اگر کی بتیاں جلاتا، پھر دیوار پر لگی ہوئی دیوی دیوتاؤں کی تصویروں کو پرنام کرتا تب وہسکی کی بوتل اور گلاس لے کر بیٹھتا تھا۔ اس کی ماں اس وقت ہنومان جی کے مندر سے پوجا کر کے لوٹتی۔ چھگن لال ماں کے دیے ہوئے پرشاد کو ہاتھ جوڑ کر لیتا اور پھر وہسکی کے ایک گھونٹ کے ساتھ نگل جاتا۔ اُن کے کمرے میں ایک بہت بڑا چھپر کھٹ بھی تھا جس پر چھگن لال شراب پی کر، کھانا کھا کر سو جاتا تھا۔ بیوی چھپر کھٹ کے نیچے زمین پر بستر کر کے سوتی تھی۔ سونے سے پہلے پتی کی ٹانگیں دباتی تھی اور اکثر ٹانگیں دبواتے دبواتے ہی وہ خراٹے لینے لگتا تھا۔ شروع شروع میں ہر تیسرے دن پھر ہر ہفتہ، پھر ہر مہینے— چھگن لال کا ہاتھ لٹک کر شانتا کے مونڈھے کو ہلاتا تھا۔ چند منٹ کے لیے اس کو بھی چھپر کھٹ پر آنے کی اجازت مل جاتی تھی اور میاں بیوی کے رشتے پر چھگن لال کی واسنا کی مہر لگ جاتی تھی اور شانتا پھر چھپر کھٹ سے زمین پر واپس آجاتی اور بڑی دیر تک چپ چاپ اندھیرے کو تکتی رہتی۔

شانتا اور چھگن لال کی شادی کو چھ برس ہونے کو آئے تھے۔ چھگن لال بیوی کو راج کوٹ سے بیاہ کر لایا تھا۔ ان کی سگائی جب ہوئی تھی تو شانتا کا باپ راج کوٹ کا بڑا بیوپاری کہلاتا تھا۔ اس وقت چھگن لال نے بمبئی میں دلالی کا دھندا شروع ہی کیا تھا مشکل سے دو تین سو روپے کی آمدنی تھی۔ لیکن اس کو— اور اس کی بیوہ ماں کو— امید تھی کہ شانتا کا باپ جہیز میں بڑی رقم دے گا اور اس کی مدد سے چھگن لال کا دھندا چمک جائے گا۔ اس لیے جب ماں نے کہا کہ شادی سے پہلے وہ اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ لے تو چھگن لال نے ہنس کر کہا تھا۔ ''ماں مجھے کیا دیکھنا ہے۔ تو نے دیکھ لیا تو بس کافی ہے۔ بھینگی نہ ہو، کانی نہ ہو، بہت کالی نہ ہو کہ ملنے جلنے والے مجھ پر ہنسیں۔ بس اور کچھ نہیں دیکھنا۔ ہاں جہیز میں جو رقم ملے وہ نوٹ گن کر سنبھال لینا۔'' یہ بات وہ ہنسی ہنسی میں کہتا تھا۔ مگر سچی بات بھی یہی تھی کہ شانتا جہیز میں کتنی رقم لائے گی اس کے علاوہ چھگن لال کو اپنے بیاہ میں، اپنی بیوی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

لکشمی دیوی شاید چھگن لال سے یا شاید شانتا کے باپ سے روٹھی ہوئی تھیں۔ شادی سے چند روز پہلے اور دیوالی کے چند روز بعد شانتا کے باپ کا دیوالہ نکل گیا تھا اور وہ جہیز میں وہ رقم نہ دے سکا تھا۔ جس کا چھگن لال کی ماں سے وعدہ کیا تھا۔ شادی کے کارڈ تقسیم ہوئے تھے۔ پھر بھی

ماں نے بیٹے سے کہا تھا۔ "تو کہے تو اب بھی انکار کر دوں۔" پر چھگن لال نے نہ جانے کیا سوچ کر کہہ دیا تھا۔ "چھوڑو ماں۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہوگا۔ اب دوسری کہاں ملے گی؟ اور پھر کچھ سوچ کر۔ "کم سے کم تمھیں کھانا بنانے کی جھنجھٹ سے چھٹی مل جائے گی۔"

شادی کی رات کو چھگن لال نے بیوی کو دیکھا۔ جو پری یا فلم اسٹار جیسی خوب صورت تو نہیں تھی لیکن بیاہ کے لال جوڑے میں اچھی خاصی لگ رہی تھی۔ چھگن لال نے خاموشی سے اپنا حق شوہری جتاتے ہوئے سوچا "چلو۔ اچھا ہے۔ صحت کے لیے اب باہر منہ کالا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"کچھ بات کیجیے نا!" اس نے ایک رات کو ہمت کر کے کہہ ہی دیا تھا۔ "مجھے اچھا لگتا ہے!"

"ش ش۔" چھگن لال نے اُسے چپ رہنے کو کہا تھا۔ "بے شرم کہیں کی! ماں برابر کے کمرے میں سو رہی ہے۔"

اور سوشانتا کے من کی دنیا ویران سنسان ہی پڑی رہی۔

اس کے بعد شانتا اور چھگن لال کے تعلقات پر ایسا کالا سناٹا چھا گیا جس میں کوئی ستارہ بھی نہیں ٹمٹماتا تھا۔

تیسرے دن سے ہر ہفتہ۔ ہر ہفتہ سے ہر مہینے جب شانتا کو چھپر کھٹ پر آنے کی دعوت دی جاتی تھی تو وہ پتی کی پیاس بجھا کر وہاں سے خود پیاسی ہی لوٹتی اور گھنٹوں اندھیرے کو تکتی رہتی۔

شانتا کے باپ کا دیہانت تو بیٹی کی شادی کے چند مہینے بعد ہی ہو گیا تھا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اس لیے ایک دفعہ بمبئی آئی تو راج کوٹ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ دور رشتے کے ماما ماسی تھے اُن کا کبھی کبھار خط آ جاتا تھا۔ لیکن چھگن لال اور اُس کی ماں کو اس کا بیس پیسے ڈاک پر خرچ کرنا بھی برا لگتا تھا، سو شانتا نے جواب دینا چھوڑ دیا اور کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ اب اُس کی ساری زندگی اُن دو کمروں تک محدود تھی۔ پھر بھی وہ اپنی زندگی سے غیر مطمئن نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سب بیاہتا عورتوں کی زندگی ایسی ہی گذرتی ہے۔ صبح اٹھتی ہیں، جھاڑو دیتی ہیں، پوچھا مارتی ہیں، چولھا جلاتی ہیں، چائے بنا کر پتی کو دیتی ہیں، پھر کھانا پکاتی ہیں۔ پتی کے لیے پروستی ہیں۔ پھر تھالی میں لگا کر ساس کو دیتی ہیں۔ پتی کے کام پر جانے کے بعد کپڑے دھوتی ہیں، ساس کی ٹانگیں دباتی ہیں، دوپہر کو گھڑی دو گھڑی لیٹ رہتی ہیں یا اپنی

پڑوسنوں سے دو باتیں کر لیتی ہیں۔ شام کو پھر وہی چولھا چکی۔
شانتا نے سوچا کہ شکر ہے آج کل چکی چلا کر اناج تو پیسنا نہیں پڑتا۔ بجلی کی چکی سے پسا پسایا آٹا آتا ہے۔ دال چاول کے دانوں میں سے کنکر پتھر ضرور چننے پڑتے ہیں۔ رہا چولھا تو سب گھروں میں اب گیس جلتی ہے۔ نہ جانے ہمارے گھر میں ہی کیوں یہ مٹی کے تیل سے جلنے والا چولھا ہے۔ جس میں تھوڑی دیر کے بعد سائیکل کے پہیہ کی طرح ہوا بھرنی پڑتی ہے شانتا کو نہ جانے کیوں کسی کے سامنے پمپ کو جلدی جلدی اندر باہر کر کے ہوا بھرتے ہوئے شرم آتی تھی۔

(2)

شانتا کو اپنی ساس اور شوہر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ساس اس سے دن رات کام ضرور لیتی تھی اور اُس پر کڑی نظر رکھتی تھی کہ کس سے ہنستی بولتی ہے، بازار گئی تو کتنی دیر میں واپس آتی ہے۔ مگر یہ سب تو ساس کے حقوق ہوتے ہی ہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی تھی کہ اس کی ساس اور اس کا پتی کبھی اُسے مارتے نہیں جیسے کہ اڑوس پڑوس کی کتنی ہی بہوئیں اکثر پٹتی جاتی تھیں۔ چھگن لال تو اُس سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ براہ راست وہ کبھی کبھار ہی اس سے کوئی معمولی بات کر لیتا تھا ورنہ ہمیشہ اپنی ماں کے ذریعہ ہی بیوی کو احکامات دیتا تھا۔ ''ماں۔ اس سے کہنا میری قمیض اور بنیان دھو دے۔'' ماں اس سے کہنا آج سبزی میں نمک زیادہ تھا۔'' ماں اس سے کہنا آج پلنگ کی چادر اور تکیے کے غلاف ضرور بدل دے۔''
کسی زمانے میں تو شانتا یہ آخری حکم سن کر من ہی من میں کھل اٹھتی تھی۔ کیوں کہ جس دن چادر اور تکیے کے غلاف بدلے جاتے تھے اُس رات کو چھپر کھٹ کے اوپر سے خاموش بلاوا ضرور آتا تھا۔
شانتا اکثر سوچتی میری ساس اور میرے پتی کتنے اچھے ہیں کہ ہمارے بیاہ کو چھ برس ہونے کو آئے۔ اور میرے ہاں ایک بچہ بھی نہیں ہوا پھر بھی انھوں نے مجھے دوش نہیں دیا اور گھروں میں تو بہو کے لڑکی پیدا ہو جائے تو اسے قصوردار سمجھا جاتا ہے اور بہو تب ہی اپنے ادھیکار پا سکتی ہے جب اُس نے بیٹا جنا ہو۔ نہ چھگن لال نے نہ اس کی ماں نے آج تک بے اولادی ہونے کا دوش شانتا کو دیا تھا بلکہ ماں تو اس کو لے کر ڈاکٹروں، وید حکیموں، یہاں تک کہ سوامیوں

سادھوؤں کے پاس بھی گئی تھی۔ جنہوں نے دوائیں، انجکشن، تعویذ گنڈے، جنتر منتر سب کچھ دیا تھا، سب کچھ کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ماں نے بیٹے کو بہو کی موجودگی میں یہ رپورٹ دی تھی۔

''اس ابھاگن کی تو قسمت ہی میں اولاد ہونا نہیں ہے۔''

اُس کے بعد شانتا نے دیکھا تھا کہ اکثر ماں بیٹا کھسر پھسر کرتے پائے جاتے ہیں۔ وہ بات کرتے ہوتے اور وہ ادھر آجاتی تو ساس ڈانٹتی۔ ''تو کیا کر رہی ہے یہاں؟ چل اپنا کام دیکھ۔ چولھے کو یوں اکیلا نہیں چھوڑتے لا پروائی سے آگ لگ جاتی ہے۔'' اور شانتا کچن میں واپس جا کر پھر سے اسٹوو میں ہوا بھرنے لگتی۔

آج بھی وہ پمپ چلا کر ہوا بھرتی جا رہی تھی اور جی ہی جی میں اپنی خوش قسمتی پر غور کر رہی تھی کیونکہ آج وہ اپنی ساس کو اور اس کے ذریعے اپنے پتی کو وہ خبر دینے والی تھی جس کا وہ دونوں چھ برس سے انتظار کر رہے تھے۔ شبہ تو اس کو کئی دن سے ہو رہا تھا لیکن آج بات پکی ہو گئی تھی۔ میونسپل ہسپتال میں (جہاں وہ بازار جانے کا بہانہ کر کے گئی تھی) لیڈی ڈاکٹر نے بھی معائنہ کر کے اس بات کی تصدیق کر دی تھی اور اب چند گھنٹوں یا چند منٹوں کی دیر تھی کہ وہ یہ بات چھگن لال کی ماں کو بتا دے گی۔ وہ بہو کو گلے لگا لے گی۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو بدھائی دے گی۔ اس کے بعد شانتا کی زندگی ہی بدل جائے گی۔ اس میں اس کا رتبہ اونچا ہو جائے گا۔ چند مہینے کے بعد بیٹا ہو گیا (جیسا اسے یقین تھا) تو پھر تو وہ اس گھر کی رانی ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ ہوا بھرنے کے پمپ کو اور زور سے چلانے لگی۔

(3)

شانتا نے پمپ چلاتے ہوئے سوچا۔ یہ شاید میری پوجا پاٹھ اور چھگن لال کی ماں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ بھگوان نے میری سن لی اور میری کوکھ میں سکھ کے پھول ڈال دیے۔ یہ کیسے ہوا تھا۔۔۔ یہ سوچ کر وہ آپ ہی آپ مسکرا دی۔

کوئی سال بھر کی بات ہے۔ چھپر کھٹ سے خاموش بلاوا آئے کئی ہفتے بیت گئے تھے۔ چھگن لال اُن دنوں کچھ پریشانیوں میں الجھا ہوا رہتا تھا۔ شاید دھندے میں گھاٹا ہو رہا تھا۔ جب بھی آتا وسکی پیتا، کھانا کھاتا، اخبار کے ورق الٹ پلٹ کرتا۔۔۔ اور پھر چھپر کھٹ پر دیوار کی طرف

منہ کر کے سو جاتا اور رات بھر شانتا اس انتظار میں گذار دیتی کہ شاید چھگن لال کو اس کی ضرورت محسوس ہو۔ اس کا تو اکثر جی چاہتا تھا کہ کبھی اس کا پتی اس کو بے ضرورت بھی اپنے پاس بلائے۔ خصوصاً ان دنوں تو اس کا من چاہتا تھا کہ اپنے پتی کی ٹانگیں دبائے، سر میں تیل کی مالش کرے، اس سے پوچھے کہ تم کیوں پریشان ہو۔ کیا میں تمھاری کوئی سیوا کر سکتی ہوں، مجھ سے کچھ بات کر کے ہی جی ہلکا کر و مگر ایسا کبھی نہ ہوتا، ایسا کبھی نہ ہوا۔

شانتا پرانے خیالات کے ایک گھرانے میں پلی تھی۔ اُس نے نہ ناول پڑھے تھے۔ نہ دھارمک فلموں کے علاوہ فلمیں دیکھی تھیں۔ اس کو نہیں معلوم تھا پریم پیار کیسا ہوتا ہے۔ لیکن اُسے یہ معلوم تھا کہ چھگن لال دکھی ہوتا ہے تو وہ دکھی ہو جاتی ہے، خوش ہوتا ہے تو وہ خوش ہو جاتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ پتی پتنی کے درمیان ایک نازک سا رشتہ، ایک انوکھا لگاؤ ہوتا ہے جو اٹوٹ ہوتا ہے۔ اگر چہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دنیا میں پتی پتنی ایک دوسرے کو چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ سنا ہے ہندوستان میں بھی کہیں کہیں ایسا ہوتا ہے مگر اُس کے لیے یہ ایسا ہی تھا جیسے کہ سنا تھا کہ دو امریکن چاند کی زمین کو چھوڑ کر لوٹ آئے ہیں۔

پھر وہ زمانہ آیا جب چھگن لال کو قانون کی کتابوں کی جھک ہو گئی تھی۔ جب دیکھو یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھ رہا ہے۔ شانتا تو انگریزی کی اے۔ بی۔ سی ہی جانتی تھی لیکن پھر بھی اتنا معلوم تھا اُسے کہ ایسی موٹی موٹی چمڑے کی جلد بندھی کتابیں قانون کے بارے میں ہی ہوتی ہیں۔ پھر LAW تو پڑھ ہی سکتی تھی۔ پھر کسی وکیل نے اُن کے گھر آنا شروع کیا۔ جب وہ گنجے وکیل صاحب آتے چھگن لال بیوی کو رسوئی گھر میں چائے بنانے کے لیے بھیج دیتا اور دیر تک وہ دونوں گھس پُس کرتے رہتے۔ باتیں وہ انگریزی میں کرتے تھے، گجراتی یا ہندی میں کم ہی بولتے تھے۔ ایک بار "طلاق" کا لفظ شانتا کے کان میں پڑا تھا لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کی طلاق کی بات کر رہے ہیں۔ شاید وکیل کے پاس کوئی پیچیدہ مقدمہ آیا تھا اس کے بارے میں وہ چھگن لال سے مشورہ کر رہا تھا۔

پھر ایک بار اس نے وکیل کو کہتے سنا "...... بہت مشکل ہے چھگن لال جی......"

اور ایک بار اس کا پتی کہہ رہا تھا...... "اگر آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے تو وکیل کس مرض کی دوا ہیں؟"

ایک دفعہ چائے لے کر وہ کمرے میں گئی تو وکیل صاحب یہ کہتے کہتے رک گئے تھے کہ......

''دیر بھی لگے گی اور آپ کا خرچہ بہت ہوگا......'' اور پھر دونوں گجراتی کے بجائے انگریزی میں باتیں کرنے لگے تھے۔ وہ چائے کی پیالیاں اُن کے پاس رکھ کر چلی آئی تھی مگر دروازے کے پیچھے سے اس نے چھگن لال کو کہتے سنا تھا...... ''یوں تو ساری عمر جان نہیں چھوٹے گی......اور اس نے سوچا تھا یہ کس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں؟ اور اس کے دل میں چوروں کی طرح یہ خیال آیا تھا۔۔ کہیں یہ مجھ سے چھٹکارا پانے کی تو نہیں سوچ رہے؟ کیا چھگن لال طلاق لے کر اُسے چھوڑ دے گا؟ اس نے پڑوسنوں سے سنا تھا کہ گورنمنٹ نے کوئی قانون بنایا ہے، جس سے ہندو دھرم کو ماننے والے پتی پتنی بھی ایک دوسرے سے طلاق لے سکتے ہیں۔ اس نے سوچا تھا سرکار نے قانون بنایا ہوگا مگر سب قانون چلتے تھوڑا ہی ہیں۔ جیسے اچھوتوں کے بارے میں قانون بنایا تھا مگر اس سے ہریجن اور اچھوت برابر تھوڑا ہی ہو گئے؟ یہ تو اس نے سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ خود اس کے جیون میں طلاق کا سوال آ کر کھڑا ہو جائے گا۔

لیکن (شانتا نے سوچا تھا) چھگن لال کو اس سے طلاق لینے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ وہ اُس کی ماں کی سیوا کرتی ہے، کھانا پکاتی ہے، گھر کی صفائی کرتی ہے، کپڑے دھوتی ہے، کبھی سنیما جانے کی فرمائش نہیں کرتی، نئی ساڑیوں اور گہنوں کے لیے ضد نہیں کرتی، وہ جانتی تھی کہ بنا جہیز ساتھ لائے جو بہو ہوتی ہے اس کے کیا ادھیکار سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے دل میں کبھی بھولے سے چھگن لال کے سوا کسی دوسرے مرد کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو اپنے پتی کو دیوتا سمان سمجھتی تھی۔ وہ کہتا تو اس کے پاؤں دھو کر پیتی، اس کی پوجا کرتی۔ جب کبھی چھپر کھٹ پر سے بلاوا آیا اس نے خاموشی سے اپنا فرض نبھایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ گنگا کی لہروں میں ڈوب کر بھی وہ خود ہر بار پیاسی ہی رہ گئی تھی مگر یہ تو اس کی اپنی بدقسمتی تھی۔ اس میں چھگن لال کو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ جہاں تک اس کا خیال تھا اس کو تو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ وہ تو ہمیشہ شانتا کے چلے آنے کے بعد گہری چین کی نیند سو جاتا تھا۔

پھر اس کو یاد آیا کہ اتنے برسوں کے بعد بھی وہ بے اولاد تھی۔ شاید اس لیے چھگن لال اسے چھوڑنا چاہتا تھا۔ ضرور یہی وجہ ہوگی مگر اس میں طلاق لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ایک بیوی سے اولاد نہ ہو تو دوسری بیوی کر لینی چاہیے۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے، یہ ٹھیک ہے کہ دوسری

بیوی کے زیادہ ناز نخرے ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو قسمت کی بات ہے۔ بھاگیہ کا چکر ہے جو جس کی جنم پتری میں لکھا ہے وہی ہوگا۔ ویسے پہلی بیوی بھی اگر جی جان سے سیوا کرے تو شوہر اس کا خرچہ بھی اٹھاتا رہتا ہے۔ روٹی کپڑا تو دے ہی دیتا ہے۔ شانتا نے سوچا کہ اس سے پہلے طلاق کی بات آگے بڑھے چھگن لال کی ماں سے بات کر لینی چاہیے۔

''ماں جی'' اس نے موقعہ پا کر کہا۔

''کیا ہے ری؟'' چھگن لال کی ماں نے کسی قدر جھڑک کر کہا۔

''کچھ بات کرنی ہے۔''

''کیا بات ہے؟''

''میں ابھاگن ہوں نا......''

''وہ تو تو ہے ہی۔ پانچ برس سے زیادہ ہو گئے۔ تو نے ایک چوہے کے بچّہ کو بھی جنم نہیں دیا۔''

''اسی لیے میں سوچتی ہوں وہ ایک دوسرا بیاہ کر لیتے تو اچھا تھا......

''پاگل ہو گئی ہے! یا اس کو اس بہانے سے قانون کے پھندے میں پھنسانا چاہتی ہے۔''

''جی میں سمجھی نہیں۔''

''ایسی بھولی ہی تو ہے۔ جانتی نہیں اب قانون پاس ہو گیا ہے کوئی ہندو دوسری بیوی نہیں کر سکتا۔ کیا اس بیچارے کو جیل بھجوانا چاہتی ہے۔

بات ختم ہو گئی۔ مگر شانتا کے دل میں کھٹکتی رہی۔ یہ تو سرکار کی بڑی ناانصافی ہے۔ دوسری شادی کیوں نہیں کرنے دیتے۔ جب وہ سوت لانے پر راضی ہے تو سرکار کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر ایسا ہے تب ہی تو چھگن لال بیچارہ طلاق دینے کی سوچ رہا ہے۔ مگر طلاق ہو گئی تو اسے روٹی کپڑا کون دے گا؟ وہ تو دنیا میں بے سہارا تھی۔ ایسی زندگی سے تو موت اچھی......

اگلے چند مہینوں میں سوتے جاگتے موت شانتا کے لاشعور پر سوار رہی۔ میرے جیسے بدقسمتوں کو تو موت بھی نہیں آتی۔ آتم ہتیا کرنے کے لیے۔ ریل کے نیچے آنے کے لیے، زہر کھانے کے لیے تو بہت جگرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں ویسے ہی اُسے موت آجائے تو وہ اس کے لیے تیار تھی۔ کم سے کم چھگن لال بیچارے کو تو اس فکر سے چھٹکارا مل جائے گا کہ کیسے دوسری شادی کرے

تا کہ باپ دادا کی نسل آگے بڑھے۔

بارش ہو کر بمبئی میں تھوڑی سردی ہو گئی تھی۔ شانتا باہر بالکنی میں صبح شام کھڑی بوچھار میں بھیگتی رہتی۔ وہ سوچتی کاش مجھے نمونیہ ہو جائے مگر اس کو تو ایک چھینک بھی نہیں آتی اور پھر ایک رات کو جب وہ زمین پر لیٹی زندگی اور موت کے بارے میں سوچ رہی تھی، اس کے مونڈھے کو ہلکے سے چھگن لال کے ہاتھ نے چھوا۔ کئی مہینے کے بعد چھپر کھٹ سے بلاوا آیا تھا۔

(4)

وہ رات شانتا کبھی نہ بھول سکے گی۔ اس رات تو وہ ہوا تھا جو چھ سات سال سے آج تک نہ ہوا تھا۔

پہلے تو وہ چھگن لال کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''مہربانی ہو گی۔ ذرا ٹانگیں دبا دو۔ آج میں بہت تھک گیا ہوں۔''

مہربانی؟ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ اتنی سی سیوا کے لیے اُس کے پتی نے آج اُسے یاد کیا تھا۔ وہ اندھیرے میں بھی اپنے گالوں کو خوشی سے تمتماتا ہوا محسوس کر سکتی تھی۔

ٹانگیں دباتے دباتے شانتا نے محسوس کیا کہ چھگن لال کا جسم بیدار ہو گیا ہے۔ آج اس نے اشارے سے نہیں زبان سے دعوت دی۔ ''آؤ شانتا تم بھی لیٹ جاؤ۔ دن بھر کام کیا ہے تھک گئی ہو گی۔''

شانتا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے آج رات اس کے لیے خوشیوں کے سب دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔

وہ لیٹ گئی مگر ذرا ہٹ کر۔ چھگن لال نے کہا: ''میرے پاس آؤ اور یہ کہہ کر شانتا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔'' ہے بھگوان!'' شانتا کی آتما خوشی سے ناچ اٹھی اور دل کی دھڑکنوں نے حیرت سے پوچھا'' آج کیا ہو رہا ہے؟''

چھ برس کے بعد اپنے پتی کی محبت کا سہارا پا کر وہ اُس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کے جذبات آنسو بن کر آنکھوں سے نکل پڑے۔ اُس کی سسکیاں بندھ گئیں۔

''ہائیں۔ یہ کیا؟ تم رو رہی ہو۔'' چھگن لال نے نرمی سے پوچھا۔ آج اسے یہ بھی خیال نہ

رہا تھا کہ دوسرے کمرے میں ماں سنے گی تو کیا کہے گی۔

شانتا نے اس کے کان میں کہا۔''یہ آنسو تو خوشی کے ہیں۔'' اور یہ کہہ کر وہ بے اختیار اپنے پتی کے سینے سے لپٹ گئی۔ اس کی بانہیں چھگن لال کے گلے کا ہار بن گئیں۔ دونوں کے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

کہنے کو وہی ہوا جو پہلے بھی کتنی بار ہوا تھا لیکن اس رات شانتا کے سوکھے جیون میں بہار آ گئی۔ اندھے کنوئیں میں پانی کے چشمے اُبل پڑے۔

''میں مر گئی۔ میں مر گئی۔ میں...... زندہ ہو گئی۔ تم نے مجھے زندہ کر دیا۔ چھگن۔'' ہائے رام، یہ کیا ہوا۔ اُس کے منہ سے پتی کا نام نکل آیا۔ یہ سوچ کر جادو بھرے لمحے میں بھی وہ سہم سی گئی مگر آج کی رات تو چھگن نے اُسے مارا نہ ڈانٹا۔ صرف اس کا ہاتھ اپنی پتنی کو تھپکتا رہا۔ یہاں تک کہ ہاتھ کا تھپکنا تھم گیا۔ اب چھگن آرام کی نیند سو رہا تھا۔

شانتا کھڑکی میں سے آئی ہوئی ستاروں کی دھندلی روشنی میں کچھ لمحے اپنے پتی کو دیکھتی رہی۔ کتنے آنند سے وہ سو رہا تھا۔ اور یہ آنند اُسے اس سے ملا تھا؟ اپنی پتنی سے مگر آج تو شانتا کا بدن بھی بڑی لذت بھری تھکاوٹ سے ٹوٹ رہا تھا۔ اتنی تھکاوٹ کہ اُس کا جی چھپر کھٹ سے اٹھنے کو نہ چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا کچھ دیر یہیں آرام کر لوں۔ پھر نیچے اپنے بستر پر چلی جاؤں گی۔ اس نے اپنا ہاتھ پتی کے ہاتھ پر رکھ دیا پھر نیند کی ایک لہر آئی اور اُس کی آنکھیں اُس میں ڈوب گئیں۔

(5)

اس رات کے دو تین دن بعد چھگن لال انگریزی میں چھپے ہوئے کچھ فارم لایا اور شانتا سے کہا۔ 'تیری انشورنس کرا رہا ہوں۔ پورے دس ہزار کی لے یہاں دستخط کر دے۔'

شانتا گجراتی میں دستخط کر رہی تھی کہ چھگن لال بولا۔'' میں نے بھی انشورنس کرائی ہے اور تیرے نام کر دی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو روپیہ تجھے ملے گا۔''

''بھگوان نہ کرے تمہیں کچھ ہو۔'' شانتا نے جلدی سے کہا۔'' کیسی باتیں کرتے ہو؟ سہاگن کی ارتھی تو پتی کے کندھوں پر ہی جاتی ہے۔'' اب تو دونوں ایک دوسرے سے دن

دہاڑے باتیں کرنے لگے تھے۔ ''میرا بیمہ ضرور اپنے نام کروالو۔''
''تو پھر کر یہاں دستخط۔'' چھگن لال ہنس کر بولا۔ ''مگر یہ پالیسی ایسی ہے کہ نہ مجھے مرنا پڑے گا نہ تجھے اور بیس برس بعد سود سمیت سب روپے ہمیں اپنی زندگی میں ہی مل جائیں گے۔''
شانتا کہنا چاہتی تھی۔ 'وہ روپیہ ہمارے بچوں کے شادی بیاہ کے کام آئے گا، لیکن ادھر سے اپنی ساس کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی اور چھگن لال کاغذوں پر دستخط کرا لے گیا۔
اگلے دن چھگن لال شانتا کو پہلی بار سنیما دکھانے لے گیا اڑوس پڑوس والوں نے اُسے مبارکباد دی کہ اُس کا پتی اُس کا بڑا خیال کرنے لگا ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہا۔ ''اری یہ تو ایسا ہو رہا ہے جیسے تمھارے بیاہ کو ہفتہ بھر ہی ہوا ہو۔''
''ہاں اور کیا۔'' شانتا نے عجیب طریقے سے مسکرا کر کہا۔ ''پچھلے ہفتے ہی تو ہوا ہے۔''
اُس مہینے ایک دن کی دیر ہوئی تو شانتا کو اُمید کی ہلکی سی کرن دکھائی دی۔ دو دن کی دیر ہوئی تو اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ تین دن کی دیر ہوئی تو وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگی۔ مگر ابھی اس کی ہمت نہ ہوئی تھی کسی سے کہنے کی۔ چوتھے دن کرواچوتھ کا برت تھا۔ اس نے ہاتھوں میں مہندی لگائی اپنے سہاگ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے پتی کی سلامتی کے لیے بھگوان سے پرارتھنا کی۔ آج وہ شام کا چاند دیکھ کر اپنے پتی کا چہرہ دیکھے گی۔ اگر آج وہ اُسے یہ خوش خبری بھی دے سکے، اُس سے نہ رہا گیا۔ شوہر کے کام پر جاتے ہی وہ بازار جانے کے بہانے سے میونسپل اسپتال میں ہو آئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ کرواچوتھ کے دن یہ خوش خبری لے کر گھر جا رہی ہو۔ مبارک ہو۔''
وہاں سے واپس آئی تھی کہ چھگن لال کی ماں باہر جاتی ہوئی ملی۔ میں مندر جا رہی ہوں۔ تو کھانا پکانا کر لینا اور ہاں چھگن تیرے لیے نئی ساڑی لایا ہے۔ آج تو نے کرواچوتھ کا برت رکھا ہے نا؟ وہ چاہتا ہے تو آج ہی وہ ساڑی پہن لے۔''
یہ کہہ کر ماں جی تو مندر کو سدھاریں اور شانتا جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے گھر پہنچی۔ دراوزہ کھول کر دیکھا ایک ساڑی کا ڈبہ رکھا ہے۔ جلدی سے کھولا تو اندر سے اتنی بڑھیا ساڑی نکلی جتنی اس نے آج تک کبھی نہ پہنی تھی۔ ''کتنی ملائم ہے، بالکل جیسے ریشم۔'' اس نے

ساڑی کو کھولتے ہوئے سوچا۔ ''بڑی مہنگی ہوگی۔ شاید نائلون کی ہے۔''
اس نے سوچا آج کا دن ہی تو یہ ساڑی پہننے کا ہے۔
آج کرواچوتھ کا برت ہے۔
آج میرے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے۔
آج کے دن میں نے بھگوان سے اپنے پتی کے لیے لمبی عمر مانگی ہے۔
آج وہ خوش خبری اپنے شوہر کو دوں گی کہ اس کا من بھی ناچ اٹھے گا۔
آج میں کھانا بھی بڑھیا بناؤں گی۔ ہر وہ چیز جو میرے پتی کو پسند ہے۔
مسالے دار بھنڈی۔
ارویوں کا سالن۔
مٹر پلاؤ۔
پکوڑیاں۔ دہی بڑے
دال والی کچوریاں۔
بیسن کے لڈو۔
وہ یہ سوچتی جا رہی تھی اور بے خیال اسٹوو میں پمپ سے ہوا بھرتی جا رہی تھی۔
اسپرٹ کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ آج کچھ زیادہ ہی بھڑک رہا تھا۔
اور اس کے لاشعور میں کہیں دور دبا ہوا یہ سوال بھی تھا کہ سب گھروں میں جب گیس کے سلنڈر ہیں جن کی مدد سے چولھا فوراً جلایا جاتا ہے تو ہمارے ہاں یہ دقیانوسی اور خطرناک چولھا کیوں......؟
شاید اُس کے سوال کے جواب میں......
شاید اُس کی ضرورت سے زیادہ ہوا اندر پمپ کرنے سے۔
شاید اس لیے کہ چولھے پر اور اُس کے اردگرد نہ صرف مٹی کا تیل بلکہ اسپرٹ پھیلی پڑی تھی......
شاید شانتا کی اپنی غلطی سے......
شاید اتفاقیہ حادثے سے......
شاید کسی اور وجہ سے......

مگر ایک دھما کہ ہوا، چھوٹا سا شعلہ ایک دم بڑا شعلہ بن گیا جس نے پل بھر میں شانتا کے گرد لپٹی ہوئی نائلون کی ساڑی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ ساڑی ایسی بھڑکی کہ شانتا سر سے پیر تک جلتی ہوئی مشعل بن گئی۔

شاید وہ چیخی......

شاید وہ چلائی......

اُس نے دیکھا کہ پڑوسی پڑوسنیں دوڑے بھاگے آرہے ہیں۔

پانی لاؤ۔

پانی لاؤ۔

کمبل لاؤ۔

مگر اب کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا سوائے آنکھوں کے جو چھگن لال کی دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔'' میں آپ کو یہ خوش خبری بھی نہ دے سکی!'' اور پھر آنکھیں بھی جل گئیں اور جس جلتی ہوئی مشعل کو کمبل میں لپیٹا گیا وہ صرف شانتا کا مردہ جسم تھا۔

چھگن لال کی ماں جب مندر سے پوجا کر کے واپس آئی تو اُس نے اپنا سر پیٹ لیا ہائے ہائے میں تو لٹ گئی۔ میں اپنے چھگن کو کیا منہ دکھاؤں گی۔

جب تک چھگن لال کو اطلاع دی گئی اور آنکھوں میں آنسو لیے وہ داخل ہوا، پولس آچکی تھی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانا ضروری تھی۔

کورونر کی کورٹ میں اسٹوو کے پھٹ جانے کے حادثے سے موت کا فیصلہ سنایا گیا۔ مگر ڈاکٹروں کی رپورٹ جو پڑھی گئی اُس سے چھگن لال کو معلوم ہوا کہ مرتے وقت اس کی پتنی گربھ وتی تھی۔

اُس دن سے کسی نے چھگن لال کو کبھی مسکراتا نہ دیکھا۔

اُس دن سے مٹی کے تیل کے اسٹوو پر اُن کے گھر میں کھانا پکنا بند ہو گیا۔ اگلے دن ہی چھگن لال کی ماں نے گیس کا سلنڈر اور چولھا منگوا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ چھگن لال کی دوسری بیوی

کبھی تیل کے اسٹوو پر کھانا نہیں پکائے گی۔

اور اس منحوس اسٹوو کو جس نے بیچاری شانتا کی جان لی تھی۔ اٹھا کر چھگن لال نے باہر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ جہاں سے آخر کار وہ بھیکو کے کھنڈرے پر پڑے ہوئے ٹب میں پہنچ گیا۔

بھیکو اب ایک اور کوڑے کے ڈھیر میں کرید رہا تھا کیوں کہ کبھی کبھی کچرے میں سے بڑے کام کی چیز نکل آتی ہے۔

اس بار تو اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی قسمت بہت ہی زوروں پر ہے کیونکہ کوڑے کے ڈھیر میں سے ایک اچھا خاصا موٹر کا (ربڑ) ٹائر نکل آیا تھا۔ البتہ اس پر بھی خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ مگر جو غریب کوڑے میں کریدتا ہے اُس کو اتنی کہاں فرصت ہے کہ یہ سوچے یہ کس کی موٹر کا ٹائر ہے اور یہ کس کے خون کے چھینٹے ہیں۔؟

O

ڈراما ایک خونی موٹر کے ٹائر کا!

(1)

موٹر مچھلی کی طرح لمبی اور سڈول تھی، پنچھی کی طرح پر پھیلائے تھی، بطخ کی طرح سفید تھی۔

موٹر کا پچھلا پہیہ جو کرشنن کے بالکل سامنے آکر رکا تھا — اور اسی جگہ اُس موٹر کا پہیہ ہر شام کو آکر رکتا تھا — گول تھا جیسے روپیہ گول ہوتا ہے جیسے سنا تھا دنیا گول ہوتی ہے۔ اس کا ٹائر نیا تھا بڑے مضبوط ربر کا بنا ہوا تھا اس پر نمبر 1735249 — DPX پڑا ہوا تھا۔ یہ سب وہ کرشنن فٹ پاتھ پر جہاں بیٹھا بوٹ پالش کر رہا تھا وہیں سے دیکھ سکتا تھا۔ بلکہ اب تو دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ روز دیکھتا تھا اس لیے اس کو اب تک اُس موٹر کے بارے میں سب کچھ زبانی یاد تھا۔ دیکھے بغیر موٹر کا نمبر بھی وہ بتا سکتا تھا — BMX4795

شام کو چھ اور سوا چھ کے درمیان یہ کھلی ہوئی سفید موٹر چرچ گیٹ کی طرف سے آتی ہے اور ''میرینا'' ریستوران کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اُس کو ایک سفید وردی پہنے کالا سا ڈرائیور لاتا تھا، وہ پیچھے کا دروازہ کھولتا تھا، پھر اُس میں سے ایک خوب صورت سا نازک سا لڑکا اترتا تھا۔ اُس لڑکے کا نام بھی شروع میں کرشنن کو معلوم نہیں تھا لیکن اس کو اکثر ایسا لگتا تھا کہ اُن دونوں کا آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اُن دونوں کی عمر ایک ہی تھی۔ قد بھی برابر ہی ہوگا۔ دونوں کے

سر کے بال بھی کندھوں تک بڑھے ہوئے تھے۔ اس لڑکے کے فیشن کے مطابق کرشنن کے بال کٹانے میں ایک روپیہ لگتا ہے اور وہ بیکار کسی چیز پر خرچ کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس لڑکے کے بدن پر سلک کی قمیص یا بش شرٹ ہوتی تھی جب کہ کرشنن میلی جیکٹ آدھی آستینوں کی شرٹ یا پھٹی ہوئی بنیان پہنے ہوتا تھا۔ وہ لڑکا سلک یا ٹیری لین کی تنگ مہری کی پتلون پہنے ہوتا تھا جب کہ کرشنن کی کالی لمبی ٹانگیں ایک پھٹے ہوئے نیلے نیکر میں سے نکلی رہتی تھیں۔ وہ لڑکا نرم چمڑے کے ''موکاسن'' یا بڑھیا چپل پہنے ہوتا تھا۔ کرشنن (جو دنیا بھر کے جوتوں پر پالش کرتا تھا) ننگے پاؤں ہوتا تھا۔

پھر بھی کرشنن کو ایسا لگتا تھا جیسے اس کا اس امیر چھوکرے سے بڑا نزدیکی رشتہ ہے۔ یہ رشتہ کیسے قائم ہوا تھا۔ ایسے ہی۔ مگر دنیا میں اکثر رشتے ایسے ہی قائم ہو جاتے ہیں۔ کوئی لمبی چوڑی وجہ تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ رشتہ اس وقت سے قائم تھا جب وہ دونوں پیدا ہوئے تھے۔

(2)

کرشنن کیرالا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔

گاؤں سمندر کے کنارے تھا۔ پیدا ہو کر سب سے پہلے اس نے سمندر کی لہروں کی آواز ہی سنی ہوگی۔ گاؤں کے چاروں طرف، اُن کے جھونپڑے کے چاروں طرف ناریل کے اونچے اونچے پیڑ اُگے ہوئے تھے۔ پیدا ہو کر اُس نے آنکھ کھولی ہوگی تو ہوا میں ہلتے ہوئے ناریل کے پیڑ ہی نظر آئے ہوں گے۔

ابھی چار پانچ برس کا تھا کہ اس نے ناریل کے پیڑوں پر چڑھنا سیکھ لیا تھا۔ ابھی چھ برس کا ہوا تھا کہ سمندر میں تیرنے لگا تھا۔

اس کے ماں باپ دونوں ناریل کی چھال سے رسّی بنانے کا کام کرتے تھے۔ وہ دونوں اَن پڑھ تھے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ اُن کا بیٹا پڑھ لکھ کر گاؤں کی مفلسی کے چکر سے باہر نکل جائے۔ انھوں نے کرشنن کو پکڑ کر اسکول میں بھرتی کرا دیا۔ مگر اسکول بھی سمندر کے کنارے ہی تھا۔ اسکول کے چاروں طرف بھی ناریل کے پیڑ ہی لگے ہوئے تھے۔ کرشنن کی توجہ کتاب سے ہٹانے کے لیے نیلے سمندر کی ایک جھلک یا ناریل کے پتوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کی ہلکی سی

سرسراہٹ ہی کافی تھی۔ ماسٹر جی پڑھاتے پڑھاتے اُونگھنے لگتے تو کرشنن ناریل توڑنے پیڑ پر چڑھ جاتا یا بھاگ کر سمندر میں تیرنے پہنچ جاتا۔ کبھی کبھی مار بھی پڑتی لیکن وہ باز نہ آتا۔

کسی نہ کسی طرح اس نے آٹھ جماعتیں پاس کرلیں۔ پڑھا لکھا لڑکا کہیں رسّی بٹنے کا کام کرسکتا ہے؟ کرشنن نوکری کی تلاش میں گاؤں سے نکل کر پہلے کوئی لون آیا۔ پھر تری وندرم گیا۔ کبھی کسی ہوٹل میں بیرا گیری کی۔ کہیں کہیں کسی گیراج میں موٹر کی صفائی کی۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ سارے کیرالا کے لاکھوں نوجوان نوکری کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ نوکری کبھی ایک کو ملتی ہے کبھی اس کی نوکری چھٹ کر دوسرے کو مل جاتی ہے۔ آدمی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ نوکریاں تھوڑا ہی پیدا ہوتی ہے۔

پھر تری وندرم میں ایک دن نرائن سے اس کی ملاقات ہوگئی جو چھٹی لے کر بمبئی سے آیا ہوا تھا۔ اُس سے بمبئی کے قصّے سنے تو کرشنن پر تو جیسے جادو ہوگیا ہو۔ یہ بڑی بڑی اونچی عمارتیں۔ یہ چوڑی سڑکیں بجلی سے چلنے والی ریلیں۔ پچاس لاکھ کا بڑا شہر، سینکڑوں ہوٹل، ہزاروں دفتر، لاکھوں نوکریاں، نرائن وہاں ٹائپسٹ کا کام کرتا تھا۔ ڈھائی سو تنخواہ، ڈیڑھ سو روپے میں گذارا کرتا تھا۔ سو روپے گھر بھیجتا تھا۔ مگر نرائن بی۔ اے تک پڑھا ہوا تھا اور کرشنن نے آٹھ جماعتیں ہی پاس کی تھیں۔ پھر بھی اس کو ڈھائی سو کی نہیں تو دو سو کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔

اور پھر اس پر جیسے بمبئی جانے کا بھوت سوار ہوگیا ہو۔ کسی نہ کسی طرح کچھ روپیہ قرض لیا۔ کچھ راستہ ٹکٹ لے کر طے کیا، کچھ راستہ بے ٹکٹ۔ دو دن ریلوے پولیس کی قید میں رہا۔ تنگ آکر انھوں نے بھی چھوڑ دیا اور آخر کار ایک دن وہ بمبئی پہنچ ہی گیا۔ یہاں پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ نہ صرف کیرالا میں بیکاری ہے بلکہ ملک کے ہر حصے میں اور ہر جگہ سے بیکار نوجوان بمبئی ہی کا رخ کرتے ہیں۔ چیونٹیوں کی ایک فوج ہے جو ہر طرف سے رینگتی چلی آرہی تھی...... ایک گڑ کی ڈلی کی طرف جس کا نام بمبئی ہے۔

کیرالا کے بیکار۔

تامل ناڈو کے بیکار۔

آندھرا کے بیکار۔

میسور کے بیکار۔

گجرات کے بیکار۔

خود مہاراشٹر کے بیکار۔

اُتر پردیش، بہار، بنگال کے بیکار۔

راجستھان، مدھیہ پردیش کے بیکار۔

ہر ٹرین سے، ہر بس سے، بیکاروں کی ایک فوج تھی جو بمبئی چلی آ رہی تھی۔ مگر یہ جان کر کرشنن کو مایوسی نہیں ہوئی بلکہ ہمت بندھی۔ اُس نے سوچا جب یہ سب کسی نہ کسی طرح کام تلاش کر لیتے ہیں تو میں بھی کر لوں گا۔

سو وہ بھوکا رہا۔

فٹ پاتھ پر سویا۔

ہوٹلوں میں کھانے کے عوض برتن مانجھے۔

اسٹیشن پر جا کر بوجھ ڈھویا پہلے دن دو روپے کمائے۔ دوسرے دن جو قلی پہلے سے یہ کام کرتے تھے انہوں نے دھکے مار کر نکال دیا۔

دھکے، مکے، تھپڑ، گالی، بھوک پیاس، تھکن۔ ہر چیز کی عادت پڑتی گئی۔ رات کو جہاں بھی، جس فٹ پاتھ پر بھی پڑا رہتا وہیں نیند آ جاتی لیکن سب سے اچھی نیند آتی اُسے سمندر کے کنارے۔ جوہو ہو یا چوپاٹی۔ ریت کا نرم بستر، لہریں رات بھر اُسے لوری سناتی رہتیں، ناریل کے پیڑوں میں ہوا کی سرسراہٹ اسے اپنے گاؤں کی یاد دلاتی رہتی اور صبح سویرے وہ پھر بمبئی سے اور اپنی قسمت سے کشتی لڑنے کے لیے تازہ دم ہو جاتا۔

چھ مہینے کے بعد ایک دن اتفاقیہ — اس کا تجربہ تھا کہ دنیا میں ہر بات اتفاقیہ ہی تو ہوتی ہے۔ اس کی ملاقات ایک ملیالی نوجوان جوزف سے ہوگئی جو بوٹ پالش کا دھندا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دن بھر میں اس کی نو دس روپے کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ ''بس تو مجھے بھی اس دھندے پر لگوا دو'' کرشنن نے کہا تھا۔

جوزف نے بتایا تھا کہ اس کے لیے اسے فیس داخلہ دینی پڑے گی۔

"فیس داخلہ؟" اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

جوزف نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں جتنے بوٹ پالش والے چھوکرے ہیں ان سب نے ایک کلب بنا رکھا ہے۔ داخلہ کی فیس ہے۔ پہلے تین مہینے کی کمائی کا آدھا حصہ۔ پھر بھی کلب میں داخلہ مشکل سے ملتا ہے اور جو کلب کا ممبر نہیں اُسے وہ سب کام نہیں کرنے دیتے مار بھگاتے ہیں۔ پولس میں اس کی رپورٹ کر دیتے ہیں۔

"پولس؟ مگر تم لوگ پولس سے نہیں ڈرتے؟"

"نہیں رے۔ ہم تو باقاعدہ ہفتہ دیتے ہیں۔"

جوزف کی سفارش پر کرشنن کو ممبر بنا لیا گیا تھا۔ بوٹ پالش کی ڈبیہ، برش، کپڑا، ڈبہ سب اُدھار اُسے دے دیا گیا تھا۔ چند ہی مہینے میں اُس نے کلب کی فیس داخلہ بھی بھر دی تھی، قرضہ بھی اُتار دیا تھا۔ اب وہ آٹھ دس بوٹ پالش والے چھوکروں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتا تھا جس کا کرایہ وہ سب مل کر دیتے تھے اور جس کا نام انھوں نے "کیرالا لاج" رکھا ہوا تھا۔ اس میں سب ملیالی ہی رہتے تھے۔ لیکن اُن میں کرشنن جیسے ہندو بھی تھے، جوزف جیسے عیسائی بھی اور رحمٰن جیسے مسلمان بھی۔ ان کے ساتھ رہ کر کرشنن کو وطن سے دور ہونے کا احساس جاتا رہا تھا۔ اس نے سوچا اب میں خوب محنت کروں گا، ساری دنیا کے جوتے چمکاؤں گا اور اپنی قسمت بھی۔ خوب روپیہ کماؤں گا، خرچ کروں گا کم اور اپنے ماں باپ کو روپیہ بھیجتا رہوں گا۔

لیکن پھر اس کے اور اس کی کامیابی کے درمیان یہی سفید رنگ کی لمبی چوڑی موٹر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

(3)

بوٹ پالش کرنا بھی اور دھندوں کی طرح ایک دھندا ہے۔ اس میں کتنی ہی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کس علاقے میں کہاں دھندا کیا جائے تو زیادہ فائدہ ہوگا؟ کس وقت کیا جائے؟ سنیما کے پاس یا ہوٹل کے سامنے؟ مثلاً جہاں سے غیر ملکی ٹورسٹ گزرتے ہوں وہاں زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ دفتروں کے آس پاس دھندا ملتا ہے، مگر چھوٹا۔ بابو لوگ افسروں کے سامنے جاتے وقت جوتا پالش کراتے ضرور ہیں لیکن بیس پیسے سے زیادہ نہیں دیتے۔ اس کے مقابلے میں ایک

ٹورسٹ سے 'کریم پالش' کے نام پر تین روپے بھی وصول کیے جاسکتے ہیں۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں اندر جانے سے پہلے یا وہاں کسی کا انتظار کرتے ہوئے اکثر لوگ پالش کراتے ہیں لیکن جو بہت بڑھیا ہوٹل ہیں وہاں تو لوگ موٹروں میں بیٹھ کر آتے ہیں اور سیدھے اندر چلے جاتے ہیں۔ بوٹ پالش والے چھوکرے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔

اس لیے بوٹ پالش والے چھوکروں نے طے کرلیا تھا کہ 'میرینا' ریستوران کے سامنے والی جگہ اپنے گروہ میں سب سے اناڑی کو دی جائے کیونکہ وہاں آمدنی بہت ہی کم ہوتی ہے۔

جوزف نے کرشنن سے کہا تھا۔ ''تو یہاں دو چار ہفتے کام کر۔ پھر میں تجھے کوئی اور اچھی جگہ لگوا دوں گا۔''

پہلے دن ہی چار ویٹروں اور دس بارہ راہ چلنے والوں کے سوا کسی نے پالش نہیں کرائی۔

دوسرے دن اس سے بھی کم آمدنی ہوئی۔ وہ کرشنن کا جنم دن تھا۔ بیس دسمبر۔ جب اُس کا جی چاہتا تھا کہ آج خوب کمائی کروں تاکہ اپنے دوستوں کی دعوت کر سکوں۔ کم سے کم ان کو چائے اور گرم گرم بھجیا کھلا سکوں۔

دن بھر یونہی گذر گیا تو کرشنن نے سوچا۔ یہاں تو میں بھوکا مر جاؤں گا۔ آج رات کو جوزف سے کہوں گا مجھے یہاں سے کہیں اور لگوا دو۔

مگر اُسی وقت یہ سفید لمبی چوڑی موٹر آئی اور عین اُس کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہوگئی۔

ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے اتر کر دروازہ کھولا۔ اندر سے وہ نازک سا دبلا پتلا سا لمبے بالوں والا لڑکا اترا اور کرشنن کے پاس سے ہوتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس نے کپڑوں میں کوئی خوشبودار سینٹ لگا رکھا تھا۔ جہاں سے وہ گزرا تھا وہاں سینٹ کی خوشبو کا ایک جھونکا رہ گیا۔

مگر کرشنن، چھوکرے کو نہیں، اس کے کپڑے کو نہیں، اس کی موٹر کو دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں ایسی موٹر اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہاں تک کہ کسی نے اپنا جوتا پہنے ہوئے پیر اُس کے ڈبے پر رکھ کر کہا۔ ''چل بھئی پالش کر۔ فرسٹ کلاس۔''

کرشنن نے چونک کر دیکھا تو اس موٹر کا سفید وردی پہنے ہوئے ڈرائیور تھا۔ سوکھے تلے کا

کالا بوٹ پہنے تھا۔ کئی دن سے پالش نہیں ہوئی تھی۔ کرشنن نے بڑے زور سے برش پھیرنا شروع کر دیا۔

''کیوں جی یہ موٹر آپ ہی چلاتے ہیں؟''

''ہوں۔''

''بڑی زبردست موٹر ہے۔ کیوں جی یہ کتنے کی ہوگی؟''

''کوئی ایک لاکھ سے زیادہ کی ہے۔ ولایتی ہے نا؟''

''کیوں جی یہ چھوکرا جو اس میں بیٹھ کر آیا ہے کون ہے؟''

''ہمارے مالک کا بیٹا۔''

''یہ کیا کرتا ہے؟'

''اسی سال کالج میں داخلہ لیا ہے۔ باپ نے کالج آنے جانے کے لیے یہ گاڑی اُسے ہی دے دی ہے۔''

ٹھک ٹھک۔ کرشنن نے برش سے ڈبے کو دوبارہ مارا۔ دائیں طرف کے جوتے کا پالش ہوگیا۔ دوسرا جوتا سامنے آیا۔

''کیوں جی آپ کے مالک کے چھوکرے کی عمر کیا ہوگی؟''

''اٹھارہ برس۔ آج ہی تو اٹھارہ کا ہوا ہے۔

برتھ ڈے پارٹی ہے اندر۔''

ٹھک ٹھک۔ کرشنن نے برش کی لکڑی کو ڈبے کے اوپر مار کر اعلان کیا دوسرا جوتا بھی پالش ہوگیا ہے۔

ڈرائیور نے بیس پیسے نکال کر دیئے اور کرشنن نے خالی پالش کی ڈبیہ میں ڈال دیئے۔

ڈرائیور ٹہلتا ہوا پان والے کی دکان پر چلا گیا مگر کرشنن کی نگاہیں اس کار پر جمی رہیں۔

یہ کار ایک اٹھارہ برس کے چھوکرے کی ہے۔

جو اسی دن پیدا ہوا تھا جس دن میں پیدا ہوا تھا۔

شاید دونوں ایک دن ہی نہیں، ایک وقت پیدا ہوئے ہوں۔

کہتے ہیں جنم پتری کے حساب سے جس دن اور جس وقت کوئی پیدا ہوتا ہے اس وقت کے ستارے بتاتے ہیں کہ ہونے والے بچے کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔

پھر دولڑکے جو ایک ہی دن پیدا ہوئے ان کی قسمت میں اتنا فرق کیوں؟

ایک، ایک لاکھ روپے کی موٹر میں بیٹھ کر آتا ہے۔

ایک فٹ پاتھ پر بیٹھا اس کے ڈرائیور کا جوتا پالش کرتا ہے۔

ایک کا باپ بہت بڑی بزنس کا مالک ہے۔

دوسرے کا باپ گاؤں میں رسی بانٹ کر ایک روپیہ روز کماتا ہے۔

کرشنن جوتوں پر پالش کرتا رہا۔

مگر اُس کی نگاہیں اس کار پر ہی لگی رہیں اور خطرناک خیالات اُس کے دماغ میں گھومتے رہے۔

بے خیالی میں ایک گاہک کے سفید موزوں پر پالش بھرا برش لگ گیا۔ وہ چلّایا۔ ''اے چھوکرے تیرا دھیان کدھر ہے؟ موزے کا ستیاناس کر دیا۔''

''سوری سر۔'' کرشنن نے کہا۔ انگریزی کے کچھ لفظ اُس نے سیکھ لیے تھے کیونکہ اس کے دھندے میں کام آتے ہیں۔ کوئی غلطی ہو انگریزی میں ''سوری'' بول دو۔ پھر کوئی کچھ نہیں کہتا۔

اُس دن سے کرشنن نے دیکھا کہ وہ موٹر اسی وقت شام کے چھ سوا چھ بجے اُسی جگہ آکر رکتی ہے اور وہ چھوکرا اُتر کر اندر جاتا ہے۔ ریستوران میں اس وقت اس کے دوستوں کا جمگھٹا ہوتا تھا۔ تیسرے دن ڈرائیور نے پھر جوتا پالش کرایا تھا تو کرشنن نے اُس چھوکرے کا نام بھی معلوم کر لیا تھا۔ اُس کا نام تھا— کرشنا۔ کرشنن۔ کرشنا۔ کرشنا۔ کرشنن۔ ان دونوں کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

مگر اصل رشتہ کرشنن کا کرشنا کی کار سے تھا۔

یہ رشتہ اتنا مضبوط تھا کہ ہر روز ''میرینا'' کے سامنے بوٹ پالش کے لیے بیٹھنا کرشنن کے لیے ضروری ہو گیا۔ جوزف نے کئی بار کوئی دوسری جگہ اس کے لیے تجویز کی لیکن ہر بار کرشنن نے انکار کر دیا۔ اُس کو اصرار تھا کہ ''میرینا'' کے سامنے ہی کام کرتا رہے گا۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا؟'' جوزف نے کرشنن سے کہا۔

شاید وہ پاگل ہی ہو گیا تھا۔ محبت بھی تو ایک قسم کا پاگل پن ہی ہوتا ہے اور نفرت دوسری قسم کا پاگل پن۔

اب ہر شام کو اس کار کو دیکھے بنا اس کی زندگی مکمل نہیں تھی۔

وہ کار اس سے کام کراتی تھی۔ وہ اُس کار کو دیکھتا رہتا یا اُس کار کا انتظار کرتا رہتا اور پہلے سے دگنے انہماک سے بوٹ پالش کرتا رہتا "میرینا" کے سامنے سے کسی نے چار روپے نہیں کمائے تھے۔ کرشنن کی آمدنی چھ سات روپے ہونے لگی۔

وہ کار اُس کی زندگی کا سہارا تھی۔ جس دن وہ کار نہ آتی اُسے زندگی اور بے معنی دکھائی دیتی۔

وہ اُس کار کا انتظار اتنی بے تابی کے ساتھ کرتا جیسے کوئی عاشق اپنے معشوق کا۔

مگر وہ کار اس کی محبوبہ نہیں تھی۔

وہ کار اس کی دشمن تھی۔

کیوں دشمن تھی بس تھی۔ ہر چیز کی وجہ تھوڑا ہی ہوتی ہے۔

جب تک وہ کار اس کے سامنے کھڑی ہوتی کرشنن اپنے خیال ہی خیال میں پتھر لے کر اس کے آگے کے شیشے کو چکنا چور کرتا۔ پھر آگے لگی ہوئی روشنیوں کو پتھر مار کر توڑ پھوڑ ڈالتا۔ پھر ایک تیز چاقو لے کر اس کی گدّیوں کو کاٹ ڈالتا پھاڑ ڈالتا۔ اُن کے اندر بھرا ہوا ناریل کا کاتھا باہر آ جاتا۔ یہ وہی ناریل کا کاتھا ہے جس کو کوٹ کوٹ کر بٹ بٹ کر اس کا باپ بستی میں رسّی بناتا ہے۔"

مگر یہ سب ڈراما اس کے دماغ ہی میں ہوتا۔ بظاہر وہ پالش کرتا رہتا، گاہکوں سے بات کرتا رہتا اُن سے پیسے وصول کرتا رہتا۔ مگر اس کی نگاہیں اس کار پر جمی رہتیں۔

وہ کار اس کا منہ چڑاتی۔ "تم معمولی بوٹ پالش کرنے والے چھوکرے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کار پر اپنا غصہ اتارتا۔ اُس کو توڑتا، پھوڑتا، نوچتا، کھسوٹتا، کاٹتا، چیرتا، اُس کی فولادی انتڑیاں باہر نکالتا۔ تب ہی جا کر اُس کو تسلی ہوتی۔

پھر نو دس بجے کرشنا اپنے دوستوں کے ساتھ "میرینا" سے باہر آتا۔ ان دوستوں میں کچھ لڑکیاں بھی ہوتیں مگر کرشنن کو لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کرشنا کے دوست کچھ اُس کار میں بیٹھتے کچھ اور کاروں میں۔ پھر ڈرائیور اس کار کو اسٹارٹ کرتا۔ کرشنن اس پر آخری نگاہ ڈالتا پھر

غرّاتی ہوئی، اکڑتی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی، ناز و انداز دکھلاتی ہوئی وہ کار وہاں سے چلی جاتی اور جاتے جاتے کرشنن کا منہ چڑا جاتی۔ ''دیکھو تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

پھر کرشنن کا من اچاٹ ہو جاتا۔ وہ اپنے بوٹ پالش کے سامان کو اکٹھا کر کے ڈبے میں ڈالتا۔ ڈبہ چمڑے کے پٹے سے اٹھا کر کندھے پر لٹکاتا اور میرینا کی جگمگاتی روشنیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا فریر روڈ کے اندھیروں میں کھو جاتا۔

(4)

اور پھر کئی مہینے کے بعد آج بھی وہ موٹر وہاں کھڑی تھی اور آج اس کی حفاظت کرنے کے لیے کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔

آج کرشنا ایک خوب صورت لڑکی کو ساتھ لیے خود ڈرائیو کر کے لایا تھا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑے سیٹی بجاتا اندر چلا گیا تھا۔

اُس وقت کرشنن کسی کا بوٹ پالش کر رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن ایک پل کے لیے رک گئی، جب اُس نے دیکھا کہ کار ڈرائیور کے بغیر آئی ہے۔ آج کوئی پہرے دار نہیں ہوگا۔ آج وہ کر سکتا ہے جس کا ریہرسل وہ اپنے دماغ میں کئی بار کر چکا تھا۔ جس کی پوری تیاری اُس نے کر رکھی تھی۔ کئی مہینے تری وندرم کے ایک موٹر گیراج میں اس نے یونہی نہیں گذارے تھے۔

موٹر اندھیرے میں کھڑی تھی۔

اندر ڈانس ہو رہا تھا۔ آج بڑا ہنگامہ تھا۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے بھی شیشے کی دیواروں میں سے اندر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس وقت کوئی گاہک بھلا کہاں آتا۔ کرشنن نے اپنے ڈبے میں سے ایک جیک نکالا ایک سپینر اور ایک نٹ بولٹ ڈھیلا کرنے کا ''پانا۔''

یہ سب لے کر وہ موٹر کار کے دوسری طرف گیا جہاں دیوار تھی۔ وہاں کسی نے اُسے بیٹھا دیکھ بھی لیا تو سمجھے گا کوئی پیشاب کر رہا ہے۔

جیک لگانے اور پہیہ اوپر اٹھانے اور اُس کے نٹ بولٹ ڈھیلے کرنے میں پہیہ پھر سے نیچے کرنے میں صرف چند سنٹ لگے۔ پھر وہ اپنی جگہ واپس آ کر بیٹھ گیا۔ اوزار پھر سے ڈبے میں بند کر دیے۔

اب اس نے پہلی بار اپنی توجہ جان بوجھ کر کار سے ہٹا کر ریستوران کے اندر کی۔

ریستوران ایرکنڈیشنڈ تھا۔ اس لیے دروازے کھڑکیاں ایک بار بند ہو جاتے تھے تو ان میں سے آواز بھی باہر نہ آتی تھی۔ شیشے کی دیوار میں سے آپ امیر گھرانوں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو تھرکتے کولھے مٹکاتے، سینہ سے سینہ ملا کر ناچتے، عجیب عجیب حرکتیں کرتے دیکھ سکتے تھے لیکن جس سنگیت پر یہ سب اُچھل کود ہو رہی تھی اُس کو نہ سن سکتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے شیشے کے تالاب میں رنگ برنگی مچھلیاں خاموشی سے تیر رہی ہیں۔

ان ہی مچھلیوں میں کرشنا اُس خوب صورت سی نازک سی لڑکی کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا۔ یہ کچھ عجیب قسم کا ڈانس تھا۔ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ ناچ رہے تھے مگر ان کی حرکتوں میں ایک عجیب قسم کا لگاؤ ایک عجیب قسم کا آہنگ تھا۔ وہ ایک ہاتھ اٹھاتا تھا، پھر وہ ایک ہاتھ اٹھاتی تھی، وہ دوسرا ہاتھ اٹھاتا، وہ بھی دوسرا ہاتھ اسی طرح اٹھاتی تھی، پھر جیسے وہ تھرکتا تھا ویسے ہی وہ تھرکتی تھی، جیسے وہ جھکتا تھا ویسے ہی وہ جھکتی تھی۔ غرض عجیب قسم کی جمناسٹک کر رہے تھے وہ دونوں، بڑی دیر تک — نہ جانے کتنی دیر تک۔ کرشن کھڑا شیشے کی دیوار میں سے ان دونوں کو اور ان جیسی اور کتنی ہی رونا تنگ کی مچھلیوں کو تیرتے، اچھلتے، کودتے، خاموشی سے ناچتے گاتے، ہونٹ ہلاتے ہونٹ ملاتے، ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر ان سُنے سنگیت کی لہروں پر ڈولتے دیکھتا رہا۔ اور وہ بھول گیا اس سفید کار کو، جس سے اس کو محبت یا نفرت تھی، جس کو وہ ٹوٹتا پھوٹتا، چکنا چور ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ وہ کار اس کی دشمن تھی اور وہ اس کار کا دشمن تھا۔ پھر بھی اس کو اتنی شدید نفرت کیوں تھی جو صرف محبت میں ہوتی ہے؟

اور پھر جیسے کسی دوسری دنیا سے ایک جانی بوجھی آواز اُس کے کان میں آئی۔ وہ اس آواز کو خوب پہچانتا تھا۔ وہ تھی اس کار کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز مگر انجن کون اسٹارٹ کر سکتا تھا۔ کار کا مالک تو اندر ڈانس کر رہا تھا۔ ڈرائیور آج آیا نہیں تھا۔ اور کون ہو سکتا ہے؟ کوئی اور کار ہوگی۔ یہ سوچ کر اس نے بڑے اطمینان سے مڑ کر ایک پھسلتی ہوئی نظر اُدھر ڈالی جدھر وہ کار کھڑی تھی۔ مگر وہاں وہ کار نہیں کھڑی تھی۔ جگہ خالی تھی۔ انجن کی بھر بھراہٹ اور گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ وہ کار تیزی سے جا رہی تھی۔ اور جب تک کرشن کی سمجھ میں آئے کہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہو چکا ہے، وہ کار ایک سفید چھلاوے کی طرح، پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

''اے اے ٹھہرو۔'' کرشنن پیچھے بھاگتا ہوا چلایا۔''میری کار چرا کر کہاں لیے جا رہے ہو؟'' ان لوگوں نے کرشنا کی موٹر نہیں چرائی تھی کرشنن کے خواب چرائے تھے!

جن اِکا دُکا لوگوں نے ایک بوٹ پالش والے چھوکرے کو میلا بنیان اور نیلا نیکر پہنے سڑک کے بیچ میں کھڑے چلّاتے دیکھا وہ سمجھے کہ زیادہ پی لینے سے بیچارہ اول فول بک رہا ہے اور وہ اس کی کنّی کاٹ کر گذر گئے۔

پھر کرشنن کچھ سوچ کر ''میرینا'' ریستوران کی طرف بھاگا۔ دروازہ گھسیٹ کر کھول ڈالا تو ایک دم سنگیت کا دھماکہ اس کے کانوں پر پڑا۔ کچھ دیر تو بھیڑ اور سنگیت کی چیخ پکار سے وہ بوکھلا سا گیا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور وہ سیدھا اُدھر بڑھا جدھر کرشنا اس لڑکی کے ساتھ الٹا سیدھا ڈانس کر رہا تھا۔

مگر ابھی اس نے ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ ریستوران کے منیجر، اسسٹنٹ منیجر اور دو تین ہٹے کٹے بیروں نے کرشنن کو آ گھیرا۔

''ابے کیا چاہیے یہاں؟''

'م—م—میری—م—م—م—ٹر—'' یہ کہہ کر کرشنن نے کرشنا کی طرف اشارہ کیا۔

اب تو ہوٹل والوں کو یقین ہو گیا کہ یہ میلے کچیلے کپڑے پہنے چھوکرا ''پیالا'' ہے۔ نوٹانک چڑھا کر بہک گیا ہے۔

''چلو باہر نکلو—''

''مگر سنو تو—''

''اگر مگر— کچھ نہیں۔ ننذو۔''

''جی حضور'' ایک بیرے نے کہا۔

''اس شرابی کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔''

انھوں نے یہی کیا۔ مگر پھینکا نہیں دھیرے سے فٹ پاتھ پر اُس کو گٹھری کی طرح اٹھا کر رکھ دیا۔

ایر کنڈیشنڈ ریستوراں کا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

ڈانس جاری رہا۔ کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی کیا ہوا کیا نہیں ہوا۔

باہر فٹ پاتھ پر کرشنن نے بوٹ پالش کا اپنا سامان بھی نہیں اٹھایا۔ اس کے احساس کو بڑی ٹھیس لگی تھی بلکہ لگائی گئی تھی۔ اس کو شرابی سمجھا گیا تھا حالانکہ اس نے تو آج تک کبھی دارو کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیا تھا۔ ایک گھونٹ نہیں!...... جوزف وغیرہ روز اس کو کہتے تھے ہو میرے یار۔ غم غلط کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ پھر بھی اس نے دارُو کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

ایک راستہ چلتی پرچھائیں سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا۔ ''کیوں بھائی۔ کیا میں شراب پیے ہوئے ہوں؟''

''بالکل نہیں۔ پرچھائیں نے جواب دیا۔

''پھر وہ مجھے شرابی کیوں کہتے ہیں۔''

''وہ بیوقوف ہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔ پیسہ ہے جیب میں؟

کرشنن نے جیب میں سکّے کھنکھنا کر کہا۔ ''ہے۔ مگر کہاں چلو گے؟''

پرچھائیں نے اس کے کان میں کہا۔ ''دارو خانے، میرے یار، اور کہاں؟

چند منٹ بعد دارو خانے میں دوسرا گلاس چڑھاتے ہوئے کرشنن بولا، روز کہتا تھا ہو میرے یار۔ اب دیکھے آکر!''

''کس کی بات کر رہے ہو۔'' اس کے ساتھی نے گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ایک دوست ہے میرا جوزف، نہ جانے اس وقت کیا کر رہا ہے؟''

(5)

جوزف سفید کار کو چلا رہا تھا جو مچھلی کی طرح سڈول تھی۔ پنچھی کی طرح پر پھیلائے ہوئے تھی اور اس وقت دہلی کی سڑک پر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہی تھی۔

جوزف کے برابر میں رحمٰن بیٹھا تھا اس کے برابر میں سین۔ اُس وقت تینوں پیئے ہوئے تھے، تینوں ہنس رہے تھے، تینوں اپنے ساتھی کرشنن کو یاد کر رہے تھے۔

''سالا کرشنن۔'' جوزف نے کہا۔ 'کیا یاد کرے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کار اڑا لی۔''

''مزا تو جب آئے گا'' رحمٰن نے اپنے ساتھیوں سے چلّا کر کہا، کیوں کہ کھلی گاڑی میں ہوا

بھی فرانٹے سے چلتی ہے۔'' جب موٹر کا مالک ہوٹل سے نکل کر کرشنن سے پوچھے گا۔ ابے تو نے ہماری کار کسی کو لے جاتے تو نہیں دیکھا۔

''سالا'' جوزف گالی دے کر بولا۔'' کار کی کنڈیشن تو ٹپ ٹاپ ہے۔ مگر پچھلا بایاں پہیہ ذرا وابل کر رہا ہے۔ سالا کبھی اِدھر جاتا ہے کبھی ادھر۔

'کرنے دے وابل۔ پنکھے' سینن بولا۔ ذرا جوہو کی ہوا کھلا دے۔

دراصل کرشنن گھبراہٹ میں نٹ بولٹ کافی حد تک ڈھیلا نہ کر پایا تھا۔ ورنہ اس کے پلان کے مطابق تو اب تک پہیہ نکل جانا چاہیے تھا اور کار کو الٹ جانا چاہیے تھا۔

جوہو ساحل کے کنارے پہنچ کر رحمٰن نے کہا کہ پیاس لگ رہی ہے چلو ایک ایک کوکا کولا پی لیں مگر سینن نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں ایک کونے میں پولیس کی وائرلیس لگی ٹرک کھڑی تھی۔ ٹھہرنے کا ٹائم نہیں ہے۔ چلتے رہو۔''

جوزف نے کن انکھیوں سے پولیس کی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' تو ٹھیک کہتا ہے سینن۔'' اور یہ کہہ کر اسٹیرنگ وہیل زور سے موڑا۔ اس بار ڈھیلے پہیہ نے اس زور سے وابل کیا کہ موٹر تقریباً 'سکڈ' کر گئی۔ مگر جوزف نے سنبھال لیا اور ایکسیلیٹر دبا کر تیزی سے موٹر دوڑاتا ہوا لے گیا۔ یہ وقت روک کر دیکھنے کا نہیں تھا کہ پہیئے میں کیا خرابی ہے کیونکہ پیچھے سے پولیس کی ایک پھڑ پھڑاتی ہوئی سیٹی سنائی دے رہی تھی۔

''لگتا ہے کار کی چوری کی خبر پولیس تک پہنچ گئی ہے۔'' رحمٰن نے کہا۔ اُس کو کیا معلوم تھا کہ پولیس والوں نے سیٹی اس لیے بجائی تھی کہ کار والوں کو آگاہ کر دیں کہ اُن کا پچھلا پہیہ خطرناک طریقے سے ڈھیلا ہو رہا ہے۔

'چوری؟'' جوزف گاڑی کو بھگاتے ہوئے بولا۔'' تو اسے چوری کہتا ہے۔ ارے ہم نے تو دوستانہ طریقے سے گاڑی استعمال کی ہے۔ ابھی جاکے وہیں ''میرینا'' کے آگے کھڑی کر دیں گے۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔''

''سوائے ایک کرشنن کے'' سینن بولا۔'' وہ سالا بڑی گالی دے گا کہ مجھے بھی سواری کیوں نہیں کرنے دی۔''

''اس کو بھی سواری کرادیں گے ایک دن مگر آج نہیں کرا سکتے۔''

جوزف کو اپنی ڈرائیونگ پر بڑا ناز تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تین پہیوں پر بھی میں گاڑی پچاس میل کی رفتار سے بھگا سکتا ہوں۔

دراصل بوٹ پالش کے دھندے سے پہلے وہ ایک بڑے سیٹھ کے ہاں ڈرائیور ہی تھا۔ دو سو روپے پگار، وردی، کھانا کپڑا اور ٹائم سب ملتا تھا۔ پھر ایک دن اس بزنس مین کی بیوی سے ایک ایکسی ڈنٹ ہوگیا۔ جس میں ایک بچہ مارا گیا۔ سیٹھ نے نوکر کے پیروں پر ٹوپی رکھ دی کہ اب تم ہی ہمیں بچا سکتے ہو۔ میری بیوی کے پاس تو ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں ہے۔ تم یہ الزام اپنے سر لے لو۔

جوزف نے کورٹ میں جا کر بیان دے دیا کہ موٹر تو میں چلا رہا تھا۔ میم صاحبہ تو صرف برابر میں بیٹھی تھیں۔

خطرناک لاپروائی سے موٹر چلانے کا الزام ثابت ہوگیا۔ مجسٹریٹ نے جوزف کو سال بھر قید اور تین ہزار روپے جرمانے کی سزا دی۔ تین ہزار روپے جرمانہ سیٹھ نے بھرا۔ جو مرے ہوئے بچے کے ماں باپ کو دلوایا گیا۔

سال بھر کے بعد جب جوزف باہر نکلا تو اس کا ڈرائیونگ لائسنس ضبط ہو چکا تھا۔ سیٹھ نے اُسے رکھنے سے انکار کر دیا۔ کہا سو دو سو چاہییں تو لے جاؤ مگر ہم جیل کاٹے ہوئے آدمی کو نوکر نہیں رکھ سکتے۔ وہ بھی جب اس کا لائسنس ضبط ہو چکا ہو۔

جوزف کا جی چاہا دو سو روپے سیٹھ کے منہ پر دے مارے مگر پھر وہ غصہ پی گیا اور روپے لے کر چلا آیا۔ کئی دن تک اس کی شراب پیتا رہا پھر جب آخری پندرہ روپے رہ گئے تو اس کا بوٹ پالش کا سامان خریدا اور یہ دھندا شروع کر دیا۔

(6)

اور اب برسوں کے بعد پھر ایک بڑی شاندار موٹر جوزف کے قبضے میں تھی۔ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ ویل پر تھے، اس کے پیر کے نیچے ایکسیلیٹر تھا۔ جتنا دباؤ اتنی تیزی سے موٹر بھاگتی تھی مگر اس موٹر میں کچھ خرابی تھی ضرور۔ بائیں طرف کا پچھلا پہیہ وابل کر رہا تھا۔ اُس طرف اسٹیرنگ کھنچتی تھی مگر جوزف جیسے ڈرائیور میں اور معمولی ڈرائیور میں کیا فرق ہوا اگر جوزف نے بھی موٹر روک دی۔

سو، جوہو سے کھار، باندرہ، ماہم، دادر، ورلی ہوتے ہوئے اب وہ پھر میرین ڈرائیو پر چلے آرہے تھے۔ دو ایک منٹ میں وہ میرینا کے آس پاس ہی کہیں اندھیرے میں اس کار کو پارک کر دیں گے اور پھر ہنستے کھیلتے ہوئے چلے جائیں گے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ کا ڈراما ختم ہو جائے گا۔

مگر یہ کیا؟ یہ کون عین سڑک کے بیچوں بیچ چلا رہا ہے؟۔

کرشنن؟ یہ کرشنن یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیا شراب پی رکھی ہے اُس نے؟

''کرشنن— آگے سے ہٹ جاؤ!''

''کرشنن!'' رحمٰن نے آواز دی۔

''کرشنن!!'' سینن چلّایا۔

مگر کرشنن سامنے سے گاڑی کی روشنیوں کو دیکھ کر چکا چوند ہو چکا تھا۔ نشے میں ویسے بھی اُس کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ چلائے جا رہا تھا۔ ''کوئی ہے۔ ہماری موٹر لاؤ! ہماری موٹر—''

جوزف نے پورے زور سے بریک لگایا۔ گاڑی ایک پل کے لیے کرشنن کے پاس آ کر رک گئی۔ کرشنن نے سوچا۔ ''آخر کون ڈرائیو کر رہا ہے؟

مگر اسی وقت بائیں طرف کے پچھلے پہیہ کا آخری نٹ بولٹ گر پڑا اور پہیہ لڑھکتا ہوا الگ چلا اور کار بے قابو ہو کر اس کے پیچھے تین پہیوں پر دوڑی۔ اب جوزف دائیں کو اسٹیرنگ گھماتا ہے تو گاڑی پوری دائیں کو گھوم جاتی ہے، بائیں کو گھماتا ہے تو پوری بائیں کو، نشے میں مدہوش کرشنن سوچ رہا تھا یہ میرے دماغ کا قصور ہے یا میری آنکھوں کا کہ یہ موٹر کی روشنیاں مجھے ناچتی دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی ادھر جاتی ہیں کبھی اُدھر۔ اور پھر وہ روشنیاں ایک خطرناک رفتار سے اُس کی طرف آئیں اور وہ ڈر کے مارے ایک بجلی کے کھمبے سے لپٹ گیا مگر ان روشنیوں نے اس کو وہاں بھی جا دبوچا۔ اور پھر ایک زبردست دھماکے کے ساتھ جس میں شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار بھی شامل تھی وہ روشنیاں بجھ گئیں اور مرنے سے پہلے کرشنن نے دیکھا کہ اُس کی دیرینہ خطرناک آرزو پوری ہو گئی ہے اور وہ سفید موٹر جو مچھلی کی طرح سڈول تھی اور پنچھی کی طرح پر پھیلائے تھی آخر کار ایسی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے کہ اس کے پرخچے اڑ گئے ہیں جیسے کسی نے سفید پنچھی کے پر نوچ لیے ہوں۔ یہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ تھا۔

بائیں طرف کا پچھلا پہیہ لڑھکتا لڑھکتا گٹر میں جا گرا۔ اگلے دن صبح ایک میونسپلٹی کے جمعدار نے جھاڑو دیتے ہوئے اس کو دیکھا کہ اس کے ٹائر پر خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ یہ چھینٹے کرشنن کے خون کے ہیں۔ جو کیرالا کے سمندر اور ناریل کے جھنڈوں سے اس خون کو اپنے بدن میں بمبئی لے کر آیا تھا!

جمعدار نے سوچا لوہے کا پہیہ تو چور بازار میں بک جائے گا لیکن ٹائر لے گیا تو اس پر پڑے ہوئے خون کے چھینٹے مجھے مصیبت میں پھنسا دیں گے۔ آدھا ٹائر پہلے سے اتر گیا تھا۔ باقی کو اس نے گھسیٹ کر اتار دیا اور اُسے کوڑے کے ڈھیر میں چھپا دیا جہاں سے اُس کی قسمت میں بھیکو کے کھٹارے میں آنا لکھا تھا۔

ٹائر کو ٹب کے اندر اسٹوو کے پاس رکھنے کے بعد بھیکو نے سوچا آج کے لیے کافی چیزیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ایک صحیح سالم ٹب۔ ایک اچھا خاصا اسٹوو۔ ایک تقریباً نیا ٹائر۔ ان کے ہی دام سیٹھ ٹھیک لگائے تو تیس چالیس روپے تو مل جانے چاہییں۔ اب واپس گھر چلنا چاہیے۔ سو اس نے کھٹارے کا رخ کالینہ کی طرف موڑ دیا لیکن اندھیری سے گرلا جاتے ہوئے ایک فلم اسٹوڈیو کے پاس سے گزر رہا تھا۔ جس کے سامنے کئی ٹین کی چھت کے جھونپڑے بنے ہوئے تھے کہ اس نے دیکھا کہ گٹر کے پاس درجن بھر خالی فلم کے ڈبے پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے ادھر اُدھر نظر کی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ پھر اُس نے جلدی سے وہ ڈبے قبضے میں کر لیے اور ٹب میں نیچے کو دبا کر رکھ دیے۔

ڈبے اندر رکھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ پرانے لیبلوں پر فلم کا نام لکھا تھا روشنائی سے جو وقت کے ساتھ دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ ''نئی دھرتی۔ نیا آکاش'' بھیکو نے جو سب ہٹ فلموں کو ایک زمانے میں بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا سوچا کہ اس نام کی تو کوئی فلم میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ نام بھی عجیب ہے ''نئی دھرتی۔ نیا آکاش۔''

○

سینیریو فلم کے تیرہ خالی ڈبّوں کا!

(1)

ایک کے اوپر ایک بارہ فلم کے ڈبّے اسٹول پر دھرے تھے۔

تیرہواں ڈبہ اس ٹین کے قطب مینار کے اوپر رکھتے ہوئے نرمل نے سوچا۔ واہ میں نے بھی کیا نام رکھا تھا، اپنے ناول اور اپنی فلم کا "نئی دھرتی۔ نیا آکاش۔" دھرتی اور آکاش میں کسے دلچسپی ہے؟ اور وہ بھی نئی دھرتی اور نئے آکاش میں!۔ ہاں کچھ "نئی اور "نیا" قسم کے فلم چل سکتے ہیں جیسے—

نئی محبت۔

نیا پیار۔

نئی بہار۔

نیا اقرار۔

نئی جوانی۔

نئی سجنی۔

نیا سجنا۔

نیا گیت۔

نیا سنگیت۔

نئی پریت......

مگر یہ تو وہی 'نئی محبت' والی بات ہی ہوگئی۔ تو کیا ہوا؟ ہماری فلموں کا یہی تو کمال ہے۔ ہر نئی فلم جو بنتی ہے اسی پرانے ڈھانچے پر بنتی ہے۔ وہی پرانی کہانی، وہی پرانا پلاٹ، وہی پرانا کیریکٹر۔ وہی پرانے ایکٹر اور ایکٹریس، وہی پرانے خیالات۔ مگر پبلک ہر فلم میں کچھ نیا پن بھی مانگتی ہے۔ سو اس کا بھی انتظام ہے۔ کبھی نیا ہیرو کبھی نئی ہیروئین۔ (مگر صورت شکل انداز، آواز وہی پرانے ہیرو ہیروئنوں جیسی!) ہاں ہیرو ہیروئنوں کی پوشاک بدلتی رہتی ہے۔ کبھی شلوار قمیض مقبول ہے، تو کبھی غرارہ، تو کبھی چوڑی دار، آج کل سلیکس اور بیل باٹم کا زمانہ ہے۔ فیشن ایبل خواتین پنجابی دیہاتنوں کی طرح لنگی پہنے گھومتی ہیں۔ اس کے بعد سوئمنگ کاسٹیوم اور بکنی BIKINI کا زمانہ آئے گا۔ اور اس کے بعد......؟ دنیا گول ہے۔ انسان کا ارتقا بھی ایک چکر ہے۔ اکیسویں صدی میں ہم شاید جانوروں کی کھالیں لپیٹنے لگیں گے اور پتھر کے ہتھیاروں سے ایک دوسرے کا شکار کریں اور اس کے بعد؟ پھر تو جانوروں کی کھال لپیٹنے کا تکلف بھی کیوں۔ کیا انسان کو ڈھانپنے کے لیے خود انسان کی اپنی کھال کافی نہیں ہے؟ ساری دنیا ایک سویڈیش یا فرانسیسی "آرٹ فلم" ہوجائے گی جو آج بغیر سنسر کے صرف فلم سوسائٹی میں دکھائی جاتی ہے۔ کل وہ آرٹ نہیں رہے گا۔ زندگی کی اصلیت ظاہر ہوجائے گی۔ کیا تب حقیقت سے فرار کرنے کے لیے ایسی فلمیں بنائی جائیں گی جن میں برقع پوش عورتیں نقاب الٹ کر اپنے حسن کی ایک جھلک دکھائیں گی اور سینما گھروں میں بھری ہوئی ننگی پبلک ان کو دیکھ کر جنسی تسکین حاصل کرے گی؟

میں بھی کیا اوٹ پٹانگ باتیں سوچ رہا ہوں۔ یہ لمحہ ایک تاریخی لمحہ ہے۔ کم سے کم میرے اپنے لیے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انسان جب موت کے قریب ہوتا ہے تو اس پر زندگی کی سب حقیقتیں کھل جاتی ہیں۔ میرے حساب سے میری موت میں — اور میرے فلم کی موت میں — اب صرف چند منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ مگر اب تک مجھے تو کوئی زندگی کا بھید نہیں معلوم ہوا میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیوں ہوں؟ ان تیرہ ڈبوں میں جس فلم کا نیگیٹیو رکھا ہوا ہے، وہ کیا ہے؟ کیا وہ

ایک آرٹ فلم ہے حالانکہ اس میں تو ایک عورت کا ننگا جسم بھی نہیں دکھایا گیا؟ کیا یہ ایک کامیاب فلم ہے حالانکہ کسی سنیما میں کسی نے آج تک اس کا ایک ٹکٹ بھی نہیں خریدا؟ کیا یہ بکواس ہے۔ ایک پاگل ڈائریکٹر کا پاگل پن ہے؟ کیا اس میں لگا تین لاکھ روپیہ سب بیکار گیا۔ جیسا اس کا فینانسر موہن چند بھائی کہتا ہے' اس سے تو اچھا تھا میں تین لاکھ روپے کے نوٹوں کو جلا کر اُن سے چائے بنالیتا!'' مگر پھر وہ اس مخمل کے ڈبے میں کیا رکھا ہے؟ کچھ نہیں رکھا ہے۔ جو رکھا تھا وہ تو موہن چند بھائی سب چیزوں کے ساتھ قرقی کرا کے لے گیا ہے؟

اور یہ سوچ کر نرمل ہنسنے لگا۔ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ موہن چند بھائی اپنے آپ کو بڑا عقل مند سمجھتا ہے نا؟ قرقی کرانے آیا تھا؟ کیا ملا اس کو؟۔ ایک تین ٹانگ کی ٹیبل، دو ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، ایک کتابوں کی الماری، دو ڈھائی سو کتابیں، اخباروں رسالوں کی چار من ردی، دو پیوند لگی پتلونیں، تین کالر پر سے پھٹے ہوئے قمیض، اخبار کے تراشوں کا ایک فائل جس میں نرمل نامی ایک GENIUS کی فلم ''نئی دھرتی نیا آکاش'' کی تعریف میں کالم کے کالم سیاہ کیے گئے ہیں اور ایک سونے کا گول ٹکڑا، تین تولے کا، راشٹر پتی سورن پدک۔ پریسیڈینٹس PRESIDENTS گولڈ میڈل، جو اس کو۔ نرمل کو۔ انعام ملا تھا۔ اور تھا کیا اس جھونپڑے میں؟۔ دراصل موہن چند بھائی کو تلاش تھی ان تیرہ ڈبوں کی جن میں فلم کا نیگیٹو تھا۔ مگر ان ڈبوں کو تو نرمل نے جھونپڑے کی ٹین کی چھت میں چھپایا ہوا تھا۔ بالکل جیسے ایک فلم اسٹار اور اس کے ڈیڈی نے انکم ٹیکس والوں سے بچنے کے لیے نو لاکھ روپے 'بلیک' کے نوٹ اپنے باتھ روم کی نقلی چھت میں چھپائے ہوئے تھے!

بار بار موہن چند بھائی نے کہا تھا۔'' نرمل۔ اب بھی بتا دے کہ نیگیٹو کہاں ہے؟ ہم تیرے گھر سے ایک تنکا بھی اُٹھا کر نہیں لے جائیں گے۔ صرف نیگیٹو پر قبضہ چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے۔

''سیٹھ سب جل کر خاک ہو گیا۔ اب تو نہ دھرتی ہے نہ آکاش۔'

''جل گیا۔ کب؟ کوئی ثبوت؟''

''چند گھنٹوں ہی میں ثبوت بھی مل جائے گا' سیٹھ'۔ اور دل ہی دل میں نرمل سوچ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا جھوٹ تو نہیں بولا میں نے۔ صرف چند منٹوں کی دیر ہے۔ پھر تو نیگیٹو جل کر خاک ہی ہو جائے گا۔

''اچھا تو پھر فی الحال میں یہ سونے کا تمغہ ہی لے جاتا ہوں۔ ویسے چاہیے تو نیگیٹیو جو تم نے لیبارٹری سے چُرا کر منگوالیا ہے میرے ہاں بھجوادو۔

''میڈل شوق سے لے جاؤ۔ مجھے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''تمھیں ضرورت نہیں ہے تو میں سوچتا ہوں کہ یہ میڈل تمھاری ہیروئین کو دیتا جاؤں۔ آخر درگا نے بھی تو بڑی محنت کی ہے تمھاری فلم کے لیے اور ان کو پیسے بھی تم نے پورے نہیں دیئے۔ پانچ ہزار کا وعدہ کیا تھا۔ دیئے صرف تین ہزار کیوں ٹھیک ہے نا؟''

ڈرگا!

ڈرگا!

ڈرگا!

سیٹھ سب سامان بٹور کر لے گیا تھا اور اس ویران جھونپڑے میں اِس نام کی گونج چھوڑ گیا تھا۔

بارہ سلیپنگ پلز (خواب آور دوا کی گولیاں) لینے کے بعد بھی نرمل کے دماغ میں ایک ہی نام گونج رہا تھا اور ایک ہی چہرہ گھوم رہا تھا۔

ڈرگا!

ڈرگا!

ڈرگا!

اگر ڈرگا نے مجھے ہمت نہ دلائی ہوتی (سلیپنگ پلز کے اثر سے نرمل کے گھومتے ہوئے دماغ نے سوچا) تو میں کبھی فلم نہیں بنا سکتا تھا۔

اگر درگا کی بے مثال اداکاری نہ ہوتی تو ''نئی دھرتی نیا آکاش'' ایک بے جان فلم ہوتی جو کبھی پریسیڈینٹس گولڈ میڈل پانے کی مستحق نہ ہوتی۔

اور اگر درگا نے اس سے بے وفائی نہ کی ہوتی، اگر وہ اُس کا سامان چھوڑ کر موہن چند بھائی کے پاس نہ چلی گئی ہوتی تو آج وہ اس آدھی رات کو اس بے تابی سے موت کا انتظار نہ کرتا ہوتا۔

(2)

بمبئی میں کم سے کم پانچ چھ سو وہ 'فلم رائٹر' ہیں جن کے نام کم سے کم ایک فلم کے ٹائٹلوں میں پردے پر آ چکے ہیں اور جو ایسوسی ایشن کے باعزت ممبر ہیں۔

ان میں ناول نویس بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی، جو ڈائیلاگ لکھ کر اپنا گزارا کرتے ہیں۔

ان میں 'صاحب دیوان' شاعر اور کوئی بھی ہیں جو پیٹ پالنے کے لیے میوزک ڈائریکٹروں کی دھنوں پر تک بندی کرتے ہیں۔ (ایک شاعر کا کفن موجود ہے اس سائز کا مردہ لے آیئے!)

ان میں وہ ''اسکرین پلے رائٹر'' بھی ہیں جو ہفتہ بھر میں ولایتی تصویر یا ناول کو ہندوستانی کپڑے پہنا دیتے ہیں۔

اور ان ہی میں وہ چند سر پھرے بھی ہیں جو تجارتی فارمولوں سے تنگ آ کر، اپنے پیٹ پر خود لات مار کر، اپنی ان کہانیوں کو فلمانے کی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں جن کو ہر بیوپاری پروڈیوسر REJECT کر چکا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اُن کہانیوں میں زندگی کی (اور اکثر اُن کی اپنی زندگی کی) سچائی ہے، جیتے جاگتے، جانے بوجھے کردار ہیں جو تجارتی ناولوں کی دنیا میں نہیں ملتے اور جن میں انسان کی اندرونی زندگی کے ہی نفسیاتی یا سماجی پہلو کو فن کارانہ خوب صورتی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔

ایسا ہی ایک سر پھرا ادیب نرمل تھا۔

اس کا خیال تھا کہ سنیما سمینٹ اور فولاد کی طرح ایک انڈسٹری نہیں ہے بلکہ ایک آرٹ ہے جس کا مقصد گانوں اور ناچوں اور سستے جذباتی مناظر سے لبھا کر عوام کی جیب سے پیسے نکالنا نہیں ہے بلکہ اُن کے آس کو جگانا ہے، ان کے دماغوں کو جھنجھوڑنا ہے، اُن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی جھلک دکھانی ہے تاکہ اُنہیں اپنی موجودہ زندگی کی بے انصافیوں، محرومیوں، حماقتوں اور وہموں سے نفرت ہو جائے۔

اُس کا خیال تھا کہ سنیما نہ ناول ہے نہ افسانہ، نہ تھیٹر کا ڈراما ہے، نہ ڈائیلاگ رائٹر کی لفاظی ہے، بلکہ سنیما ایک علیحدہ آرٹ ہے، ایک فن ہے دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلے میں بہت نوعمر ہے مگر جس میں موجودہ دور کی سی تیزی، تیز رفتاری اور طراری ہے، اور جو کیمرے کے ذریعے

سے انسانی زندگی، نفسیات اور کردار کے ان پیچیدہ اور تاریک پہلو روشن کر سکتا ہے جو اور کسی آرٹ کی پہنچ سے باہر ہیں اور وہ یہ جانتا تھا اور مانتا تھا کہ ان امکانات کو ممکن بنانے کے لیے بہت سے لوگوں کو بہت محنت کرنی پڑے گی، بہت سے خطرے مول لینے پڑیں گے، بہت سی قربانیاں دینی پڑیں گی لیکن اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس فن کی ترقی کے لیے سب سے پہلے اُسے اپنی جان کی بھینٹ چڑھانی ہوگی۔

جب وہ دہلی سے بمبئی آیا تھا تو اوروں کی طرح اس کو ہر پروڈیوسر کے گھر کی گھنٹی بجانی پڑی تھی۔ اس کا ایک ناول اور درجنوں افسانے شائع ہوکر کافی مقبول نہیں تو کافی مشہور ہو چکے تھے۔ نقادوں کا خیال تھا کہ ادب کے آسمان پر ایک نیا ستارہ چمکا ہے۔

لیکن پبلشر کے حساب کے مطابق ''نئی دھرتی۔ نیا آکاش'' کی صرف ایک ہزار کاپیاں شائع ہوئی تھیں۔ تین سو روپے رائلٹی کے ملے تھے۔ رہے افسانے تو اردو ہندی کے رسالے پچیس روپے سے لے کر پچاس روپے تک معاوضہ دیتے تھے اور وہ سال بھر میں بارہ افسانوں سے زیادہ نہیں لکھتا تھا نہ لکھ سکتا تھا!

سو ایک دن اس کو کہنا پڑا: ''ہم نے یہ مانا رہیں دتی میں پر کھائیں گے کیا؟'' اور بمبئی کے لیے بوریا بستر باندھنا پڑا۔

بمبئی آ کر (جیسا اُس کا خیال تھا) اس کو فٹ پاتھ پر نہ سونا پڑا نہ بھوکا رہنا پڑا۔ نہ ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو کے چکر لگانے پڑے، نہ پروڈیوسروں، ڈائریکٹروں، فلم اسٹاروں کی خوشامد کرنی پڑی، اس سے پہلے ہی اس کی شہرت بمبئی پہنچ چکی تھی۔ جہاں بھی گیا اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کافی آؤ بھگت ہوئی۔ 'نئی دھرتی نیا آکاش' کے بارے میں تو لوگوں نے کہا کہ یہ 'لٹریری کلاسیک'' ہے لیکن اسے فلمانے کی ہمت اُن میں نہیں ہے لیکن ہفتہ بھر میں ایک کہانی بک گئی۔ اسکرین پلے اور ڈائیلاگ کا کنٹرایکٹ ہوگیا۔ ایک ہزار روپے پیشگی مل گئے۔ اتنی رقم تو نرمل نے ساری عمر میں نہیں دیکھی تھی۔ اس نے حساب لگایا کہ کم سے کم تین ناول لکھنے پر اتنی رائلٹی مل سکتی ہے!

اسکرین پلے، مکالموں پر سال بھر تک محنت کرنی پڑی اور بہت جلد نرمل کو معلوم ہوگیا کہ پروڈیوسروں کو صرف اس کی کہانی کا بنیادی ڈھانچہ چاہیے تھا، اس کا نام چاہیے تھا، باقی تو وہ اپنی

پسند کا 'مال مسالہ' بھرنے پر تُلے ہوئے تھے اور انہوں نے یہ کام خود اس کے قلم سے کرایا تھا۔ اپنی کہانی کا خون اس نے خود کیا تھا۔ اپنے کرداروں کا گلا اس نے خود گھونٹا تھا لیکن پھانسی ریشم کی رسّی کی تھی۔

مگر فلم— جس کی کہانی پر اُس کا نام تھا مگر جو واقعی اُس کی کہانی نہیں تھی— کامیاب ہو گئی۔

اگلا کنٹرا یکٹ بیس ہزار روپے کا ہوا۔

جب یہ کہانی فلم کے پردے پر آئی تو نرمل کے لیے پہچاننا مشکل ہو گیا کہ یہ اسی کی لکھی ہوئی ہے۔

ہر سال اس کی کہانی، اس کے مکالموں کی قیمت بڑھتی گئی۔

ہر سال اُن کا فنی معیار گرتا گیا۔

مگر اس عرصے میں نرمل کے پاس ایک فلیٹ ہو گیا۔ فرنیچر خرید لیا گیا، نوکر رکھ لیا، ہر مہینے گھر روپیہ بھیجنے لگا۔ ماں باپ خوش ہو گئے کہ بیٹا آخر کار کمائی کرنے لگا ہے۔

مگر نرمل کا من خوش نہیں ہوا—

ہر بار اپنی کہانی میں جو چیز وہ پیش کرنا چاہتا تھا وہ فلمی بازار کے سمجھوتوں سے ختم ہو جاتی تھی اور اس کی جگہ وہی ناچ اور گانے، وہی مار دھاڑ، وہی گھٹیا کامیڈی— اگر وہ اپنے مکالموں میں بد مذاقی کی نچلی تہہ تک نہیں پہنچتا تھا تو ڈائریکٹر یا ایکٹر خود ڈائیلاگ لکھ کر وہ کمی پوری کر دیتے تھے۔

اور یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ یہاں تک کہ نرمل کا فنی ضمیر ہمیشہ کے لیے سو جاتا اور وہ بھی فلم انڈسٹری کی روپیہ کمانے کی مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ جاتا اگر اس وقت اس کی ملاقات درگا سے نہ ہو جاتی۔

(3)

دُرگا!

دُرگا!

دُرگا!

آدھی رات کے سناٹے میں نرمل کو ہر طرف سے یہی نام گونجتا سنائی دیتا تھا چھت میں لگے ہوئے پرانے پنکھے کی 'گھوں گھوں' کرتی آوازیں پاس سے گزرنے والی ریل کی دھڑ دھڑاہٹ میں۔ اور اس سے بھی زیادہ زور سے خود اپنے دل کی دھڑکن میں جو سلیپنگ پلز کے اثر سے اب بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور سوتے ہوئے دماغ کو یاد دلا رہا تھا کہ وہ سب سے پہلے کب اور کہاں اور کیسے ملے تھے۔

''فلم فورم'' کے زیرِاثر چیکوسلواکیہ کی فلموں کا ایک فیسٹول ہو رہا تھا۔

نرمل شروع سے اس فلم سوسائٹی کا ممبر تھا اور ہر غیر ملکی اور ہندوستانی آرٹ فلم جو دکھائی جاتی تھی اس کو دیکھنے باقاعدگی سے جاتا تھا کیونکہ کچھ دیر کے لیے وہ جس تجارتی فلمی ماحول میں ڈوبا ہوا تھا اس کو بھول جانا چاہتا تھا۔ جب وہ ان آرٹ فلموں کو دیکھتا تو سنیما کے اندھیرے میں اس کو اتنی ہی خوشی اور تسکین حاصل ہو جاتی جیسے یہ فلمیں خود اُس نے بنائی ہوں مگر روشنی ہوتے ہی وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے رات کے اندھیرے میں کھو جاتا کہ کہیں کوئی دیکھ کر پہچان نہ لے کہ ''یہ جا رہا ہے نرمل کمار جس نے ''میرے سجنا'' اور ''پریت کی ریت'' قسم کی فلمیں لکھی ہیں!''

اور رات کو دیر تک وہ جاگتا رہتا اور سگریٹ کے دھوئیں میں اپنے ناول پر مبنی فلم کی جھلکیاں دیکھتا رہتا۔ اس نے ایک بات طے کر لی تھی۔ یہ ناول وہ کسی تجارتی پروڈیوسر کو خراب کرنے کے لیے نہیں دے گا۔ اگر کسی باشعور فن کار نے اس کو نہ پسند کیا تو وہ خود اُس کی فلم بنائے گا۔ چاہے اُس کو ممکن بنانے کے لیے اس کو دس گھٹیا ناچ گانوں کی تجارتی فلمیں کیوں نہ لکھنی پڑیں۔

ایک رات کو وہ چیکوسلواکیہ کی ایک مشہور فلم دیکھنے گیا جس میں زیادہ تر فلم میں بس دو کردار تھے۔ ایک نوجوان نازی فوجی اور ایک چیکوسلواکین کسان عورت جس کا شوہر جنگ میں نازیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ نازی نوجوان جو تقریباً بچہ ہی لگتا ہے، اپنے ایک زخمی ساتھی کو چیکوسلواکین بیوہ کی گھوڑا گاڑی میں ڈال کر اُسے دینا VIENNA لے جانا چاہتا ہے۔ راستے بھر وہ اس عورت کو بندوق دکھا کر گاڑی چلواتا رہتا ہے اور راستے بھر وہ بیوہ اس نوجوان نازی کو اپنی کلہاڑی سے مار کر اپنے شوہر کے خون کا بدلہ لینا چاہتی ہے...... یہاں تک کہ جب جرمن فوجی کا

ساتھی دم توڑ دیتا ہے تو اس کی لاش کو گاڑی سے اتار کر پتھروں سے ڈھانپ کر 'دفن' کر دیا جاتا ہے اور تب اُس نو جوان بیوہ کو موقع ملتا ہے تو وہ اُس جرمن فوجی پر (جو دراصل پندرہ سولہ برس کا لڑکا ہی ہے جسے زبردستی فوج میں بھرتی کرلیا گیا تھا) برس پڑتی ہے اس کو مارتی ہے، پیٹتی ہے، نوچتی ہے، کھسوٹتی ہے ایسا لگتا ہے وہ پاگل ہوگئی ہے۔ وہ ہنس رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اس کے دل میں بھری ہوئی نفرت اس کے من کا سارا زہر، آنسو بن کر نکل گیا ہے۔ رفتہ رفتہ مارنے پیٹنے کی جسمانی قربت اور تعلق ان دونوں کے درمیان ایک انسانی جذبہ بیدار کر دیتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹ کر سو جاتے ہیں۔

نرل اس نو جوان چیکوسلواکین ایکٹریس کی اداکاری سے بے حد متاثر ہوا۔ فلم ختم ہوئی اور روشنیاں ہوئیں تو نرل رومال سے چشمہ صاف کرنے کے بہانے سے اپنی آنکھیں پونچھ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کے قریب ایک خوب صورت سی مگر سنجیدہ لڑکی بھی (جو اندھیرا ہونے کے بعد آ کر بیٹھ گئی ہوگی) اپنی ساڑی کے پلّو سے آنسو پونچھ رہی ہے۔

اتنا سنجیدہ اور غم ناک فلم دیکھنے کے بعد بھی اس لڑکی کو دیکھ کر نرل کو ہنسی آ گئی۔

لڑکی جوان تھی، بچی نہیں تھی، لیکن اس کا قد (جو چھ فٹ ایک انچ لمبے نرل کے برابر بیٹھے ہوئے اور بھی مختصر لگتا تھا) اتنا چھوٹا تھا کہ سنیما کی کرسی پر بیٹھ کر اس کے پیر زمین پر نہیں ٹک سکتے تھے اور اب وہ بچوں کی طرح کرسی سے اُتر کر اپنے چپل تلاش کر رہی تھی۔

نرل کو ہنستے سن کر لڑکی نے کسی قدر خفگی بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اتنا لمبا تڑنگا آدمی دیکھ کر دیکھتی ہی رہ گئی۔

نرل جلدی سے سنیما سے باہر نکل آیا اور حسب معمول بھیڑ سے کتراتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف لپکا۔

وہاں کوئی ٹیکسی نہیں تھی۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ایک ٹیکسی آتی ہوئی دکھائی دی۔

نرل نے آواز دی "ٹیکسی"!

لیکن ساتھ ہی ایک زنانہ آواز بھی بلند ہوئی "ٹیکسی!"

ٹیکسی آ کر رکی تو ایک طرف سے نرمل نے دروازہ کھولا۔

دوسری طرف سے ایک لڑکی نے۔ اُسی چھوٹے سے قد کی لڑکی نے۔

نرمل لڑکیوں سے جھینپتا تھا، شرماتا تھا، کتراتا تھا۔ اُس نے کہا۔ آپ لے لیجیے' اور پیچھے ہٹ گیا۔

لڑکی ٹیکسی میں بیٹھ گئی تو لڑکی نے اِدھر اُدھر نگاہ کی اور جب کوئی دوسری ٹیکسی نہیں نظر آئی تو پوچھا' 'آپ کہاں جائیں گے؟''

''کھار۔'' نرمل نے جواب دیا۔

''مجھے تو صرف دادر تک جانا ہے لڑکی نے کہا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ چاہیں تو آپ بھی آجایے۔ میں دادر اتر جاؤں گی۔ اُس کے بعد آپ آگے لے جایئے گا۔''

نرمل نے سنا تھا بمبئی میں اس طرح ٹیکسی میں ساتھ بٹھا کر لڑکیاں انجانے مردوں کو بلیک میل کرتی ہیں، سو وہ کسی قدر جھجکا اگرچہ ڈرائیور کے پاس بیٹھنے میں کچھ زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس پیشکش کو قبول کرے یا نہ کرے کہ اتنی دیر میں ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔'' بابو جی۔ آیے نا۔ میرا بھی بھلا ہو جائے گا۔ مجھے بھی اُدھر اندھیری ہی جانا ہے۔''

سو نرمل ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹیکسی چل پڑی۔

وہ نہایت شریفانہ طریقے سے آگے کو ہو کر بیٹھا تھا اور آگے ہی دیکھ رہا تھا۔ صرف کبھی کبھی کن انکھیوں سے ڈرائیور کے سامنے لگے ہوئے آئینے میں ایک کتابی چہرے کی جھلک دیکھ لیتا تھا جس پر سڑک کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

مگر اس کے کان میں لڑکی کی آواز آئی۔'' آپ کو پکچر کیسی لگی؟''

اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ لڑکی سیٹ کے اگلے سرے پر بیٹھی تھی اور اس کی ٹانگیں مشکل سے ٹیکسی کے فرش کو لگ رہی تھیں۔ جواب دیتے وقت وہ آپ سے آپ مسکرا دیا۔''تصویر تو واقعی ماسٹر پیس ہے مگر اس لڑکی نے کمال کر دیا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں ایسی ایکٹریس نہیں ہیں۔''

لڑکی کے جواب دینے کے انداز میں ایک للکار تھی۔" آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ایسی ایکٹریس نہیں ہیں۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا کام کرنے والی کوئی فلم اسٹار نہیں ہے۔ کیا ہمارے ڈائریکٹروں نے کوشش کی ہے اچھی ایکٹریس کو تلاش کرنے کی۔ وہ تو صرف چینی کی گڑیا پیش کرتے رہتے ہیں۔"

نرمل نے کہا۔" آپ ٹھیک کہتی ہیں" اور سوچنے لگا یہ چھوٹی سی لڑکی باتیں تو دلچسپ کرتی ہے۔

لڑکی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اور ایک بات یہ بھی ہے کہ کہانی ہی ڈھنگ کی نہ ہو تو ایکٹریس بے چاری کیا کر سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں کتنے اچھے ناول لکھے گئے ہیں مگر مجال ہے جو ہمارے پروڈیوسروں نے ان میں سے ایک کو بھی فلمانے کی جرأت کی ہو۔"

" لڑکی پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے" نرمل نے سوچا اور پھر پوچھا۔ کسی ایک ناول کا تو نام بتایئے جو فلم بنانے کے قابل ہے؟

' کئی نام بتا سکتی ہوں' لڑکی نے کہا۔' مگر سب سے زیادہ تو مجھے 'نئی دھرتی نیا آکاش' پسند ہے۔ اپنے ناول کا نام سن کر نرمل کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ لڑکی بولتی گئی" اگر اس کو ایمانداری سے بنایا جائے تو جو فلم ہم دیکھ کر آئے ہیں اس پایہ کی فلم بن سکتی ہے۔"

" ایمانداری سے بنانے سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے پوچھا اور سوچا نہ جانے میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے۔

" مطلب یہ ہے کہ پروڈیوسر اپنے فارمولے لگا کر ناول کا ستیاناس نہ کر دیں جیسے....."
اور وہ کہتے کہتے رک گئی۔

" جیسے؟" نرمل نے پوچھا۔

" جیسے اس ناول کا لیکھک بے ایمانی سے اپنی کہانیوں کو تجارتی ڈھرے پر لے آیا ہے۔ سچ کہتی ہوں میرا جی چاہتا ہے کہ وہ نرمل کمار کہیں مل جائے تو اس کا منہ نوچ لوں۔"

نرمل بے اختیار گھبرا کر پیچھے کو ہو گیا مگر اس نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا کہ اندھیرے میں لڑکی نے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ نہ دیکھا تھا۔

ٹیکسی اب دادر کے علاقے میں پہنچ گئی تھی۔ ایک چال کے پاس لڑکی نے ڈرائیور سے کہا۔

''یہاں روک دو بھائی میٹر کتنا ہوا؟''

نرمل نے کہا: ''رہنے دیجیے۔ میں تو آگے جا ہی رہا ہوں۔''

مگر لڑکی نے کسی قدر سختی سے کہا: ''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دادر تک کا کرایہ میں دوں گی۔''

ڈرائیور نے قصہ ختم کرتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے جی۔ پانچ روپے اسّی پیسے دے دیجیے۔''

اور یہ کہہ کر اس نے میٹر کو اٹھا کر گھنٹی بجائی اور پھر گرا دیا۔

نرمل پچھلی سیٹ پر جانے کے بہانے سے اتر آیا اور کن انکھیوں سے چال کو دیکھنے لگا کہ شاید کبھی اس پتے پر آنے کی ضرورت پیش آئے۔

لڑکی نے خود ہی کہہ دیا: ''اس چال کا نام ہے سونا والا چال ہم دوسرے مالے پر رہتے ہیں۔''

''اچھا جی نمستے۔''

''نمستے۔''

ٹیکسی چل پڑی۔ لڑکی نے مڑ کر آواز دی۔ ''ذرا ٹھہریئے۔''

ٹیکسی رُک گئی۔

''اپنا نام تو بتاتے جایئے۔''

نرمل ایک پل کے لیے جھجکا۔ پھر بولا: ''میں نرمل کمار ہوں۔''

اب اس لڑکی کی باری تھی حیران ہونے کی۔

''نئی دھرتی، نیا آکاش' والے نرمل۔۔؟''

''جی ہاں وہی اور آپ کا نام؟''

اب ٹیکسی پھر چل پڑی تھی لیکن لڑکی کی آواز آئی۔

''درگا۔''

اور اب ٹیکسی ڈرائیور نے نرمل سے ہنس کر کہا: ''قد چھوٹا ہے مگر چھوکری بری نہیں ہے۔''

نرمل کو ڈرائیور کی بے تکلفی بری لگی مگر ایسے لوگوں کا کوئی کیا کر سکتا ہے خصوصاً جب ڈرائیونگ وہیل اُن کے ہاتھ میں ہو۔ پھر بھی اُس نے اپنے لہجے سے اُسے ڈانٹا۔ ''جی؟''

مگر ڈرائیور کا منہ کون بند کر سکتا ہے۔ '' کیوں بابو جی آپ وہی نرمل کمار ہیں نا جو فلم کی

اسٹوری لکھتا ہے؟''

''جی ہاں۔ ہوں تو وہی۔''

بابو جی مجھے آپ کی پچھلی فلم'' آمیرے سجنا'' بہت اچھی لگی۔ کیا فسٹ کلاس گانے ہیں اور وہ ''پتنگ ڈانس تو واہ واہ......''

مگر اس وقت نرمل ڈرائیور کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ اس کے کان ایک نئی لے، ایک نیا سنگیت، ایک نئی دھن سے گونج رہے تھے۔

''دُرگا!''

''دُرگا!''

''دُرگا!''

(4)

دوسری بار نرمل اور دُرگا پھر ''فلم فورم'' کے شو میں ملے۔

نرمل نے سوچا۔ یہ تو گھٹیا رومانی فلم کا سینیریو بنتا جارہا ہے میں تو اصولاً "BOY MEETS GIRL" (لڑکا لڑکی سے ملتا ہے) قسم کی حادثاتی رومانٹک کہانیوں کے خلاف ہوں حالانکہ ہر فلم میں ایسے ہی سین لکھنے پڑتے ہیں۔ کبھی امیر لڑکی کی موٹر بگڑ جاتی ہے۔ غریب لڑکا گیراج کا میکینک ہے فوراً کار ٹھیک کر دیتا ہے یا لڑکا زمیندار کا بیٹا ہے، موٹر میں گاؤں دیکھنے جارہا ہے۔ لڑکی گاؤں کی گوری ہے، گھڑا لے کر پانی بھرنے جارہی ہے۔ موٹر کی آواز سے گھبراتی ہے گھڑا گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ لڑکا اس کے پیچھے کار بھگاتا ہے۔ وہ پتھر مار کر کار کا شیشہ توڑ دیتی ہے۔ دونوں برابر ہو جاتے ہیں پھر ان کا پیار کرنا تو لازمی ہوا۔ یا لڑکا لڑکی دونوں متوسط درجے کے ہیں۔ دونوں سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ برابر کی سیٹوں پر بیٹھتے ہیں۔ لڑکا چھ فٹ ایک انچ لمبا ہے۔ لڑکی چھوٹی سی ہے سینما ختم ہونے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ لڑکا بے اختیار ہنس پڑتا ہے، لڑکی کھسیاتی ہے پھر ٹیکسی اسٹینڈ پر ملاقات ہوتی ہے۔ ٹیکسی ایک ہی ہے دونوں اس کو لینے کی کوشش کرتے ہیں پھر دونوں ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے ہیں، راستے میں فلم کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں۔ لڑکا ایک ناول نویس ہے اس نے ایک بہت اچھا ناول لکھا ہے، مگر اب تجارتی

فلموں کے لیے کہانی ڈائیلاگ وغیرہ لکھتا ہے، لڑکی ناول کی تعریف کرتی ہے۔ ناولسٹ کی برائی کہ اپنے قلم کو اُس نے بیچ ڈالا ہے، جب لڑکا نام بتاتا ہے تو لڑکی حیران پریشان رہ جاتی ہے اور......

پھر دوبارہ سنیما میں اُن کی ملاقات ہوتی ہے؟ ارے یہ تو اُس کی اپنی آپ بیتی ہے۔ کیا زندگی میں بھی ایسے دلچسپ واقعات ہوتے ہیں؟ ہاں تو پھر کیا ہوا؟ اس بار اُسے سنیریو لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ زندگی، وقت، قسمت، بھگوان یا کارل مارکس سنیریو لکھ رہا تھا۔ دونوں تو اس فلم میں صرف اداکاری کر رہے تھے۔ جو کچھ اسکرپٹ میں لکھا تھا وہ کرتے جا رہے تھے۔ وقت گزرتا گیا اور لکھنے والے نے یہ دکھانے کے لیے کہ وقت گذرتا جا رہا ہے اور دو انجانے ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے ہیں اس کا مونتاژ کچھ اس طرح بنایا تھا۔

دوبارہ وہ فلم فورم کے شو میں ملے۔ ایک دوسرے کو پہچانا مگر اُن کی سیٹیں پاس پاس نہیں تھیں۔ انٹرول میں ملاقات ہوئی مگر بھیڑ اتنی زیادہ تھی اور ہر شخص بیک وقت بول رہا تھا کہ بات نہ ہو سکی۔ نرمل نے آلو کے ویفروں کا ایک پیکٹ درگا کی طرف بڑھایا۔ اس نے کچھ کہہ کر لے لیا، جو سنائی نہیں دیا مگر مسکراہٹ سے معلوم ہوتا تھا ''تھینک یو'' کہا ہوگا۔

پھر شو ختم ہونے کے بعد ٹیکسی اسٹینڈ پر ملاقات ہوئی آج ٹیکسی نہیں تھی اور نہ دُرگا کا ارادہ ٹیکسی لینے کا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ میری پرس میں آج اتنے پیسے ہی نہیں ہیں اور جب نرمل نے کہا میں آپ کو ٹیکسی میں پہنچا دوں گا تو اس نے کہا کہ معاف کیجیے گا میں انجانے لوگوں کے ساتھ رات کو ٹیکسی میں نہیں جاتی۔

''تو آیے پھر جانکاری بڑھانے کے لیے سامنے والے ایرانی ریستوران میں چائے پی لیں۔ پھر میرین لائنیز اسٹیشن سے ٹرین لے لیں گے۔''

''چلیے'' درگا نے کہا۔

مگر دونوں کا ساتھ چلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ چھ فٹ ایک انچ کا نرمل لمبے لمبے قدم لیتا تھا۔ چھوٹی سی درگا کو اس کا ساتھ دینے کے لیے بھاگ کر چلنا پڑتا تھا۔

یہ دیکھ کر نرمل ٹھہر گیا۔ ''معاف کیجیے گا میں بہت لمبے لمبے قدم لیتا ہوں نا؟''

درگا کا سانس پھول رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اوپر نظر کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ

جیسے لمبے قد کے آدمی کے ساتھ چلنا عجیب لگتا ہے۔کوئی دیکھے گا تو کہے گا ایک اچھے خاصے آدمی کے ساتھ پستہ قد بونی جا رہی ہے۔''

''عجیب تو مجھے محسوس کرنا چاہیے۔کوئی دیکھے گا تو کہے گا،ایک شریف لڑکی کے ساتھ کوئی راکھشس چلا جا رہا ہے۔'

پھر وہ دونوں ہنس پڑے،ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر۔نرمل کو نیچے دیکھنا پڑا۔دُرگا کو اوپر دیکھنا پڑا۔مگر اس ہنسی نے ان کے درمیان جو جھجک اور تکلف کے پردے تھے وہ ہٹا دیے۔ اس وقت سے وہ دوست ہو گئے۔

اگلے سین میں وہ کئی دن کے بعد ایک پارک میں بینچ پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

''درگا۔کیا تم نے کبھی فلم میں کام کرنے کے بارے میں سوچا ہے؟''

''سچ سچ بتاؤں؟''

''میں بمبئی اس ارادے سے آئی تھی۔ماں باپ کو بھی راضی کر لیا تھا کہ بی۔اے کرنے کے بعد ٹیچری کرنے کے بجائے فلم میں کام کروں۔''

''تو تم بی۔اے ہو۔کس مضمون میں؟''

''سائیکالوجی میں۔''

''فلم انسٹی ٹیوٹ کے ایکٹنگ کورس میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟''

''سچ سچ بتاؤں؟''

''بتاؤ۔''

''میرے پتا سرکاری نوکری سے اسی سال ریٹائر ہوئے ہیں۔میری پڑھائی پر اب ڈھائی سو روپے ماہوار نہیں خرچ کر سکتے،اس کے علاوہ میں چوبیس برس کی ہوگئی ہوں—''

''چوبیس برس؟ تم تو سولہ سترہ برس کی لگتی ہو!''

''لگتی ہوں—اپنے قد کی وجہ سے۔لیکن دو برس میں چھبیس برس کی ہو جاؤں گی۔پھر شاید کوئی مجھے لے گا ہی نہیں۔''

''پھر کیا کیا؟''

''یہاں آ کر کتنے پروڈیوسروں ڈائریکٹروں سے ملی۔ ایک فینانسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہتے ہیں اتنے چھوٹے قد کی لڑکی ہیروئین نہیں بن سکتی—''

''کیوں نہیں بن سکتی۔ میں کتنی ہی ہیروئنوں کے نام بتا سکتا ہوں— بیکارانی ہی کو دیکھ لیجیے......''

میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ سب سائڈ رول آفر کرتے ہیں، ہیروئین کی سہیلی، ہیرو کی بہن قسم کے۔ مگر ایک شرط پر۔''

''وہ کیا؟''

''وہ آپ جانتے ہیں۔''

''اوہ— اور وہ تمھیں منظور نہیں ہے؟''

''نہیں۔ اس لیے اب میں نے فلموں کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب لائبریری کا ڈپلوما لے رہی ہوں۔ چھ مہینے بعد کسی لائبریری میں کام مل جائے گا۔''

''مگر لائبریرین کی ناک پر تو عینک لگی ہونی چاہیے۔''

''وہ میری ناک پر بھی لگ جائے گی۔ یہ دیکھو۔''

اور اس نے اپنے پرس سے ایک عینک نکال کر لگائی۔ ''پڑھنے کے لیے لگانی پڑتی ہے۔ اب تو میں بچّی نہیں لگتی۔''

''اب تم ایک بچّی لگتی ہو جس نے بچّوں کے ڈرامے کے لیے اپنے پتا کا چشمہ لگا لیا ہو۔''

اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ یہ ہنسی بہت خطرناک ہے (نرمل اکثر سوچتا تھا) یہ ایک دن ہمیں بہت خطرناک حد تک ایک دوسرے کے قریب لے آئے گی۔

(5)

وقت گزرتا گیا۔

مونتاژ میں نئے ٹکڑے آ کر جڑتے رہے۔ جیسے وہ سین جس دن نرمل نے اپنی زندگی—

اور موت — کا فیصلہ کیا اور ''نئی دھرتی نیا آکاش'' فلم کی مہورت ہوئی۔
یہ مہورت (جیسے اور مہورتیں ہوتی ہیں) کسی اسٹوڈیو میں نہیں ہوئی۔
اس مہورت میں اُن لوگوں کو نہیں بلایا گیا تھا۔ فینانسرس، پروڈیوسرس، ڈائریکٹرس، فلم اسٹارس اور چھوٹے موٹے ایکٹریس — جن کو ملا کر 'فلم انڈسٹری' کہا جاتا ہے۔
نہ اتنے بڑے بڑے ''مہورت کارڈ'' بٹے تھے جو سردی میں لحاف کا کام دے سکتے ہیں اور جن کے لفافوں میں میلے کپڑے رکھ کر لانڈری میں دے سکتے ہیں۔
اس مہورت کے لیے نہ کوئی منسٹر بلایا گیا نہ کوئی سیاسی لیڈر۔ نہ کسی اسٹار سے کلیپ دلوایا گیا نہ کسی فینانسر سے کیمرہ چلوایا گیا۔
نہ لڈو بٹے، نہ پیڑے، نہ ٹھنڈی چائے اور گرم کوکوکولا مہمانوں کو پیش کیا گیا۔
پھر بھی یہ ایک اہم فلم کی تاریخی مہورت تھی۔ اس فلم کو آگے چل کر پریسیڈنٹ گولڈ میڈل ملنے والا تھا۔ اس فلم کی ہیروئین کو ملک کی بہترین ایکٹریس کا 'اروشی ایوارڈ' ملنے والا تھا۔ اس فلم کا پروڈیوسر، رائٹر، ڈائریکٹر، ایکٹر GENIUS کہلایا جانے والا تھا مگر اس فلم کو کبھی کسی سنیما میں نہیں دکھایا جائے گا۔ اس فلم کو بنانے میں نرمل کمار کی سب بچت لگ جائے گی، اُس کا سارا فرنیچر بک جائے گا، فلیٹ کو چھ ہزار پگڑی پر دے کے فلم نیگیٹیو کے بارہ ڈبے خریدے جائیں گے اور خود نرمل ایک ٹین کی چھت کے جھونپڑے میں اپنی دو ڈھائی سو کتابوں سمیت رہنے لگے گا۔ اس اُمید کے ساتھ کہ ''جب ہماری فلم چل جائے گی تو ہم پرانی فلیٹ سے بھی اچھا گھر کرائے پر لے لیں گے۔'' اور اس کے لیے سیٹھ مون چند بھائی سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ قرض لینا پڑے گا جو دو برس میں سود در سود ملا کر تین لاکھ روپیہ ہو جائے گا اور وہ ہُنڈیوں کی بنا پر ڈراما کر کے نرمل کے خلاف ڈگری لے لے گا اور علاوہ اور چیزوں کے تین تولے کا پریسی ڈینٹ گولڈ میڈل بھی قرق کرا کے لے جائے گا اور نرمل کے پاس اس فلم کے نیگیٹیو کے تیرہ ڈبے رہ جائیں گے۔
لیکن یہ سب تو مستقبل میں ہونے والا تھا جس کے بارے میں اُن کو کچھ نہیں معلوم تھا جنھوں نے ''نئی دھرتی نیا آکاش'' کی مہورت میں شرکت کی تھی۔
ایک تھا نرمل۔

ایک تھی درگا۔

جگہ تھی نرمل کی دو کمروں کی چھوٹی سی فلیٹ جہاں آج دُرگا پہلی بار آئی تھی۔ اس فلیٹ کو نرمل نے بڑے چاؤ اور بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ تصویریں، ٹیبل لیمپ کا بڑا شیڈ، جس پر مہورتوں کے دعوتی کارڈ، نئے سال کی مبارک باد کے کارڈ اور اخباروں کے تراشے اور تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

لمبی نیچی کافی ٹیبل جو اخباروں، رسالوں، کتابوں کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی چاروں طرف دیوار سے لگی ہوئی الماریاں تھیں جن میں کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

''بڑا اوٹ پٹانگ کمرہ ہے میرا۔ تمھیں تو کیا پسند آئے گا؟''

درگا نے ادھر اُدھر دیکھا پھر کتابوں کی مخصوص بو یا خوشبو کو ناک لگا کر سونگھا، پھر بولی۔

''نہیں۔ مجھے تو یہ کمرہ بہت اچھا لگتا ہے۔''

پھر وہ کتابوں کی الماری کے پاس گئی۔ اِدھر اُدھر سے کتابیں نکال کر دیکھنے لگی۔ ایک پتلی سی کتاب نکالی اور کہنے لگی۔'' آپ نے اس ناول کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے سب سے پہلے آپ کو اس کا فلم بنانا چاہیے تھا۔''

''نئی دھرتی نیا آکاش؟ جتنے پروڈیوسروں نے پڑھا ہے سب کہتے ہیں یہ بہت بلکہ عظیم ناول ہے مگر اس کو فلمایا نہیں جا سکتا۔''

''اور آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں نے تو بہت دنوں سے اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔''

''اب سوچ لیجیے۔ بہت وقت پڑا ہے۔''

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد نرمل نے دُرگا کی نقل کرتے ہوئے کہا۔'' سچ سچ بتا دوں؟''

اور دُرگا نے مسکرا کر نرمل کی نقل کرتے ہوئے کہا:''اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔''

''تو سنیے۔ اس ناول میں وہ سب ہے جس کو ایک ذہین حساس اور قابل ڈائریکٹر ایک خوب صورت فلم میں ڈھال سکتا ہے۔''

''کیا ایسا کوئی ڈائریکٹر ہے آپ کی نظر میں؟''

نرمل جو بے چینی سے اپنی لمبی ٹانگوں کو ہلاتا اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ دیوار پر لگے ہوئے آئینے

کے سامنے ٹھہرا اور بولا: ''ہے نظر میں۔''

''اور وہ کون ہے؟''

''سچ سچ بتادوں۔''

''بتایئے نا۔''

''وہ میں خود ہوں۔ عام طور سے میں اس قسم کے دعوے کرنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ میں بڑا خاکسار قسم کا آدمی ہوں۔ مگر نہ جانے کیوں آپ کے سامنے خاکساری جتانے کو جی نہیں چاہتا، سچ بولنے کو جی چاہتا ہے۔''

''شکریہ کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب تو نہ ہوگا کہ میں بھی ایسا ہی سمجھتی ہوں؟''

''شکریہ۔ مگر ہم دو کے ایسا سوچنے سے کیا ہوسکتا ہے؟''

''کیا نہیں ہوسکتا؟ ایک ہمت والے آدمی کے سوچنے سے بہت کچھ ہوسکتا ہے اور پھر ہم تو دو ہیں۔''

''آپ میرا ساتھ دیں گی؟''

''ایک شرط پر۔''

''منظور ہے۔''

''کہو کہ تم میرا ساتھ دو گی؟''

''تم میرا ساتھ دو گی؟''

''ضرور۔ جب سے میں نے یہ ناول پڑھا تھا، اُس وقت سے اس کے فلمی امکانات پر غور کر رہی ہوں اور اُس دن کا انتظار کر رہی ہوں جب اس کے جیتے جاگتے کردار اسکرین پر نمودار ہوں گے۔''

''تم اس میں میری کیا مدد کرسکتی ہو؟''

دُرگا نے نرمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ایک لفظ کو بڑے یقین کے ساتھ ادا کرکے کہا: ''اس فلم کے لیے میں ہر ممکن اور ناممکن بات کرسکتی ہوں۔ مگر سب سے پہلے میں اس

فلم کی نوراں بن سکتی ہوں......اگر آپ کو۔۔ میرا مطلب ہے تم کو۔۔ کوئی اعتراض نہ ہو۔ دیکھا آپ نے خاکساری جتانے کی بجائے میرا ابھی بھی سچ بولنے کو چاہتا ہے۔"

دُرگا! نوراں! دُرگا! نوراں! نوراں! درگا!

نرل کے دماغ کے پردے پر یہ دو تصویریں ایک کے بعد ایک جھلکتی رہیں۔۔ دُرگا! نوراں! درگا! نوراں!۔۔ ایک جو ناول نگار کے دماغ کی تخلیق تھی، دوسری جو گوشت پوست کی جیتی جاگتی نوجوان عورت تھی۔ یہاں تک کہ یہ دو تصویریں ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔۔ اور آخر کو ایک ہوگئیں۔

نوراں کے بارے میں نرل نے لکھا تھا۔" نوراں عورت نہیں تھی۔ مگر نوراں بچّی بھی نہیں تھی۔ نوراں کی آواز میں پھولوں کی سی نرمی تھی مگر اس کے انداز میں فولاد بھی تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کتنے برس کی ہے۔ شاید وہ سولہ سترہ سال کی ہی تھی جیسی کہ وہ لگتی تھی۔ لیکن کم عمر ہی میں زندگی نے اس کو اتنے تلخ سبق سکھائے تھے کہ اس کی عقل اور سوجھ بوجھ بڑی بوڑھیوں سے زیادہ تھی۔ نوراں ایک حسین دل فریب محبوبہ تھی۔ نوراں ایک ذہین دماغ تھی۔ بظاہر وہ ایک نازک سی چھوٹی سی لڑکی تھی۔ مگر بنیادی طور سے نوراں ایک مکمل عورت تھی جو دنیا کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور جس کی کوکھ سے دنیا جنم لیتی ہے۔"

واقعی (اور یہ حقیقت نرل کے ذہن پر اس طرح آشنا ہوئی تھی جیسے بجلی کی چمک اندھیرے کا سینہ چیر کر ایک لمحے کے لیے روشنی کر دیتی ہے) دُرگا نوراں بننے کے لیے ہی پیدا ہوئی تھی اور نوراں کا کردار اسی لیے لکھا گیا تھا تا کہ ایک دن دُرگا اِس فلمی خاکے میں زندگی کا رنگ بھر دے۔

آخر کار نرل بولا۔" بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ تم ہی نوراں بن سکتی ہو۔ ملاؤ ہاتھ اس بات پر۔"

مگر دُرگا نے نرل کے پھیلائے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ نہیں رکھا۔

" آپ جانتے ہیں کہ اس فلم کو بنانے کے لیے آپ کو بڑی تپسّیا کرنی پڑے گی، بڑی قربانیاں دینی پڑیں گی؟"

" جانتا ہوں درگا۔ فلم سازی کے تجارتی ماحول سے رشتہ توڑنا پڑے گا۔"

"......سوکھی روٹی اور ٹھنڈے پانی پر گزارا کرنا پڑے گا؟"

''یہ بھی جانتا ہوں۔''

''.....کوئی پیسے والا آپ کی مدد نہیں کرے گا؟''

''جانتا ہوں۔''

''............ایسی تجرباتی فلم بنانے والے کو تجارتی فلموں کو لکھنے کا کام ملنا بند ہو جائے گا؟''

''جانتا ہوں۔''

''تو ملاؤ ہاتھ۔'' درگا نے کہا اور جب اس کا چھوٹا سا ہاتھ اُچھل کر نرمل کے طاقتور پنجے کی طرف بڑھا تو ایسا محسوس ہوا کہ ایک چھوٹی سی چڑیا اُڑ کر اپنے گھونسلے میں جا بیٹھی ہے جہاں گرمی ہے اور نرمی ہے اور مکمل حفاظت ہے!

''تو پھر مہورت کب کریں۔'' نرمل نے ہنس کر پوچھا۔

''ابھی۔ اسی وقت۔''

''اسی وقت؟''

''ہاں۔ اسی وقت۔ اسی جگہ۔''

''مگر کیسے؟''

''مہورت ہوتی کس طرح ہے؟''

''ہیرو یا ہیروئین یا وہ دونوں کیمرے کے سامنے آتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا سین ایکٹ کرتے ہیں اور اس سے پہلے فلم کا نام لے کر اور مہورت شاٹ ٹیک نمبر ایک کہہ کر کلیپ بورڈ کے دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے کھٹاک سے ملا دیا جاتا ہے۔ ایسے ہوتی ہے مہورت۔''

''ہمارے فلم کی مہورت بھی ایسے ہی ہوگی۔'' یہ کہہ کر درگا نے نرمل کو آرام کرسی کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں بیٹھو۔ تم ہو ہیرو۔''

''میں ہیرو؟ میں نے تو کبھی ایکٹ نہیں کیا!''

''وہ تو میں نے بھی کب کیا ہے، سوائے کالج کے ڈرامے میں جون آف آرک بننے کے۔''

''کالج کے ڈرامے میں تو میں نے بھی محمد بن تغلق کا پارٹ کیا تھا۔''

''بس تو تم ہو گئے ہیرو۔ دیکھو ورنہ میں کام نہیں کروں گی۔''

جب نرمل بیٹھ گیا تو درگا نے کہا۔" اور میں ہوں ہیروئین۔" وہ خود کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔" اب آواز آتی ہے "نئی دھرتی، نیا آکاش، مہورت شاٹ ٹیک نمبر ایک۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تالی بجائی۔ پھر نرمل کی طرف دیکھ کر پورے وشواس کے ساتھ بولی۔" یہ دھرتی یہ آکاش پرانے ہو چکے ہیں۔ ہم چین نہیں لیں گے جب تک ایک نئی دھرتی ایک نیا آکاش نہ بنا لیں گے۔ ایک دن ہمارے خواب ضرور پورے ہوں گے!" یہ فقرہ اُس نے ناول کا ہی دہرایا تھا۔

اور یہ کہہ کر ہیروئین نے ہیرو کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ نرمل اس کی دلفریب لمس سے کچھ بوکھلا سا گیا مگر اُس لمحے درگا چھٹک کر علیحدہ ہو گئی اور زور سے چلائی۔" کٹ...... مہورت مبارک ہو مسٹر نرمل۔"

اور پھر دونوں ہنس پڑے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر دیر تک ہنستے رہے یہاں تک کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(6)

تین مہینے کے بعد جب فلم چار ریل بن گئی اور اس کا ایک ٹرائل ہوا تو باوجود اس کے کہ ابھی ایڈیٹنگ مکمل نہیں ہوئی تھی اور بیچ میں کتنی ہی جگہ سین ابھی لیے نہیں گئے تھے، پھر بھی دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستانی سنیما میں ایک انقلاب آ گیا ہے۔ نرمل نے ایکٹر اور ڈائریکٹر دونوں حیثیتوں سے ثابت کر دیا تھا کہ ایک ذہین دماغ اور حساس دل کو لمبے چوڑے تجربے کی ضرورت نہیں تھی مشاہدے کی پکڑ مضبوط ہونی چاہیے۔

مگر فلم کی جان تو دُرگا کی اداکاری تھی۔ ایک غریبوں کی بستی کی الھڑ لڑکی جس کا حسن اور جوانی اس کے میلے کچیلے کپڑوں سے پھوٹ رہی تھی— جو بچپن ہی میں یتیم ہو گئی تھی— نہ ماں نہ باپ— مگر تین بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر تھی— جو اُن بچوں کی ماں بھی تھی، باپ بھی، بہن بھی— شروع کے سب سین غریبوں کی بستی کے ہی تھے، ایسا لگتا تھا یہ فلم نہیں ہے، زندگی ہے۔ صرف چپکے سے بغیر کسی کو بتائے ہوئے کسی نے فلم بنا دی ہے۔ مگر یہ نرمل جانتا تھا اور درگا جانتی تھی اور ان کے ساتھ کام کرنے والے جانتے تھے کہ اس حقیقت

اس زندگی کوفن کارانہ سادگی سے پیش کرنے میں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے، کتنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ کیمرہ مین انسٹی ٹیوٹ کا پڑھا ہوا ایک لڑکا تھا اور اس نے بھی اپنے غیر معمولی زاویوں سے ہاتھ میں کیمرہ لے کر اداکاروں کے ساتھ ساتھ چل کر، مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر، کھائیوں اور گندے گڑھوں میں لیٹ کر، اپنے آرٹ کا مظاہرہ کیا تھا اور اس کالے اور سفید فلم میں زندگی کی اصلیت کا رنگ بھر دیا تھا۔

اُس رات کوٹرائل دیکھ کر اُن کی پروڈکشن کمپنی کی میٹنگ ایک ایرانی چائے خانے میں ہوئی۔ کیونکہ پروڈکشن منیجر کے اکاؤنٹ کے مطابق آج اُن کی کمپنی— آکاش فلمز— صرف ایک ایک سنگل چائے کا خرچہ برداشت کرسکتی تھی۔

اس کانفرنس میں نرل اور دُرگا کے علاوہ کیمرہ مین سدھیر، پروڈکشن منیجر ماتھر اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر دادر کر شامل تھے۔

نرل نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ''چار ریل تک تو فلم ہم نے بنا پیسے کے بنالی......''

دُرگا نے بات کاٹ کر کہا: ''بنا پیسے کے کیسے کہتے ہو؟ تم نے جیب سے چار ہزار روپے جو بینک میں جمع تھے وہ لگا دیے۔ چھ ہزار میں فلیٹ بیچ ڈالا اپنے دوستوں سے قرض لیا۔ لیبارٹری کا قرضہ دینا ہے۔ کیمرہ والوں کا حساب بھی تمھیں چکانا ہے......''

''وہ تو ٹھیک ہے'' نرل نے کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟''

ماتھر نے کہا۔ ''کسی فینانسر کو یہ چار ریلیں دکھا کر قرضہ لینا چاہیے اور اس سے تصویر مکمل کرنی چاہیے۔''

''ہے کوئی ایسا فینانسر جو تمھارے خیال میں ایسی فلم میں بلاشرط روپیہ لگائے گا؟''

''مشکل ہے'' ماتھر نے کہا۔ ''شرطیں تو رکھے گا۔ کم سے کم تین چار گانے تو ڈالنے ہوں گے ہمیں۔ ایک آدھ باکس آفس آرٹسٹ بھی لینا پڑے گا۔''

''میں اس فلم میں کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا۔''

''پھر تو ہمیں روپیہ ملنا مشکل ہے......'' دادر کر نے کہا۔''

اور ماتھر نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: ''مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ناممکن۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' نرمل نے سوال کیا۔

''کہیں نہ کہیں سے روپیہ تو لینا ہی پڑے گا'' ماتھر نے کہا۔ ''اور فینانسر جو روپیہ لگائے گا وہ کچھ نہ کچھ تو شرطیں رکھے گا ہی۔''

اور نہ جانے کیا سوچتے ہوئے دُرگا نے آہستہ سے کہا جیسے وہ اپنے آپ سے بات کر رہی ہو۔ ''لیکن اِن شرطوں کا کوئی اثر 'نئی دھرتی، نیا آکاش' پر نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ فلم ایسے ہی بنے گی جیسے نرمل صاحب چاہتے ہیں۔''

اوروں کے سامنے دُرگا 'نرمل صاحب' کہتی تھی مگر جب وہ دونوں گھر جاتے ہوئے ٹرین میں سوار ہوئے۔ پہلے کمپنی اُنہیں فرسٹ کلاس کے پاس بنوا کر دیتی تھی مگر اب کئی دن سے وہ تھرڈ کلاس ہی میں آنے جانے لگے تھے۔ اور اس وقت رات کو تو بھیڑ کا وقت تھا۔ دونوں دروازے کے پاس کھڑے تھے۔

''درگا؟'' نرمل نے جھک کر اُس کے کان میں کہا۔

''کیا کہا؟'' درگا نے ریل کی دھڑ دھڑاہٹ کی وجہ سے اونچی آواز میں کہا۔

''درگا۔ برا تو نہ مانو گی؟''

''نہیں، کہو، میرا کام بہت خراب ہے نا؟''

''ہاں۔ درگا۔ تمھارا کام بہت—'' اس نے وقفہ لیا، پھر مسکرایا۔ پھر کہا۔ تمھارا کام بہت، بہت، بہت ہی اچھا ہے۔ مگر دنیا کو اس کو دیکھنے کا موقع نہ ملے گا۔''

''کیوں نہیں ملے گا؟''

''اس لیے کہ یہ فلم مکمل نہیں ہوگی!''

''بس تین مہینے میں ہمت ہار دی۔ یاد نہیں مہورت شاٹ کے لیے کیا ڈائیلاگ بولا گیا تھا۔''

''کیا بولا گیا تھا؟ مجھے تو اس وقت کچھ بھی یاد نہیں۔''

''ہمارے خواب ایک دن ضرور پورے ہوں گے۔''

اتنے میں دادر کا اسٹیشن آ گیا۔ درگا نے اُترتے اُترتے نرمل کے ہاتھ کو اپنے چھوٹے سے ہاتھ سے چھوا۔ کتنی نرمی، کتنی گرمی، کتنی دوستی، کتنا پیار، کتنا بھروسہ تھا اس لمس میں! پھر وہ اتر گئی اور

اسٹیشن کی بھیڑ میں غائب ہو گئی۔

ریل پھر چل دی۔ مگر نرل دیر تک اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہا جیسے اس پر دُرگا کے ہاتھ کی چھاپ اب تک موجود ہو!

(7)

دو دن کے بعد درگا نرل کے جھونپڑے نما کمرے میں آئی تو دیکھا وہاں پروڈیوسر بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے۔ ''نرل۔ اب اس بیکار فلم کی ڈائرکشن پروڈکشن کے چکر سے نکلو اور ہماری نئی کہانی لکھنے کا کنٹراکٹ کر لو۔''

''کر ہی لوں گا'' نرل نے جواب دیا۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر میری فلم نہ بن سکی۔''

''فلم کیوں نہیں بنے گی'' دُرگا نے آتے ہی اعلان کیا۔ ''ضرور بنے گی۔ اور پھر پروڈکشن منیجر سے مخاطب ہو کر جو ایک کونے میں روتی شکل بنائے بیٹھا تھا۔ ''ماتھر۔ تم اگلی شوٹنگ کا انتظام کرو۔''

پروڈیوسر جو ایک پنجابی نوجوان تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مسٹر نرل۔ سوچ لیجیے۔ میں دو دن اور آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔''

جب وہ چلا گیا تو نرل نے کہا۔ ''تم بڑی خوش نظر آ رہی ہو۔ کیا کہیں کوئی خزانہ مل گیا ہے یا بینک لوٹ کر آئی ہو؟''

''یہی سمجھو۔ روپے کا انتظام ہو گیا ہے۔ تم بجٹ بناؤ۔ کتنا چاہیے؟''

''جھونپڑوں کی شوٹنگ تو ہم نے کر لی، دُرگا۔ اب ہمیں اگلے سین لینے کے لیے دو ایک خاص سیٹ بنانے پڑیں گے۔ عالیشان بلڈنگوں میں شوٹنگ کرنی ہو گی۔ اسٹاف کی تنخواہیں بھی دینی ہوں گی۔ اس سب کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟ کم سے کم ڈیڑھ لاکھ روپیہ چاہیے، تب جا کر ہم اطمینان کے ساتھ جیسی فلم ہم چاہتے ہیں ویسی بنا سکتے ہیں۔''

''فلم ویسی ہی بنے گی۔ ڈیڑھ لاکھ کا انتظام ہو گیا ہے۔''

''کون دے گا۔''

'موہن چند بھائی۔''

''وہ کیوں دے گا؟ ضرور شرطیں لگوائے گا۔ گانے ڈلوائے گا۔ سین بدلوائے گا۔ کہے گا

کوئی باکس آفس اسٹار لو۔''

''نہیں نرمل۔ تمھیں کوئی شرط پوری کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بس ہنڈیاں سائن کرنی ہوں گی۔''

''وہ میں کردوں گا۔ وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' نرمل نے کہا مگر اس وقت اس نے اس پر غور نہ کیا کہ جب دُرگا نے کہا تھا۔ تمھیں کوئی شرطیں پوری کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔'' اور اس کے لہجے میں لفظ ''تمھیں'' پر ہلکا سا زور دیا گیا تھا۔

مون چند بھائی نے ہُنڈیاں سامنے رکھیں۔

''یہ اصل رقم کی ہیں۔''

نرمل نے دستخط کردیے۔

''یہ سود کی ہیں۔''

نرمل نے دستخط کردیے پھر کچھ اور ہنڈیاں سامنے آئیں۔ جن پر کوئی رقم درج نہیں تھی۔

''یہ کیا ہیں؟''

''وقت پر رقم واپس نہ ہوئی تو آگے جو سود لگے گا یہ اُس کی ہیں۔''

نرمل نے اس پر بھی دستخط کردیے۔

پھر سیٹھ نے ایک لمبا چوڑا کنٹرا یکٹ سامنے رکھا۔

''یہ کیا ہے؟''

یہ کچھ نہیں۔ جب تک ہمارے پیسے نہیں لوٹاؤ گے۔ نیگیٹو ہمارے نام گروی رہے گا؟''

نرمل نے پڑھے بغیر اس پر بھی دستخط کردیے۔

مون چند نے ڈیڑھ لاکھ کی رقم سامنے رکھ دی۔

''تھینک یو سیٹھ صاحب۔''

''مجھے سیٹھ نہ کہو۔ صرف مون چند بھائی کہو اور شکریہ ادا کرنا ہے تو دُرگا بہن کا کرو جنھوں نے اتنی اچھی فلم فینانس کرنے کا موقع ہم کو دیا۔ ہم تو سمجھے تھے ہمیں بھول ہی گئیں درگا بہن۔''

اور پھر موہن چند بھائی ہنڈیوں کو اپنے کالے تھیلے میں بھر کر چلا گیا اور نرمل اور درگا اکیلے رہ گئے۔

''دُرگا!''

''کہیے۔''

''پھر کہیے!''

''کہو۔''

''ان ہنڈیوں پر دستخط کرنے میں میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ یہ سیٹھ کوئی بے ایمانی تو نہیں کرے گا۔''

''نہیں۔ اگر موہن چند بھائی کو روپیہ وقت پر واپس مل گیا تو کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔''

''درگا۔ اگر تم نے بھاگ دوڑ کر کے روپیہ کا انتظام نہ کیا ہوتا تو میں تو ہمت ہار بیٹھا تھا۔ تم کتنی اچھی ہو!''

یہ کہہ کر اس نے درگا کو گلے سے لگا لیا۔ اس کو چوم لینے کو جی چاہ رہا تھا لیکن آج درگا کی طرف سے کچھ کھنچاؤ محسوس ہوا۔

''میں اچھی ہوں یا بری ہوں یہ تو وقت آنے پر معلوم ہوگا۔ درگا نے نرمی سے اپنے آپ کو نرمل کے بازوؤں سے آزاد کراتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو یاد رکھیے کہ اگر اچھی فلم بنانی ہے تو ڈائریکٹر۔ ایکٹر کو اپنی ہیروئین سے کسی قدر دور ہی رہنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ کھسیانی سی ہنسی ہنسی۔ نرمل نے بھی ہنس کر کہا'' کیا ہر تخلیق کے لیے برہمچاری رہنا ضروری ہے؟'' اور پھر وہ دونوں روپیہ لے کر بینک میں جمع کرانے اور ماتھر کو اطلاع دینے کہ شوٹنگ کا انتظام کرے، چل پڑے۔

اور اب دو مہینے بعد 'نئی دھرتی۔ نیا آکاش' کی شوٹنگ کا آخری دن آن پہنچا۔

یہ وہ سین تھا جب نوراں اپنے بھائی بہنوں کی خاطر اپنے آپ کو ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ ڈالتی ہے۔

نرمل نے میک اپ روم میں ڈائیلاگ ریہرسل کراتے ہوئے دُرگا سے پوچھا۔

''دُرگا۔ ہم میلوڈراما سے ہٹ کر ایک حقیقت پسند تصویر بنا رہے ہیں کہیں یہ سین غیر حقیقی تو نہیں سمجھا جائے گا؟ کیا کوئی لڑکی اپنے بھائی بہنوں کے لیے واقعی اپنی عصمت کو بیچ سکتی ہے؟''

کچھ دیر تک تو درگا اپنے آپ کو خاموشی سے آئینے میں دیکھتی رہی پھر بغیر مڑے جواب دیا کیونکہ آئینہ میں اس کا عکس نرمل ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، نرمل، عورت جس سے پیار کرتی ہے تو اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کچھ بھی۔''

اس سے پہلے کہ نرمل ان الفاظ کی اہمیت کے بارے میں کچھ سوچ سکے اسٹوڈیو سے بلاوا آ گیا کہ شاٹ تیار ہے۔ ڈائریکٹر اور ہیروئین کا انتظار ہے۔

اسٹوڈیو جاتے ہوئے نرمل نے کہا۔'' کیوں، دُرگا۔ آج ہماری تصویر مکمل ہو جائے گی۔ تمھیں کیسا لگ رہا ہے؟''

''سچ سچ بتا دوں؟''

''اگر تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو۔''

''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ لوگ تصویر کے بارے میں کیا کہیں گے؟ میرے کام کے بارے میں کیا کہیں گے؟''

''گھبراؤ مت دُرگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نے ہی تو کہا تھا ہمارے سپنے ضرور پورے ہوں گے۔''

اور پھر وہ اپنی تصویر کے آخری سین کی شوٹنگ کے لیے اسٹوڈیو کے دروازے میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔

(8)

نرمل کا خیال تھا کہ یہ دروازہ بند ہونے کے بعد کامیابی کے سب دروازے کھلتے جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔

فلم کی بیک گراؤنڈ میوزک ایک بین الاقوامی شہرت کے موسیقار نے دی تھی مگر فلم والے سب یہی کہتے تھے کہ ''اس میوزک ڈائریکٹر کا تو کبھی نام نہیں سنا ہم نے۔ کوئی ہٹ گانا بنایا ہے اس نے؟''

جب تصویر مکمل ہو گئی تو نرمل نے دس بارہ چوٹی کے ڈسٹری بیوٹر والے کو ٹرائل کے لیے بلایا۔ ساتھ میں کچھ اخبار والوں کو، اپنی کمپنی والوں کو، جس میں اب سون چند بھائی بھی شامل تھا۔

ٹرائل ختم ہوا تو اخبار والوں نے اور نرل کے ساتھیوں دوستوں نے تالیاں بجائیں لیکن جب روشنیاں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ زیادہ تر ڈسٹری بیوٹر تو پہلے ہی کھسک چکے تھے۔ چار باقی رہ گئے تھے۔

ایک نے نرل سے ہاتھ ملایا۔ ایسے جیسے کسی مُردے کا کریا کرم کرنے کے بعد اُس کے وارثوں کو تسلی دینے کے لیے ہاتھ ملایا جاتا ہے۔ خاموشی سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

دوسرے نے بھی یہی کیا۔ صرف ''تھینک یو مسٹر نرل'' کہا۔ پھر وہ بھی چلا گیا۔

تیسرے سے نرل نے خود پوچھا۔ ''کیوں سیٹھ جی۔ کیسی لگی پکچر؟''

اُس نے بڑے بھولے پن سے کہا: ''فلم پوری دیکھیں تو رائے دیں۔''

''مگر جو آپ نے دیکھی ہے یہی تو پوری فلم ہے۔''

''صرف دو گھنٹہ کی؟''

''جی ہاں۔ ایک گھنٹہ پچپن منٹ ہے۔''

''اور گانے۔ وہ ابھی نہیں لگائے نا؟''

''جی اس میں کوئی گانا نہیں ہے۔''

''ایک بھی نہیں!''

''جی نہیں۔''

اُس نے جلدی سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ ''یہ تو ایوارڈ پکچر ہے مسٹر نرل۔ میری بات یاد رکھیے گا۔ اسے ایوارڈ ضرور ملے گا۔'' پھر وہ بھی چلا گیا۔

اب صرف ایک ڈسٹری بیوٹر رہ گیا۔ جو برابر مڑ مڑ کر دُرگا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کہیے۔ سیٹھ صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟

''اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے۔''

نرل خوش ہوا کہ ایک کو تو اچھی لگی شاید یہ کسی علاقے کے لیے فلم ڈسٹری بیوشن کے لیے لے لے مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ سیٹھ صاحب فلم کی بات نہیں کر رہے تھے۔ اس کی ہیروئین کی بات کر رہے تھے۔

''چھوکری اچھی ہے۔ کتنے پیسے دیے آپ نے؟''

''جی! ہمارے سب کام کرنے والے تو ساجھے دار ہیں اس پکچر میں۔ ویسے اب تک مس درگا کو ہم نے تین ہزار روپے دیے ہیں۔''

''ہم دس ہزار دے گا۔ اپنے پارٹنر نے ایک پکچر شروع کی ہے۔ ''دلربا'' اُس میں اس کو فرسٹ کلاس ویمپ بنا دے گا۔ ویلین کے ساتھ جو سین ہے وہ اچھا کیا ہے۔''

نرل نے اسے ٹالنے کے لیے کہا: ''بہت اچھا۔ میں مس دُرگا سے کہہ دوں گا۔ وہ آپ کو فون کرلیں گی۔''

سب سے اخیر میں موہن چند بھائی کی باری تھی۔

نرل نے کہا: ''کہیے موہن چند بھائی۔ آپ کو کیسی لگی؟''

''ہم کو کیا سمجھ ہے، نرل صاحب۔ آپ نے تو آرٹ اور فلاسفی بھر دی ہے۔ ہم بنیے ہیں بنیے۔ ہم کو تو یہ بتاؤ ہماری رقم کب ملے گی؟''

''جیسے ہی کوئی بزنس ہوا۔ ساری رقم پہلے آپ کے گھر ہی آئے گی۔''

''اچھا تو نمستے نرل صاحب۔ نمستے دُرگا بہن!'' اور موہن چند بھائی کن انکھیوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے چلے گئے۔

سب اخباروں میں لمبے لمبے آرٹیکل چھپے کہ ''نئی دھرتی۔ نیا آکاش' ہندوستانی فلم سازی میں ایک انقلاب لے آئی ہے۔ اس کا مقابلہ غیر ملکی آرٹ فلموں سے کیا گیا۔

مگر بار بار ٹرائل رکھنے پر بھی کوئی ڈسٹری بیوٹر فلم کو لینے پر راضی نہ ہوا۔

کئی فلم دلالوں نے رائے دی کہ اس میں چار گانے اور ہیلن کا ڈانس ڈال دیجیے پھر ہم بزنس کرا دیں گے۔

ایک ڈسٹری بیوٹر نے کہا: ''یہ آرٹ فلم ہے، ایوارڈ فلم ہے۔ میں ایسی کتنی ہی فلمیں چلا چکا ہوں۔ آپ مجھے دے دیجیے تو میں اسے مارننگ شو میں چلاؤں گا۔ آرٹ فلم لوگ صبح سویرے ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔''

نرمل نے پوچھا: ''کتنا ایڈوانس دے سکیں گے آپ؟ ہم کو تین لاکھ مون چند بھائی کو لوٹانا ہے۔''

ڈسٹری بیوٹر نے کہا: ہم تو بس کمیشن پر چلا دیں گے۔ پبلسٹی کا خرچہ نکال کر صرف پچیس فی صدی کمیشن لیں گے۔ باقی جو آئے آپ کا۔

''مگر ایڈوانس......؟''

''آرٹ فلموں کو ہم ایڈوانس نہیں دے سکتے۔ آپ تو بس پرنٹ بنوا کر ہمیں دے دیجیے، باقی سب ہم دیکھ لیں گے۔''

نرمل نے مون چند بھائی سے بات کی۔ اس نے ڈسٹری بیوٹر کو گالی دے کے کہا: ''اُس سالے کا کیا اعتبار؟ ہم تو بس آپ کو جانتے ہیں۔ ہمارا چکتا کر دیجیے پھر ہماری طرف سے آپ پکچر چلانے کے لیے چور کو دے دیجیے۔ بات ختم ہو گئی۔''

نرمل کو ایسا لگ رہا تھا کہ بات ہر طرف سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دروازے بند ہوتے جا رہے ہیں۔

اسٹاف کے لوگوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ کوئی آتا تھا تو پیسے مانگنے۔

جس دن ایوارڈ کے لیے فلم دہلی بھیجنی تھی۔ اس دن کوئی ایسا بھی نہیں تھا جو اسٹیشن پر جا کر بلٹی کرا آتا۔ نرمل کو خود جا کر کیو "Q" میں کھڑا ہونا پڑا۔

دُرگا نے بھی آنا جانا کم کر دیا تھا۔ وہ اب پھر لائبریرین کے ڈپلوما کے لیے پڑھ رہی تھی۔ اگلے مہینے اس کا امتحان تھا۔

نرمل اکثر سوچتا کہ اندھیرے میں سایہ بھی انسان سے جدا ہوتا ہے۔

مالی مشکلات سے تنگ آ کر ایک دن نرمل نے فیصلہ کیا کہ اُس پروڈیوسر کے ہاں چلا جائے جو گھر آ کر کنٹرا یکٹ آفر کر رہا تھا۔

جب پروڈیوسر کے ہاں پہنچا تو اس نے بڑی آؤ بھگت کی۔ ''آیئے آیئے نرمل جی۔ آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔'' پھر اپنے اسسٹنٹ کو چلا کر۔ ''ارے بھائی نرمل جی کے لیے چائے لاؤ۔ پیسٹری بھی لانا۔''

نرمل سمجھا اب کام بن گیا۔

مگر پروڈیوسر اپنی پکچر کی بجائے نرمل کی پکچر کی بات کر رہا تھا۔ نرمل جی بڑی تعریف سن رہے ہیں آپ کی پکچر کی۔ اب کے ٹرائل ہو تو ہمیں ضرور بتایئے گا۔

نرمل نے کہا فلم کا ایک ہی پرنٹ بنا ہے اور وہ دہلی گیا ہوا ہے ایوارڈ کے لیے۔

''ایوارڈ تو سمجھیے آپ کی جیب میں ہے نرمل جی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ناول کو فلمانے کی ہمت آپ ہی کر سکتے تھے۔ سبجیکٹ کے ساتھ کوئی انصاف کر سکتا ہے تو رائٹر ہی کر سکتا ہے!''

آخر کار نرمل نے ہمت کر کے بات چھیڑ ہی دی۔ ''وہ آپ اُس دن آئے تھے نا کہانی کے بارے میں بات کرنے؟''

''کب؟'' پرڈیوسر نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ ''اوہ۔ اب یاد آیا چھ سات مہینے ہو گئے اُس بات کو تو۔ اس عرصے میں ہم نے تو دو رائٹروں سے کنٹرا یکٹ کر لیا ہے۔ ایک پکچر تو آدھی ہو گئی۔ آئندہ ضرورت ہوئی تو ضرور آپ کو تکلیف دیں گے۔''

''اچھا تو پھر میں چلا نمستے۔''

''نمستے نرمل جی۔ کبھی کبھی آتے رہیے۔''

اُس رات کو ادھر اُدھر ہوتا ہوا نرمل تھکا ہارا گھر پہنچا تو دیکھا دروازہ کھلا ہے اور اندر روشنی ہو رہی ہے۔

اُس کو معلوم تھا کہ ایک چابی درگا کے پاس ہے۔ مگر دُرگا کو کہاں فرصت ہے آج کل اُس سے ملنے آنے کی؟

''کاش درگا ہی ہو!'' اس کے دل نے کہا۔

''بھاڑ میں جائے درگا!'' اس کے دماغ نے کہا۔

اندر گیا تو دیکھا دُرگا ہی ہے۔ اُس کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نرمل۔ تم نے ریڈیو سنا؟''

''تم جانتی ہو کہ میں ریڈیو نہیں سنتا۔ میرا ریڈیو کب کا بک چکا ہے۔''

''نرمل ہمیں ایوارڈ ملا ہے!'' دُرگا چلائی۔

''کیا ملا ہے؟'' نرل نے پوچھا۔
ایوارڈ۔ گولڈ میڈل۔''
''پھر کہو کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔''
''نئی دھرتی نیا آکاش کو پریسیڈنٹ گولڈ میڈل ملا ہے۔''
''دیکھو درگا مذاق مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں۔''
''کیا میں تمھیں دُکھ دینا چاہتی ہوں، نرل میں سچ کہہ رہی ہوں تمھاری فلم کو۔ ہماری فلم کو۔ ملک کا سب سے اونچا فلمی اعزاز ملا ہے۔ اور مجھے۔ تمھاری ہیروئین کو بہترین ایکٹنگ کے لیے آروشی ایوارڈ۔''
اب جا کر نرل کو یقین آیا۔
''نرل!'' وہ چلائی اور دوڑ کر نرل کو لپٹ گئی۔ نرل نے اُسے بانہوں میں لپیٹ کر اونچا اُٹھا لیا۔ اُس کے منہ کو چوم لیا۔
نرل کے شانے پر سر رکھ کر وہ رونے لگی۔ ''نرل میں نے کہا نہیں کہا تھا کہ تمھارے سپنے ایک دن ضرور سچے ہوں گے۔''
''تمھارے سپنے؟'' نرل نے اس کو آہستہ سے زمین پر اُتارتے ہوئے تعجب سے دہرایا۔
''ہمارے سپنے کہو؟ دُرگا!''
اور درگا نے کہا۔ ''تمھارے سپنے ہی میرے سپنے ہیں، نرل۔ چلو اب مٹھائی کھلاؤ۔ یا کم سے کم ایک پیالی چائے پلواؤ۔''

(9)

اب مرنے والے نے اپنی موت کا اسٹیج سجا لیا تھا۔
دو چار منٹ کی دیر ہے۔ پھر سب جل کر خاک ہو جائے گا۔ نرل۔ اُس کے سپنے۔ اس کی فلم کا نیگیٹیو نئی دھرتی نیا آکاش۔ (میرے بعد میری نشانی بھی کیوں رہے؟ اس کے سوتے ہوئے دماغ نے سوچا)
سو اُس نے تیرہ ڈبّوں میں سے فلم کے فیتے کو (جو تیرہ ناگوں کی طرح کنڈلی مار رہا تھا)

نکال کر ڈھیر لگایا تھا۔ اُس پر جتنی کتابیں اور اخبار باقی رہ گئے تھے وہ رکھ دیے تھے۔ ان پر مٹی کا تیل چھڑک دیا تھا ایک دیا سلائی گھسنے کی دیر تھی اور دھرتی آکاش — زندگی اور موت — سب ایک ہو جائے گا۔

مگر اس فلم کو جلانے کا مجھے کیا ادھیکار ہے (سلیپنگ پلز کے نشے سے دھندلے ہوتے ہوئے دماغ نے سوچا) یہ فلم دُرگا کا بھی تو ہے۔ کونسی درگا کا؟ — میری درگا؟ مگر وہ تو کب کی مر چکی ہے۔ وہ ننھی منّی چھوٹی سی لڑکی جس کو میں نے فلم فارم کے شو میں بیٹھا دیکھا تھا۔ اور یہ دُرگا جس نے مون چند بھائی سے چھ فلموں کا کنٹراکٹ کیا ہے یہ تو ایک فرسٹ کلاس ویمپ ہے بے وفائی کی ملکہ۔ وشواس گھات کی دیوی۔

وہ دن آج بھی — اس حالت میں بھی — جب اس کے قدم موت کے کنارے لڑکھڑا رہے تھے — اُسے یاد تھا جب درگا نے خود آ کر اُسے بتایا تھا کہ اس نے مون چند بھائی کی کمپنی میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

''تم جانتی ہو مون چند بھائی کون ہے؟ کیوں اس نے فلم کمپنی بنائی ہے؟

''جانتی ہوں۔''

''یہ بھی جانتی ہوں کہ اُس نے وہ پچیس ہزار روپے جو مجھے گورنمنٹ سے انعام کے ملے تھے اپنے قرضے میں وصول کر لیے ہیں؟ اور اب وہ میرے فلم کے نیگیٹو پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔''

''جانتی ہوں۔ وہ اُس کا قانونی حق ہے۔''

''قانونی حق سب کچھ ہے۔ اخلاقی حق کچھ نہیں۔ جذباتی حق کچھ نہیں؟''

دُرگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف سر جھکا لیا۔ نرمل نے سوال و جواب جاری رکھا۔

''اس قسم کے آدمی سے رشتہ جوڑنے کا مطلب سمجھتی ہو درگا؟''

''سمجھتی ہوں۔''

''پھر بھی تم یہ قدم اٹھا رہی ہو؟''

''ہاں۔'' مگر اس ہاں میں مایوسی تھی، مجبوری تھی، کوئی فخریہ اعلان نہیں تھا۔

''وجہ؟''

''کئی وجہیں ہو سکتی ہیں جو تمھیں بتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سمجھ لو میں غربت کی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ کامیابی چاہتی ہوں۔ آرام کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔''

اب نرمل نے وہ سوال کر ہی دیا جو اس کی زبان کی نوک پر کب سے لرز رہا تھا۔

''تو تم میں اور فورس روڈ کی رنڈی میں کیا فرق ہے؟''

دُرگا نے نرمل کی طرف دیکھا اور بولی: ''کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ بھی حالات سے مجبور ہے۔ میں بھی مجبور ہوں۔''

نرمل زخم کو اپنے زہریلے نشتر سے کریدتا رہا۔

''اب معلوم ہوا کہ اتنی آسانی سے تم کیسے اس فلم کے لیے مون چند بھائی سے فینانس لے آئی تھیں؟— تمھارا اور اس کا رشتہ پرانا معلوم ہوتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' درگا نے جواب دیا۔

''بدچلن— آوارہ— ایک تو چوری اُس پر سینہ زوری۔'' نرمل پاگلوں کی طرح چلّایا۔ ''تو یہ لے۔''

اور اُس نے ایک زناٹے دار ہاتھ درگا کے گال پر مارا جس کی آواز دُرگا کے جانے کے بعد بھی اس کے کمرے میں— اس کے دماغ میں گونجتی رہی۔

اور اتنے دنوں کے بعد آج بھی گونج رہی تھی۔

آج جب سارے پڑوسیوں کے سامنے مول چند بھائی اس کی قرقی لے کر آیا۔

اُس کو بے عزت کر کے اُس کے گھر کا سامان اُٹھا کر لے گیا۔

اُس کو عدالت سے دیوالیہ قرار دلوایا۔

اب وہ جو کچھ کمائے گا وہ مون چند بھائی کو دینا پڑے گا۔ (اور یہ خیال اُسی دم اُس کے دماغ میں آیا) اُس روپے میں سے مون چند بھائی درگا کی قیمت جو مقرر ہوئی ہے اس کی قسطیں ادا کرے گا۔

اور پھر وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

میں مر جاؤں گا تو مون چند بھائی کس سے روپیہ وصول کرے گا؟ قرض دار کو سزا دی

جا سکتی ہے۔ دیوالیہ سے روپیہ وصول کیا جا سکتا ہے۔ مگر مُردے سے روپیہ وصول کرنے یا مردے کو سزا دینے کا کوئی طریقہ سپریم کورٹ کو بھی نہیں معلوم تھا!

نیگیٹیو جب جل جائے گا تو نہ صرف اس کی نشانی مٹ جائے گی بلکہ دُرگا کی بھی۔ دُنیا دُرگا کا آرٹ کیوں دیکھے جب اُس نے خود اُس آرٹ کو بازار میں بیچ ڈالا ہے؟

یہ سوچ کر وہ اور زور زور سے ہنسا۔

پھر اُس نے اپنی جھلنگا چار پائی کو فلم اور کاغذوں کے انبار کے اوپر رکھ دیا۔

دیا سلائی جلانے والا ہی تھا کہ اُسے وہ فلم کے خالی ڈبوں کا قطب مینار نظر آیا۔

یہ خالی ڈبے کیوں جلیں؟ انہوں نے کیا قصور کیا ہے؟

یہ خالی ڈبے بازار میں آٹھ آٹھ آنے کے بکتے ہیں کسی غریب کے کام آ سکتے ہیں۔

سو اس نے ڈبوں کو اُٹھا اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکنا شروع کیا۔ اور اس وقت اُسے یہ خیال آیا کہ فلم کو ڈبوں سے نکال کر باہر پھینکنا تاکہ وہ نہ جلیں ایسا ہی ہے جیسے مرتے ہوئے آدمی کے کپڑے اتار لیے جائیں تاکہ اس کے مرنے کے بعد وہ کسی زندہ آدمی کے کام آ سکیں۔

پھر وہ چار پائی پر لیٹ گیا۔ بڑی نیند آ رہی ہے۔ لیٹنے میں کتنا آرام ہے۔ سوچنا نہیں چاہیے۔ سو جانا چاہیے۔ سو جانا چاہیے۔ مگر سونے سے پہلے اُسے کوئی کام کرنا تھا۔ کیا کام کرنا تھا؟ کوئی بہت ضروری کام تھا! ہاتھ چار پائی سے نیچے لٹکا تو دیا سلائی کی ڈبیہ بجی۔ اب اس کے سوئے ہوئے دماغ کو یاد آیا کہ اُسے سونے سے پہلے کاغذوں اور فلم کے فیتے کے انبار کو جو اس کی چار پائی کے نیچے پڑا تھا آگ لگانی تھی۔ اپنی جاگتی ہوئی زندگی کی آخری کوشش سے اس نے دیا سلائی جلائی اور کاغذوں میں آگ لگا دی۔ پھر آرام سے چار پائی پر سو گیا۔۔ ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

(10)

مگر اس کی موت جلنے سے نہیں ہوئی۔ زیادہ سلیپنگ پلز کھانے سے اور دھوئیں سے گھٹ کر ہوئی۔ مٹی کے تیل میں پانی کی ملاوٹ تھی۔ اخباروں میں آگ لگی مگر شعلے نہیں بھڑکے۔

نرمل یہ بھول گیا تھا کہ فلم کا فیتہ اب نائٹریٹ کا نہیں، ایسے مسالے کا بنتا ہے جو فوراً آگ

نہیں پکڑتا۔ فلم جھلس گیا مگر اس کے شعلے نرمل تک نہیں پہنچے۔ ہاں سیلولائڈ کا زہریلا دھواں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا ہوا نرمل کے بے ہوش جسم میں داخل ہوتا رہا اور دھیرے دھیرے بڑے پیار سے اس کا گلا گھونٹتا رہا۔

نرمل کا کریا کرم بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

سارے لوگوں نے ــــ مشہور فلم اسٹار، بڑے اور کامیاب ڈائریکٹر، پروڈیوسر، رائٹر ــــ جن کو 'فلم انڈسٹری' کہا جاتا ہے، اُس کی ارتھی میں شرکت کی۔

شمشان بھومی میں اس کی یاد میں تقریریں کی گئیں۔ اس کو ہندوستانی فلم انڈسٹری کا انقلابی ڈائریکٹر بتایا گیا جس نے اپنی پہلی فلم بنا کر ہی اپنا لوہا منوالیا تھا۔ ''ہمیں آج نرمل مرحوم کے کارنامے پر ناز ہے۔'' ایک پروڈیوسر نے کہا۔ ''وہ مرکر بھی زندہ رہنے کا بھید بتا گئے ہیں۔'' تقریر ان کو ایک ڈائیلاگ رائٹر نے لکھ کر دی تھی۔

ایک تقریر مون چند بھائی کی بھی ہوئی۔ انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''ہمیں اس بات پر ناز ہے کہ سورگ باشی نرمل پر جب کڑا وقت پڑا تھا اور ان کی مہان فلم نئی دھرتی، نیا آکاش' ادھوری پڑی تھی تو ہم نے آگے آگے آکر ان کو فینانس کیا اور ان کی فلم ختم کرنے میں اُن کی سہایتا کی۔''

ایسی ہی تقریریں ہوتی رہیں اور چتا کے شعلے لپک کر آکاش کی طرف جانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ مگر کالے کالے دھوئیں کے بادل نہ صرف اُس شمشان پر بلکہ ساری دھرتی اور سارے آکاش پر چھا گئے۔

اور ایک کونے میں پلّو سے سر ڈھانکے درگا کھڑی رہی۔ وہ کچھ سن نہیں رہی تھی۔ وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھی۔ وہ صرف یاد کر رہی تھی اس دن کو جب فلم فورم کے شو میں اندھیرے سے روشنی ہوئی تھی اور اس نے اس لمبے قد کے نوجوان کو پہلی بار دیکھا تھا جو اس کے جیون میں اجالا کر کے خود اندھیرے کی گود میں سو گیا تھا! اس کے بٹوے میں ایک لائبریری کے سکریٹری کے نام خط تھا جو آج ہی اس نے لکھا تھا اور جس میں اس نے کہا تھا کہ میں آپ کے ہاں ڈھائی سو روپے ماہوار پر اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے کام کرنے کو تیار ہوں۔

اور اُسی وقت جب یہ سب ہو رہا تھا بھیکو اپنا کھٹارا لے کر گرلا روڈ اندھیری سے گزر رہا تھا جہاں وہ تیرہ خالی ڈبے پڑے تھے۔ ارتھی اٹھنے کے ہنگامے میں کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

اب بھیکو کھٹارے کو دھکیلتا ہوا کالینہ کی طرف جا رہا تھا کہ ایک جھونپڑ پٹی کے پاس اس نے ایک چھوٹا سا گڈیلنا جس سے بچوں کو چلنا سکھاتے ہیں پڑا دیکھا۔ اس نے سوچا کہ یہ گڈیلنا ہمارے منّو کے کام آئے گا۔ اب اس کے گڈلیاں چلنے کی عمر ہو گئی ہے۔ کیوں نہ اس کو بھی ڈال لوں۔

اس نے ادھر اُدھر نگاہ کی تو صرف ایک بھکاری جو شاید پگلا تھا کھڑا نظر آیا۔ اس کی نگاہیں بھی اس گڈیلنے پر تھیں۔

''کیوں بھائی یہ گڈیلنا بیکار ہے تو میں لے لوں۔''

بھکاری نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔ ''بیکار ہے۔ مگر ذرا سوچو کہ کیوں بیکار ہے؟'' اور پھر وہ خوفناک طریقے سے قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔

بھیکو نے گڈیلنے کو جلدی سے ٹب میں ڈال لیا اور اس پگلے بھکاری کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کھٹارے کو دھکیلتا رہا، جو اب اتنا بوجھل لگ رہا تھا جیسے دنیا بھر کے پاپ اس میں لدے ہوں۔

○

ایک بچے کے گڈیلنے کی کہانی!

(1)

ایک گڈیلنا۔

دو گڈیلنے۔

تین گڈیلنے۔

چار۔ پانچ۔ چھ سات گڈیلنے۔ گڈیلنوں کی لمبی قطار یہاں سے وہاں تک لگی رہتی تھی۔
سستے گڈیلنے۔ مہنگے گڈیلنے۔ سادہ گڈیلنے۔ خراد کے کام کے رنگین گڈیلنے۔

رحمت بخش بڑھئی لکڑی کے کام کا ماہر تھا۔ پالم پور میں اُس کے نام کو سب جانتے تھے۔
خراد کا اتنا بڑھیا کام کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ پلنگوں کے پائے، کرسیوں میزوں کی ٹانگیں، لال سبز رنگ چڑھائے ہوئے منقش پیڑھے اور گڈیلنے، سب سے زیادہ مزا اس کو گڈیلنے بنانے میں آتا تھا۔ وہ مدتوں کنوارا، پھر ایک جوان لڑکی سے شادی کے بعد بھی بے اولاد رہا تھا؟ اس کے دل میں اپنا بچہ ہونے کی بڑی خواہش تھی۔

بیوی سے اکثر کہتا۔ ''اری نیک بخت۔ بس ایک بچہ دے دے تاکہ میں تجھے منّا کی ماں کہہ کر پکار سکوں۔''

سال گذرتے گئے مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ وہ اپنی اس خواہش اس آرزو کو دوسرے بچوں کے لیے گڈیلنے بنانے میں ڈھالتا رہا۔خراد کے کام کے خوب صورت گڈیلنے۔ رنگین گڈیلنے۔گھونگرو لٹکے ہوئے گڈیلنے۔سارے پالم پور کے بچے چاچا رحمت بخش کے گڈیلنوں پر چلنا سیکھتے۔پالم پور ہی میں کیوں گجرات بھر میں رحمت بخش کے ہاتھ کے بنے ہوئے لکڑی کے سامان کی— خاص کر گڈیلنوں کی شہرت تھی۔ راجکوٹ، بڑودہ، سورت تک کے دوکاندار آتے اور اُس سے گڈیلنے بنوا کر لے جاتے۔ ہزاروں بچے رحمت بخش کے گڈیلنوں کو پکڑ کر اپنے ننھے ننھے قدموں سے چلنا سیکھ رہے تھے۔کیا اُس کو کبھی اپنے بچے کو آنگن میں گڈیلنا چلاتے ہوئے دیکھنا نصیب نہیں ہوگا؟ آخر کار اس کی اور اس کی بیوی کی منتیں مرادیں، دعائیں، تعویذ اور گنڈے کام آئے اور خدا نے ایک جیتا جاگتا ہنستا کھیلتا بچہ اُن کی جھولی میں ڈال دیا۔

''مانگ کیا مانگتی ہے؟'' اس نے اپنی بیوی سے خوش ہو کر کہا جیسے وہ ایک شہنشاہ ہو—اور دنیا کی سب نعمتیں اُس کے ہاتھ میں ہوں۔''تو نے ہمیں خوش کیا ہے ہم تجھے خوش کریں گے۔''

''جو میں کہتی ہوں وہ کرو گے؟''

''ہاں ہاں۔تو ایک دفعہ مانگ تو کیا مانگتی ہے؟'' رحمت بخش نے ننھے سے لال لال بوٹی سے بچے کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو بمبئی چلو۔'' کریمن نے لیٹے لیٹے کہا اور اپنے ہاتھ سے بچے کو تھپک کر سلاتی رہی۔

''بمبئی۔اری۔بمبئی میں کیا کرے گی؟''

''بمبئی میں بس ہم رہیں گے۔''

''رہتے تو ہم یہاں بھی ہیں، نیک بخت۔پھر وہاں ایسی کون سی نئی بات ہوگی۔

''تم تو سمجھتے ہی نہیں ہو۔اس گاؤں میں ہم پڑے ہیں۔ بھلا ہے کیا یہاں؟''

''پالم پور کو تو گاؤں کہتی ہے۔''

''ہاں۔اور کیا۔بمبئی کے مقابلے میں تو گاؤں ہی ہے۔ میں نے سنا ہے وہاں بجلی کی ریلیں چلتی ہیں۔بجلی کی روشنی سے سارا شہر جگ مگ کرتا ہے۔ بڑی بڑی دکانیں ہیں، بڑی بڑی بلڈنگیں ہیں، بڑے بڑے ہوٹل ہیں، سنیما ہیں۔وہاں سب کچھ ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں۔''

بوڑھے شوہر کو نو جوان بیوی کی بات ٹالنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً اگر وہ اُس کے بچے کی ماں بھی ہو۔ آخر کار ایک دن اپنا بنایا ہوا سب سامان بیچ کر گھر میں تالا ڈال کر ایک بوری میں اپنے بڑھئی کے سب سامان رکھ کر دو ٹین کے ٹرنک اور ایک موٹا تازہ بستر لے کر رحمت بخش ان کی بیوی کریمن اور اُن کی گود کا بچہ (جس کا نام انھوں نے الٰہی بخش رکھا تھا۔ کیونکہ اللہ نے ہی تو اُسے بخشا تھا۔ مگر جسے پیار سے وہ دونوں ببوا کہتے تھے) بمبئی کی ریل میں بیٹھ گئے۔

ریل میں ہی ان کے گجرات کا ہی ایک نو جوان مل گیا جو برسوں سے بمبئی میں رہتا تھا۔ نام تھا سکندر خاں۔ وہ بمبئی میں نہ جانے کیا کرتا تھا۔ سکندر اچھا خاصا ہی کماتا ہوگا کیوں کہ بدن پر سلک کی قمیص۔ ٹیری لین کی پتلون، اس کے بالوں میں تیل۔ پیروں میں بڑھیا چپل۔ ناک کے نیچے تلوار کٹ مونچھیں تھیں۔ اس سے رحمت بخش نے کہا ہم بمبئی جا رہے ہیں۔

وہ کہنے لگا۔ ''چاچا۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرنا۔ سکندر خاں تمھاری دیکھ بھال کرنے کو ہے۔''
پھر کریمن کی طرف ایک پھسلتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ ''یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟ تمھاری بیٹی ہے کیا؟''

رحمت بخش نے اس بات کا برا نہیں مانا۔ بوڑھے شوہر اور جوان بیوی کے بارے میں ایسی غلط فہمی اکثر ہو جاتی ہے۔ ''نہیں رے۔ یہ تو میری بیوی ہے اور اس کی گود میں ہمارا بچہ ہے۔''
بچے کو دیکھتے ہی سکندر نے بانہیں پھیلا دیں۔ ''آجا منے۔ میرے پاس آئے گا۔''
کریمن نے کہا، بظاہر اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر۔ ''اجی او۔ اِن کو بتایا نہیں کہ بچے کا نام منا نہیں ببوا ہے۔''

''ببوا۔ ببوا۔ آ بیٹا۔ اپنے چاچا سکندر کے پاس آجا۔'' بچہ ہمک کر سکندر کی گود میں چلا گیا۔ سکندر بچے کو بہلاتا رہا۔ دیکھ بیٹا ببوا۔ ہم تجھے بمبئی کی سیر کرائیں گے۔ وکٹوریہ گاڑی میں بٹھائیں گے۔ ٹیکسی میں بٹھائیں گے۔ ٹیکسی کیسے چلتی ہے —پوں—پوں—پوں— اور تجھے سنیما دکھائیں گے دلیپ کمار۔ راج کپور۔ دیو آنند، وجینتی مالا۔ مینا کماری۔ سب سے ملائیں گے اور تجھے بڑے بڑے ہوٹلوں میں لے چلیں گے۔ ہاں تو چلے گا نا ہمارے ساتھ۔
رحمت بخش تو چلتی ہوئی ریل کی کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ کریمن اس کی یہ سب باتیں سنتی

جا رہی تھی اور اُس کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھٹی جا رہی تھیں۔

سکندر سے کچھ کہنے کے لیے کریمن نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ ''لاؤ بوا کو ادھر لاؤ۔ خواہ مخواہ بچے کو جھوٹی سچی باتیں کہہ کر مت بہلاؤ۔'' سکندر نے بچے کو واپس ماں کی گود میں دے دیا اور اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے پر کریمن کے تن بدن میں جھرجھری آ گئی۔

رات کو احمد آباد پر ریل بدل گئی۔ بھیڑ بھاڑ دھکم دھکا میں بیچارہ رحمت بخش تو بوکھلا گیا۔ بیوی کو سنبھالتا کہ بچے کو کہ اپنے سامان کو۔ مگر خدا بھلا کرے سکندر خاں کا، اُن کو صحیح سلامت ڈبے میں بٹھا دیا۔ خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو، چاچا مجھ سے کہنا'' سکندر نے کہا۔ اور پھر صراحی اور لوٹے میں پانی بھر کر لایا اور ساتھ میں ایک دونے میں مٹھائی بھی لے آیا۔ درجے میں گھسا ہی تھا کہ ریل چل پڑی۔

''ہم نے تو مٹھائی نہیں منگائی تھی۔'' کریمن نے بڑے نخرے سے شکایت کی۔

''بھائی یہ تو بوا سے آج پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ اُس کی خوشی میں مٹھائی ہے۔''

اب تو ضروری ہو گیا کہ رحمت بخش اور کریمن بھی اپنا کھانا نکالیں تو اُس میں سے دو گھی کی روٹیاں، قیمہ، اچار سکندر خاں کو بھی دیں۔

''کیوں تکلیف کرتے ہیں، چاچا۔'' سکندر نے کھانا لیتے ہوئے کہا۔ ''کہیں آپ کو کھانا کم نہ ہو جائے۔''

''نہیں نہیں بیٹا۔ اللہ کا دیا بہت ہے۔ تو نے اتنی محنت کی ہے ہماری خاطر، ہم تجھے دو روٹیاں بھی نہیں کھلا سکتے۔''

تینوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

رحمت بخش نے پوچھا۔ ''کیوں سکندر۔ بمبئی میں کہاں رہتے ہو؟''

اس نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ ''چاچا میں تو کالینہ کے پاس ایک جھونپڑپٹی ہے اس میں رہتا ہوں۔''

''بیوی بچے تو ہوں گے؟'' کریمن نے سوال کیا۔

''نہیں چاچی۔ ایسی قسمت کہاں اپنی۔''

''کمال ہے بھائی۔'' رحمت بخش نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔'' اتنے بڑے ہوگئے اور تمھارے ماں باپ نے اب تک تمھاری شادی نہیں کی۔''

سکندر نے لمبی ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔'' ماں باپ تو اللہ کو پیارے ہوگئے، چاچا۔ سر پر ہے کون جسے اپنا کہہ سکوں یا جو میری فکر کر سکے۔''

''فکر نہ کرتو'' رحمت بخش نے اسے دلاسا دلایا۔'' ہم بمبئی میں ایک بار رہ پڑیں پھر کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر تیری بات کرتے ہیں۔''

سکندر خاں نے نظروں ہی نظروں میں اپنے چاچا کا شکریہ ادا کیا۔

اب کھانا ختم ہوگیا تھا۔ سکندر نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا۔'' چاچا۔ میں سوچتا ہوں اوپر کی سیٹ پر سے سامان اتار کر وہاں آپ کا بستر لگا دوں چاہے آپ سو جائیں یا چاچی۔''

کریمن نے جلدی سے کہا:'' بستر تو لگا دو مہربانی ہوگی۔ مگر میں بچے کو لے کر کہاں اوپر چڑھوں گی۔ رات کو چار بار تو پیشاب کرتا ہے۔''

''اچھا تو میں ہی اوپر سو جاؤں گا۔'' اور پھر رحمت بخش اوپر کی سیٹ پر چڑھ گیا اور وہاں سے سکندر کو آواز دی۔'' بیٹا سامان کا اور اپنی چاچی کا خیال رکھنا۔''

پھر رحمت بخش بستر ے پر لیٹ گیا۔ کئی دن کا تھکا ہوا تھا جلد ہی سو گیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو بمبئی کا اسٹیشن آگیا تھا۔ سب مسافر اپنا اپنا سامان اتار رہے تھے۔

''سکندر ارے سکندر۔ یہ بمبئی ہے کیا؟''

سکندر کی آواز تو نہیں آئی۔ جواب میں ایک قلی نے کہا۔'' ہاں بمبئی سنٹرل ہے۔ آگے گاڑی نہیں جائے گی۔ کوئی سامان وامان ہے؟''

''سامان تو بہت ہے۔ اے سکندر! ارے کریمن! اٹھو بھئی۔''

آواز دیتے ہوئے وہ نیچے اترا، دیکھا کہ درجہ تقریباً خالی ہوگیا ہے۔ نہ سکندر ہے، نہ کریمن کا کوئی پتہ ہے، نہ دو ٹین کے ٹرنک ہیں نہ اوزاروں کی بوری ہے۔ صرف پٹرے پر ایک گدڑی میں لپٹا ہوا بچہ رو رہا ہے!

(2)

بچّے کو گود میں لیے ہوئے حیران پریشان، رحمت بخش پیدل جوتیاں گھستا ہوا، بمبئی کی موٹروں بسوں ٹرکوں سے بچتا بچاتا کالینہ کے پاس کی جھونپڑ پٹی میں پہنچ تو گیا۔ ایک ایک جھونپڑی میں پوچھا لیکن یہاں کسی نے کسی سکندر خاں کا نام ہی آج تک نہیں سنا تھا۔

بھوکا بچّہ روئے جارہا تھا۔

ایک عورت نے رحم کھا کر پوچھا۔ پہلے مرہٹی میں۔ جب رحمت بخش نہیں سمجھا تو بمبئی کی ہندی میں۔ ''بابا یہ بچّہ کیوں روتا ہے۔ اس کی آئی— اس کی ماں— کہاں ہے؟''

رحمت بخش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر اس نے کچھ سوچ کر اور جی کڑا کر کے کہہ دیا۔

''بیٹی۔ اس کی ماں مرگئی ہے۔ سویرے سے دودھ کے لیے بلک رہا ہے۔''

''لاؤ۔ مجھے دو۔ میں دودھ پلاتی ہوں۔''

رحمت بخش نے دیکھا کہ اندر کپڑے کی جھولی نما پالنے میں ایک ننھا سا بچہ جھول رہا ہے۔

اُس عورت نے اپنی چولی کی گرہ کھولی اور بچّے کے منہ میں چھاتی دے دی رحمت بخش نے منہ پھیر لیا اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر خاموشی سے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بے رحم شہر میں بھی انسانیت مر نہیں گئی تھی۔

سو رحمت بخش اُسی جھونپڑ پٹی میں ایک جھونپڑی لے کر رہنے لگا۔

پڑوسیوں کی مدد اور مہربانی سے کچھ اوزار بھی حاصل ہو گئے مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ بمبئی میں سوراشٹرا کے ایک بڑھئی کو کام مشکل سے مل سکتا ہے۔ نہ یہاں کوئی پلنگوں کے پائے خراد کراتا ہے، نہ کوئی پیڑھے بنواتا ہے، نہ یہاں کے جھونپڑوں، چالوں، یا فلیٹوں میں رہنے والوں کے پاس آنگن بھی کہاں ہیں— جگہ کہاں ہے— جہاں ان کے بچّے گڈ ہلنے کے سہارے چلنا سیکھ سکیں؟ یہاں تو زمین پر مٹی اور دھول اور کیچڑ ہی میں بچّے گڈلیوں چلتے ہیں اور پھر دیواروں کا سہارا لے کر ایک دن چلنے لگتے ہیں۔

مگر کچھ ہی دن میں ساری جھونپڑ پٹی میں چاچا رحمت بخش کی شہرت ہو گئی۔ کسی کے

جھونپڑے کی ٹین کی چھت ہوا سے اُڑی جارہی تھی، چاچا نے کیلیں ٹھوک کر اس کو مضبوط بنا دیا۔ کسی کی لکڑی کے پھٹوں سے بنی دیوار ٹوٹ گئی تھی چاچا نے اس میں لکڑی کا ٹکڑا ٹھونک دیا۔ کسی کے پاس لکڑی کے ڈبے تھے چاچا نے اس کا صندوق بنادیا۔ تھوڑے دنوں میں آس پاس کے مکانوں، جھونپڑیوں، دکانوں سے جہاں بھی ٹھوکم ٹھاکی کی ضرورت پڑتی تھی، چاچا کا بلاوا آنے لگا۔ چاچا کا کام چل نکلا۔ مگر پھر بھی انھوں نے وقت نکال کر ایک گڈیلنا بنایا اور اس مزدور عورت کے بچے کو دیا جس نے پہلے دن بوا کو دودھ پلایا تھا— اپنے بیٹے کا حق مار کے!

''لو بہن تمھارا منا جب گڈلیاں چلنے لگے تو اس کو چلنا سکھانے کے کام آئے گا۔ یہ میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے؟''

دوسرا گڈیلنا رحمت بخش نے اپنے بوا کے واسطے بنایا اور اس میں اس نے اپنی ساری کاریگری خرچ کر دی۔

یہ دنیا کا سب سے خوب صورت گڈیلنا ہوگا۔

اس گڈیلنے پر اس کا اپنا بیٹا— الٰہی بخش— چلنا سیکھے گا۔

اس کے لکڑی کے تینوں پہیئے گول اور سڈول ہوں گے۔

اس کا ہتہ جس پر بوا اپنے ننھے ننھے ہاتھ رکھے گا بیلن کی طرح ہموار اور چکنا ہوگا۔

اس کے ہتّے کے نیچے چھوٹے چھوٹے گھونگرو لگے ہوں گے تا کہ جب بوا چلے تو ننھی ننھی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

اور پھر وہ دن آیا جب رحمت بخش نے گڈلیوں چلنے والے بوا کو گڈیلنے کے سہارے چلنا سکھایا۔ جھونپڑی کے سامنے کی جگہ اونچی نیچی تھی۔ دوبار گرا۔ پھر چلنے لگا۔ رحمت بخش بیوی کے بھاگ جانے کے بعد آج پہلی بار مسکرایا۔ اس کے سوکھے دکھی جیون میں پھر سے بہار آ گئی۔

(3)

اب تو رحمت بخش آس پاس کہیں کام کرنے جاتا تو بوا گڈیلنا لیے بستی بھر میں گھومتا پھرتا۔ سب اس بن ماں کے بچّے کو پہچانتے تھے۔ کوئی عورت اس کو دودھ کا گلاس پلا دیتی۔ کوئی آدمی

چوسنے والی میٹھی گولیاں اسے دے دیتا۔

بچے اس کے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ببوا جیسے جیسے بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ بہت خوب صورت ہوتا جا رہا تھا۔ رحمت بخش کبھی کبھی سوچتا کیوں نہ ہو۔ اس کی ماں کم بخت بڑی خوب صورت تھی!

اور جب رحمت بخش گھر لوٹتا تو ببوا گڈیلنے کو دوڑتا ہوا آتا اور باپ اسے گود میں لے لیتا۔ بچہ باپ کی داڑھی سے کھیلتا، داڑھی کے بال نوچتا۔ اس سے بڑی خوشی باپ کے لیے کیا ہو سکتی ہے کہ بچہ اس کی داڑھی کے بال نوچے۔ ببوا ابھی بول نہیں سکتا تھا۔ ورنہ رحمت بخش سے ضرور پوچھتا۔ ''بابا۔ یہ تمھاری آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ رہے ہیں؟ دیکھو تمھاری داڑھی ساری گیلی ہوگئی'' اور اگر وہ یہ سوال کرتا تو رحمت بخش اسے جواب دیتا ''بیٹا یہ خوشی کے آنسو ہیں۔''

اب تو رحمت بخش کی ساری زندگی اپنے ببوا کی ہستی پر، اُس کی زندگی اور اس کی خوشی پر مرکوز ہوگئی تھی۔

رات کو بیٹے کو گلے لگا کر جب وہ لیٹتا اور تھپکتے تھپکتے ببوا سو جاتا تو رحمت بخش سوچتا کہ اپنے ببوا کو میں پڑھاؤں گا، لکھاؤں گا، اسکول بھیجوں گا، مگر ساتھ میں اس کو اپنا کام بھی سکھاؤں گا تا کہ پڑھ لکھ کر جب وہ بڑا ہو جائے تو اس کو کسی گندی جھونپڑ پٹی میں نہ رہنا پڑے۔ وہ معمولی بڑھئی تھوڑا ہی ہوگا۔ کاری گر مستری ہوگا۔ گڈیلنے تھوڑا ہی بنائے گا، فرنیچر بنایا کرے گا۔ اُس کا اپنا کارخانہ ہوگا۔ جہاں میز کرسیاں، الماریاں، صوفہ سیٹ بنیں گے۔ شروع میں وہ اپنے ہاتھ سے بنائے گا۔ پھر دوسرے بڑھیوں سے کام لیا کرے گا۔ خود فرنیچر ڈیزائن کیا کرے گا۔ پھر اُس کا بڑا سا گھر ہوگا۔ جہاں وہ اور میں رہا کریں گے۔ پھر ایک دن ببوا سے کہوں گا ''بیٹا۔ اب گھر سونا سونا لگتا ہے۔ بہو لے آ تو چاندنا ہو جائے۔'' اور پھر ایک خوب صورت سی لڑکی دیکھ کر میں اُس کی شادی کر دوں گا۔ شادی کا چھپر کھٹ اپنے ہاتھ سے بناؤں گا۔ اس کو پھولوں سے سجاؤں گا۔ ببوا کے سہرا باندھوں گا۔ دلہن کے لیے لال جوڑا سلواؤں گا۔ پھر میں دونوں کو دعا دوں گا۔ ''خوش رہو میرے بچو۔ دودھوں نہاؤں پوتوں پھلوں۔''

اور پھر اس کے تخیل میں ببوا کی دلہن کی منہ دکھائی ہوتی۔

رحمت بخش ایک سو روپے منہ دکھائی میں دیتا۔
بوا مسکرا کر اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتا۔
اور خواب میں بھی رحمت بخش کے منہ سے چیخ نکل جاتی کیونکہ بوا کی بیوی کا خوب صورت چہرہ ہو بہو کریمن جیسا ہوتا!

(4)

اُس صبح رحمت بخش سویرے سو کر اٹھا۔
بوا ابھی سو ہی رہا تھا کہ اس نے نماز پڑھ کر دعا مانگی "اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے بن ماں کے بچے کا خیال رکھنا، پروردگار۔"
پھر اس نے دودھ گرم کرنے کے لیے چولھے میں آگ جلائی۔ پتیلی اُس پر رکھی۔ بچے کو اٹھایا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ پھر اس کو دودھ پلایا۔ کپڑے بدلوائے۔ پھر خود باسی روٹی کا ناشتہ کیا۔ پھر گڈیلنا نکالا بچے کو پیار کیا۔ اس کو گڈیلنے کا سہارا دے کر جھونپڑی سے باہر نکالا۔ پڑوسن اپنی جھونپڑیوں کے آگے جھاڑو دے کر صفائی کر رہی تھی اُس سے کہا۔ "بیٹی میں کام پر جا رہا ہوں۔ بوا یہاں کھیل رہا ہے، ذرا خیال رکھنا۔"
"تم فکر نہ کرو، بابا۔" پڑوسن نے کہا۔
نہ جانے کیوں جانے سے پہلے رحمت بخش کا جی چاہا کہ ایک بار بوا کو پھر پیار کرے۔
پھر وہ اوزاروں کا تھیلا کندھے پر لٹکا کر اپنے کام پر چلا گیا۔
بوا پڑوسن کے جھونپڑے کے آگے کھیلتا رہا۔ پڑوسن نے سوچا۔ "کتنا خوب صورت بچہ ہے۔ اس کو کہیں نظر نہ لگ جائے" اور اس نے ایک کالا ٹیکا بوا کے گورے چٹے ماتھ پر لگا دیا۔
بوا گڈیلنے کو دھکا دیتے ہوئے دور تک لے گیا۔ پڑوسن نے آواز بھی دی۔ "بوا— دور نہ جانا، بیٹا۔"
پھر وہ جھونپڑے کے اندر چولھا جلانے چلی گئی کیونکہ اس کا پتی مل میں رات پالی کر کے آنے والا ہی تھا۔
بوا گلی کے پرلے سرے سے اپنا گڈیلنا موڑنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا دو آدمی ایک

جھونپڑے کے پیچھے کھڑے ہیں اور ان کے ہاتھ میں بڑا تھیلا ہے اور اس میں سے بڑے خوب صورت اور رنگین کھلونے — گیند اور جھن جھنے اور چھوٹی سی موٹر — نکال کر اُسے دکھا رہے ہیں —

ایک کے منہ پر چیچک کے داغ تھے دوسرے کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اشارے سے انھوں نے کہا۔ یہ سب تمھارے لیے ہی لائے ہیں ہم۔ ادھر تو آؤ۔

گڈیلنے کو دھکا دیتے ہوئے ببوا اُدھر جھونپڑوں کے پیچھے چلا گیا۔

رنگین گیند بڑھا کر اس کو دینے کے بہانے سے ایک آدمی نے ایک رومال ببوا کی ناک پر رکھ دیا۔ بڑی تیز بدبو آ رہی تھی۔ ببوا کا جی چاہا چیخے مگر وہ چیخ نہ سکا۔ اس کا تو ایک دم دم گھٹ رہا تھا اور نیند بھی آ رہی تھی۔

دونوں آدمیوں نے بے ہوش بچے کو گڈیلنے سے جدا کرنا چاہا مگر ببوا نے اتنے زور سے گڈیلنے کا ہتا پکڑ رکھا تھا کہ اُن انگلیوں کو زبردستی کھول کر ہاتھ کو آزاد کرنا پڑا۔ پھر جلدی سے انھوں نے بچے کو تھیلے میں ڈالا اور پھر ایک آدمی نے تھیلے کو کندھے پر ڈال لیا اور دونوں وہاں سے سُرک گئے اور آگے جا کر آواز لگانے لگا۔ ''جونا پرانا سامان!''

چولھے پر چائے کا پانی رکھ کر اور اس میں پتّی ڈال کر پڑوسن باہر نکلی کہ ببوا کو دیکھ لوں تو دیکھا گلی میں بچہ نہیں ہے۔ اِدھر اُدھر تلاش کرتی ہوئی دوسرے کنارے پر گئی تو دیکھا ببوا نہیں۔ جھونپڑیوں کے پیچھے صرف اس کا گڈیلنا پڑا ہوا ہے۔

(5)

اُسی شام کو ببوا کو (جو اب ہوش میں تھا) ایک اچھا سا بابا سوٹ پہنا کر وہی دونوں آدمی ایک عالیشان فلیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔

نوکر سے ایک نے کہا۔ ''صاحب اور میم صاحب سے کہو ہم بچہ لے آئے ہیں۔''

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور اس کی موٹی سی بیوی داخل ہوئے اور بچے کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''بچہ تو بہت پیارا ہے۔'' سیٹھانی نے کہا۔

''اس کا نام کیا ہے؟ سیٹھ نے پوچھا۔
بڑی بڑی مونچھوں والے نے چیچک کے داغوں والے کی طرف دیکھا۔ اور سیٹھ سے کہا۔
''یہ اس کے باپ ہیں۔''
چیچک کے داغوں والے نے کہا۔ ''حضور۔ اس کا نام منا ہے۔''
''کیوں منا ہمارے پاس رہو گے؟'' سیٹھانی نے پوچھا۔
ببوا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی اس کو بولنا ہی نہیں آتا تھا۔ صرف چلنا آتا تھا۔ وہ بھی گڈ یلنے کے سہارے۔
'رہے گا کیوں نہیں، حضور۔ مگر اس کو پیار سے رکھیے گا۔ چیچک رو آدمی کی آنکھوں میں اب ڈرامائی آنسو تھے۔ ''بس بن ماں کا بچہ ہے۔ اس کو جدا کر کے میرے کلیجے پر تو چھریاں چل رہی ہیں حضور مگر کیا کروں۔ اسی کی بھلائی کے لیے ایسا کر رہا ہوں۔''
سیٹھانی نے بچّے کو گود میں لے لیا۔
سیٹھ نے پانچ سو روپے چیچک رو آدمی کے ہاتھ پر رکھ دیے اور کہا ''شکریہ۔ بھائی۔ تمھاری مہربانی سے ہمارے من کی سوکھی بگیا میں بھی بہار آ جائے گی۔ اطمینان رکھو ہم اسے اپنا بچہ سمجھ کر پالیں گے۔ تم جب چاہو آ کر اسے دیکھ سکتے ہو۔
''بھگوان آپ کا بھلا کرے۔'' نقلی باپ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔
''اچھا بیٹا منا۔ اب ہم جاتے ہیں۔ بھگوان تمھیں سکھی رکھے۔''
اور پھر دونوں چلے گئے۔
فلیٹ کا دروازہ بند ہوتے ہی نوٹوں کا بٹوارہ ہو گیا۔
''یہ لے بھئی تیرے ڈھائی سو'' بڑی بڑی مونچھوں والے نے کہا۔
''مجھے پچاس اور ملنے چاہییں۔'' چیچک رو آدمی نے کہا۔ ''آخر باپ میں بنا تھا۔''
''مگر تھیلے میں کس نے ڈالا تھا؟''
کلوروفارم کس نے سنگھایا تھا؟''
''بچے کا پتہ کس نے لگایا تھا؟''

''تو پھر ڈھائی ڈھائی سو ٹھیک ہیں۔ چلو کوئی اور دھندا سوچیں۔ بچے تو بہت مارے مارے پھرتے ہیں لیکن بےاولادوں کا پتہ مشکل سے ملتا ہے۔''

(6)

اس دن سے بوا کا گڈیلنا وہیں جھونپڑیوں کے پیچھے پڑا تھا۔

رحمت بخش نے اپنے بچے کی تلاش میں سارا بمبئی چھان مارا۔ پولیس میں رپٹ لکھوائی۔ بچے کا حلیہ لکھوایا۔ ''خوب صورت بچہ ہے۔ گورا چٹا۔ نام ہے الٰہی بخش۔ مگر ہم سب بوا بوا کہہ کر پکارتے ہیں۔'

رحمت بخش جب اپنے جھونپڑے میں رات گئے واپس آیا تو نہ کھایا نہ پیا۔ چپ چاپ اپنے جھونپڑے میں چلا گیا۔ لالٹین جلائی۔ پھر پڑوسیوں کو کچھ ٹھک ٹھک کی آواز آئی......

جھانک کر دیکھا تو رحمت بخش لکڑی کاٹ کر اُس کا خراد کر رہا تھا۔

''کیا بنا رہے ہو رحمت چاچا؟

''ش ش۔ بوا سو رہا ہے میں اس کے لیے گڈیلنا بنا رہا ہوں۔''

لوگ کہتے ہیں رحمت چاچا پاگل ہو گئے ہیں۔

مگر۔ پاگل کسے کہتے ہیں؟

وہ کسی سے لڑتے نہیں، جھگڑتے نہیں، چیختے نہیں، پکارتے نہیں۔ وہ تو روتے بھی نہیں۔

دن رات گڈیلنے بناتے رہتے ہیں۔ کوئی پڑوسی رحم کھا کر روٹی کا ٹکڑا دیتا ہے تو کھا لیتے ہیں۔ اور پھر گڈیلنے بنانے لگتے ہیں۔

ایک گڈیلنا

دو گڈیلنے۔

تین گڈیلنے۔

چار گڈیلنے۔

پانچ۔ چھ۔ سات گڈیلنے۔ سارے جھونپڑے میں یہاں سے وہاں تک گڈیلنوں کی قطاریں لگی ہیں۔

مگر یہ گڈیلنے بکتے نہیں۔ یہ سب گڈیلنے بوا کے لیے ہیں جو (رحمت چاچا کو یقین ہے) ایک دن ضرور اپنا گڈیلنا لینے آئے گا۔

اور بوا کا اپنا گڈیلنا اس تمام عرصے جھونپڑپٹی کے باہر دھوپ بارش، آندھی، طوفان میں پڑا رہا جہاں سے گذرتے ہوئے بھیکو نے اسے دیکھا اور اس کو اٹھا کر اپنے کھٹارے پر لدے ہوئے ٹب میں ڈال لیا تھا یہ سوچ کر کہ یہ میرے متو کے کام آئے گا۔

○

دنیا بھر کا کچرا

شام ہو رہی تھی جب بھیکو کالینہ سے اپنے گھر کی طرف کھٹارا لے کر چلا۔ آج نہ جانے کیوں کھٹارا بہت بھاری لگ رہا تھا۔ کھینچتے کھینچتے اُسے پسینہ آ گیا اور وہ ہانپنے لگا۔ ایک ٹب ایک اسٹوو، ایک موٹر کا ٹائر، تیرہ فلم کے خالی ڈبے اور ایک بچّے کا گڈیلنا۔ اتنی بھاری تو کوئی چیز بھی نہیں تھی مگر ایسا لگتا تھا جیسے کھٹارے پر پتھر لدے ہوں۔

کھٹارے میں ٹب تھا۔ ٹب میں سب چیزوں کے اوپر وہ بچے کا گڈیلنا رکھا ہوا تھا۔

بھیکو کھٹارے کو دھکیل رہا تھا اور اس گڈیلنے کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ اُس پگلے بھکاری نے کیا کہا تھا بھلا۔ ''بیکار ہے مگر ذرا سوچو کیوں بیکار ہے؟'' اس کا کیا مطلب ہوا؟

گڈیلنے کو دیکھ کر بھیکو کو اپنا۔۔ یا صرف بالو کا۔۔ بچہ متو یاد آیا۔ اب متو گڈلیاں تو چلنے ہی لگا ہے۔ بس اب گڈیلنے کے سہارے جلد ہی اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چلنے لگے گا۔

نہ جانے کیوں بچّے کے بارے میں سوچتے سوچتے اُس کو ایک بھیانک خیال آیا کہیں بالو اُسے لے کر کہیں چلی نہ گئی ہو؟ جائے گی کہاں بے چاری؟ کہیں بھی جا سکتی ہے! ممکن ہے بچّے کا اصلی باپ ہی کہیں سے نکل آئے؟ تب کیا ہو گا؟

یہ خیال آنا تھا کہ بھیکو نے پورے زور سے جلدی جلدی کھٹارے کو دھکیلنا شروع کیا۔ مگر

یہ کھٹارا جلدی چل ہی نہ سکتا تھا۔ تینوں پہیئے اونچے نیچے تھے۔ اب دور سے کوڑے کے ڈھیر دکھائی دینے لگے تھے۔ دو تین ٹرکیں بھی کھڑی تھیں۔ کچرا والا سیٹھ کی کالی لمبی موٹر بھی کھڑی تھی۔ جاتے ہی ان سب چیزوں کے کم سے کم پچاس روپے آج مانگوں گا۔ دیکھوں دیتا ہے یا نہیں۔ نہیں دے گا تو کیا کرنا ہوگا؟ کروں گا بھی تو کیا۔ جب دوسرا کوئی خریدار ہی نہیں ہے۔ کچرے کی ڈھیریاں صرف یہاں لگتی ہیں۔ یہ زمین سب کچرا والا سیٹھ کی ہے اور کوئی یہ دھندا کرتا ہی نہیں ہے۔ سنا ہے کئی لوگوں نے چھوٹے موٹے پیمانہ پر یہ دھندا شروع کیا تھا مگر کچرا والا سیٹھ نے یا تو انھیں اور ان کے کچرے کے ڈھیروں کو خرید لیا یا انہیں مار بھگایا۔ غنڈوں کو یوں ہی مفت پگار نہیں دیتا تھا وہ— اس نے سوچا جو بھی کچرا والا سیٹھ دے گا وہ لے لے گا۔

دو چار غنڈے ویسے بھی کچرا والا سیٹھ کے اِدھر اُدھر بوڈی گارڈ کی طرح لگے رہتے تھے۔ کھٹارے والوں سے سیٹھ جب بھی بات چیت کرتا تھا، غنڈے اس کے آس پاس ضرور ہوتے تھے۔ نہ جانے کب کوئی کھٹارے والا قیمت پر اصرار کرتے کرتے سیٹھ پر حملہ ہی کر دے۔ عقل مندی اس میں تھی کہ سیٹھ ہر چیز کے لیے تیار رہے!—

اب کوڑے کے ڈھیر قریب آتے جا رہے تھے۔ اُن کی بو اُن سے بھی قریب تھی۔ ابھی دو ڈھائی سو فٹ باقی ہوں گے کہ ایک سڑی ہوئی بساندآئی جس میں دنیا بھر کی بدبوئیں شامل تھیں۔ اسی بدبو میں کچرا والا سیٹھ ایک کوڑے کے ڈھیر پر چڑھا ہوا تھا تاکہ وہ دیکھ لے کہ اس کی سلطنت کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اونچائی سے کسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ شاید اپنی ٹرک والوں کو بتا رہا تھا کہ کدھر سے کچرا اٹھانا ہے اور اُسے کہاں لے جانا ہے۔

بھیکو کی جھونپڑی اب قریب ہی تھی۔ اُس نے سوچا کچرا والا سیٹھ سامنے تو کھڑا ہے کہیں بھاگا تھوڑا ہی جاتا ہے۔ کیوں نہ میں بھاگ کر بالو اور منّو کو دیکھتا چلوں۔ مجھے بھی اطمینان ہو جائے گا اور اُن کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں واپس آ گیا ہوں۔

کھٹارا سڑک پر چھوڑ کر بھیکو بھاگتا ہوا بستی میں آیا۔ سیدھا اپنی جھونپڑی میں گیا۔ وہاں دیکھا کوئی نہیں ہے، نہ بالو اور نہ منّو۔ کہاں گئے یہ دونوں۔ باہر نکل رہا تھا کہ اُس کا پڑوسی فضلو

ملا۔ وہ بھی ابھی کام سے واپس آیا تھا۔

''فضلو بھیا کہیں میری عورت کو دیکھا ہے؟''

''بھابی ابھی کوڑے کے ڈھیروں کی طرف گئی ہے۔''

بھیکو کا ماتھا ٹھنکا۔ کوڑے کے ڈھیروں کی طرف تو کبھی بالو جاتی ہی نہیں تھی اس نے تو کچرا والا سیٹھ کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

فضلو نے بتایا'' دراصل وہ منو کو ہی ڈھونڈ رہی تھی۔ تمھارا بچہ شاید پنڈلیاں چلتے چلتے ادھر چلا گیا ہے۔ تم بھی......''

بھیکو نے فضلو کی پوری بات نہیں سنی۔ اب وہ تیزی سے کوڑے کے ڈھیروں کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں کچرا والا سیٹھ کھڑا اور اس کی ٹرکیں کھڑی تھیں جو کچرا لاتی تھیں اور کچرا لے جاتی تھیں۔ اس کے غنڈے کھڑے تھے اور تین چار کھٹارے والے کھڑے تھے اور سب باتیں نہیں کررہے تھے، خاموشی سے نیچے کوڑے کے ڈھیروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بھیکو ایک ٹرک کے پاس پہنچا جو سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور جس کے پیچھے کا تختہ کھلا ہوا تھا۔ شہر بھر کی گندگی بھر کر لائی ہوگی اور وہ لا کر یہاں ڈالی ہے۔ ٹرک کے پاس ایک کھٹارے والا کھڑا تھا۔ وہ بھیکو کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیوں رامو کیا ہوا؟''

جواب دینے سے پہلے رامو جھجکا۔ پھر اُس نے اتنا ہی کہا، بھیکو تمھارا بچہ ......اور پھر نیچے کی طرف اشارہ کیا۔

''منو!'' بھیکو نے دہرایا۔'' کیا ہوا منو کو......؟'' اور اس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں کم سے کم چھ فٹ گہری کھائی کو کوڑے سے بھرا جا رہا تھا۔ بدبو کے زہریلے آبخرات کی وجہ سے بہت کم لوگوں کو ہمت ہوتی تھی ادھر جانے کی۔ لوگ تو عام طور سے اُدھر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

بھیکو نے نیچے نظر کی تو دیکھا کہ بالو پاگلوں کی طرح نیچے کی طرف دوڑی جارہی ہے اور وہاں کوڑے کے نئے ڈھیر میں جو ابھی ابھی ٹرک نے لا کر ڈالا تھا کرید کر کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔

بھیکو کے دماغ نے جو ایک دم ساکت ہو گیا تھا بھلا وہاں کوڑے کے ڈھیر میں کیا ڈھونڈ رہی ہے؟ اور دفعتاً ایک بھیانک خیال اس کے دماغ میں آیا۔

''منو! منو!'' چلاّتا ہوا بھیکو بھی کوڑے کی ڈھلان پر سے بھاگتا ہوا نیچے کی طرف چلا۔ اس کے پیچھے دو کھٹارے والے بھاگے۔ رامو اور فضلو۔

جب تک وہ وہاں پہنچے۔ بالو نے کوڑے کے ڈھیروں کے نیچے سے منو کو نکال لیا تھا۔

اب بچے کی لاش اُس کے ہاتھوں میں تھی اور وہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ ہوا کیسے؟'' بھیکو کی آواز آنکھ کے آنسوؤں سے رندھی ہوئی تھی۔

رامو نے کہا۔'' مجھ سے پوچھو۔ گڈلیاں چنتا چنتا منو ٹرک کے پاس کھڑا کوڑے کے ڈھیروں کو دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ نے دس پیسے پھینک کر بچے کی طرف اشارہ کیا۔ بچہ گڈلیوں چنتا لڑھکتا پھڑکتا نیچے کی طرف چلا۔ اُس وقت اوپر سے ٹرک کا پچھلا پٹ کھلا اور منوں گندگی نیچی گری اور—''

''بس—'' بھیکو نے اشارے سے رامو کو منع کیا۔ وہ چلایا نہیں چیخا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اُس کے دل میں گہرا زخم لگا تھا۔ جس کو کوئی چیز اب بھر نہ سکے گی۔

منو کی لاش لینے کے لیے اب اس نے بالو کی طرف ہاتھ پھیلا دیے۔

مگر بالو نے سر کے اشارے سے ''نا'' کیا۔

اور اب وہ واپس جا رہے تھے۔ اُدھر جدھر کچرا والا سیٹھ کھڑا تھا۔

آگے آگے بچے کی لاش کو لیے ہوئے بالو۔''

اُس کے پیچھے بھیکو۔

اُس کے پیچھے رامو۔

کوڑے کے ایک ڈھیر کے اوپر کھڑے ہوئے کچرا والا سیٹھ نے دیکھا کہ اس کی پھیلی ہوئی گندگی کی بدبو اور ڈھیریوں اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے انباروں میں سے تین آدمی اوپر کی طرف چلے آ رہے ہیں، نہیں، اُن میں سے ایک عورت ہے۔ اس کی گود میں ایک بچہ ہے۔ بچہ

شاید مر چکا ہے۔ شاید یہ وہی بچہ ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے دس پیسے کی خاطر نیچے لڑھکتا لڑھکتا گیا تھا۔ یہ لوگ (کچراوالا سیٹھ نے سوچا) گندگی کے ڈھیروں ہی میں سے کلبلاتے ہوئے کیڑے کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور ان ہی گندگی کے ڈھیروں میں ان کی موت ہوتی ہے۔ کوئی شریف آدمی اس کا کیا کرسکتا ہے سوائے ہمدردی کے — اور یہ لوگ شاید ہمدردی کے بھی قابل نہیں ہیں۔

کچراوالا سیٹھ کے سامنے پہنچ کر بالو ایک دم ٹھٹکی پھر پیچھے ہٹی، اپنے بچّے کی لاش کو اس نے اپنے پلّو سے ڈھانپ لیا، جیسے اُسے ڈر ہو سیٹھ اُس کو چھین لے گا۔

بھیکو نے بالو کی طرف دیکھا۔ کیا وہ ایک دم پاگل ہوگئی ہے؟

بالو نے نظریں جھکالیں۔ آہستہ آہستہ اُس کے ہونٹ ہلے۔ بھیکو نے کان اُس کے پاس لے جاکر سننے کی کوشش کی۔

''یہ سیٹھ وہی ہے۔ وہی ہے۔ منّو کا اصلی باپ یہی ہے۔''

''نہیں!'' بھیکو کی بھیانک آواز بلند ہوئی۔

اور وہ وہاں سے بھاگا۔

سب سمجھے کہ بھیکو اپنے بچے کی موت سے پاگل ہوگیا ہے۔

پاگلوں کی طرح ہی بھاگتا وہ اپنے کھٹارے کے پاس گیا اور اُس کو دھکیلتا ہوا کچراوالا سیٹھ کے پاس لایا۔

''سیٹھ۔ دیکھتے ہو اس کھٹارے میں کیا بھرا ہے؟''

سیٹھ نے کھٹارے کی طرف ایک جھلّاتی ہوئی نظر ڈالی۔ ''کچرا ہے اور کیا ہوگا؟''

''اور اب اس کچرے ہی میں تم جارہے ہو۔'' یہ کہہ کر اس سے پہلے کہ سیٹھ کے باڈی گارڈ غنڈے اس کو روک سکتے۔ اس نے آکر سیٹھ کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ اڑتا ہوا چھ فٹ نیچے گندگی کے ڈھیروں میں جا گرا۔ دو غنڈے اپنے سیٹھ کو بچانے نیچے جانے کے لیے پگڈنڈی ڈھونڈنے لگے۔ تیسرا بھیکو کی طرف بڑھا مگر بھیکو بھی کبھی غنڈا تھا۔ کھوٹا دھندا کیا کرتا تھا۔ مار دھاڑ، چاقو چلانا جانتا تھا اور اس وقت تو اس کی طاقت غصے اور جنون کی طاقت تھی۔ غنڈے نے ایک وار کیا

مگر بھیکو نے اس کو مار مار کے بھرتہ بنادیا۔

پھر اپنے کھٹارے میں سے وہ ساری چیزیں اُتار اُتار کر بھیکو نے نیچے پھینکنی شروع کیں۔ جہاں کچراوالا سیٹھ گندگی میں سے اُٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔

پہلے ہی اس کے ہاتھ میں بچے کا گڈیلنا آیا۔ (اُس نے کبھی سوچا تھا اُن کا منو اُس کے سہارے چلنا سیکھے گا۔ مگر وہ تو اپنی ننھی ننھی ٹانگوں پر بہت دور چلا گیا تھا۔) اس کو گھما کر مارا تو سیٹھ کے سر میں لگا اور سیٹھ کچرے کے ڈھیر میں پھر گر گیا۔ اٹھا نہیں تھا کہ ایک تانبے کا اسٹوو اُس کی کمر میں آکر لگا۔ پھر فلم کے خالی ڈبوں کی بارش ہونے لگی۔ اوپر سے ایک ربڑ کا ٹائر آیا اور ان سب کے بعد ایک سفید لوہے کا ٹب اڑتا ہوا آیا اور عین سیٹھ کے اوپر گرا۔ اور اس کے وزن سے سیٹھ زہریلی گندگی میں اور دھنس گیا اور ٹب کی سفید قبر میں ہمیشہ کے لیے سو گیا!

اب کھٹارے والوں، آس پاس کے گزرنے والوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔

''کیا ہوا؟''

'کیا ہوا بھائی؟''

''کسی کو مار ڈالا کیا۔؟''

''ہاں اس آدمی نے کچراوالا سیٹھ کو اٹھا کر نیچے پھینک دیا ہے۔''

بھیکو نے دانت پیس کر کہا: ''کچراوالا سیٹھ نہیں۔ کچرے کو کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیا ہے۔''

پولس نے آکر بھیکو کو گرفتار کرلیا تو اس نے پہلی بار اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو اب بھی اپنے بچے کی لاش کو آنچل سے ڈھانپے اور کلیجے سے لگائے کھڑی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں کوئی پہچان نہیں تھی۔ کوئی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ وہ گم سم تھی، ایک پتھر کی مورتی کی طرح۔ مگر پتھر کی مورتی کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے۔

بھیکو اب چودہ برس کے لیے جیل میں ہے۔ جہاں ہر ہفتے، جس دن جیل خانے کی صفائی ہوتی ہے، اُس سے کچرا ڈھونے کا کام لیا جاتا ہے۔

بالو اب پاگل خانے میں ہے جہاں وہ ہر وقت ایک موم کی گڑیا کو گود میں لیے لوریاں سنایا کرتی ہے۔

متو کورا مواور فضلو اور بھیکو کے دوسرے ساتھیوں نے کوڑوں کے ڈھیروں کے پاس ہی دو فٹ زمین میں دفنا دیا ہے۔ ایک ننھی سی قبر بھی بنا دی ہے۔ وہاں دو چار پھولوں کی جھاڑیاں بھی لگا دی ہیں۔ سنا ہے اُس قبر پر آج کل بڑے خوب صورت گلاب کے لال پھول کھلے ہیں اور ممکن ہے یہ واقعہ نہ ہو — صرف ہماری خواہش ہو!

○

ایک اور پریم کہانی

نوٹ: یہ ناول ہندی میں ''ہیلو مس مالتی'' کے عنوان سے بھی شائع ہو چکا ہے

دو لفظ

ایک مشہور امریکن ناولسٹ نے کہا ہے کہ، 'آئندہ زمانے میں ناول اسکرین پلے کے انداز میں لکھے جائیں گے'، یعنی صرف ایکشن اور ڈائیلاگ ہی ہوں گے ان میں!

سویت میں ایک ادبی فلمی صنف ہے جسے 'لٹریری سنیریوں' کہتے ہیں، یعنی اسکرین پلے کو ایک ادبی حیثیت دے دی گئی ہے۔ 'لٹریری سنیریوں' میں کوئی تکنیکی زبان استعمال نہیں کی جاتی۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ڈائریکٹر، فوٹوگرافر اور فلم کے دوسرے تکنیکی لوگوں کو کہانی پڑھ کر اس کے مرکزی خیال کا پورا اندازہ ہو جائے۔ کیا ڈائیلاگ بولنے ہیں وہ معلوم ہو جائیں۔ اس کو فلمی جامہ پہنانے کے لیے کیا ٹکنک استعمال کی جائے گی اس کا فیصلہ تو کیمرہ مین اور دوسرے تکنیکی لوگ کریں گے لیکن ایک مصنف کی حیثیت سے لکھنے والے کی کیا ضرورت ہے، وہ کیا لکھنا چاہتا ہے اور کیسے دکھانا چاہتا ہے وہ سب 'لٹریری سنیریوں' میں موجود ہونا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ آج کے مشینی دور میں کسی کو فرصت نہیں ہے کہ دو تین سو صفحات نفسیاتی الجھنوں پر صرف کرے۔ موسم کے حال پر یا ماحول کی تفصیل کو بیان کرنے میں کرے۔ نہ ہی پڑھنے والوں کو فرصت ہے، نہ لکھنے والوں کو۔

اس لیے میں نے پچھلے کچھ ناولوں سے یہ نئی تکنیک استعمال کی ہے اور یہ پسند بھی کی گئی

ہے۔اس لیے میں نے اپنا یہ ناول 'ایک اور پریم کہانی' لٹریری سنیریوں کے فارم میں لکھا ہے۔ کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ اپنے پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔

اس کی فلم ابھی تک نہیں بنی ہے۔لیکن کبھی بھی بن سکتی ہے۔

فلم اور ادب کے بیچ میں فاصلہ ہے اس کو دور کرنے کی یہ میری کوشش ہے، مگر آخری کوشش نہیں ہے۔امید ہے اس تکنیک کو دوسرے مصنف بھی اپنائیں گے، اس کو سنواریں گے اور اس کی ادبی حیثیت منوا کر رہیں گے۔

خواجہ احمد عباس

ایک اور پریم کہانی

ایک جہاز پر سے کوئلہ اتارا جارہا تھا۔

کوئلہ اتارنے کے کام میں لگے ہوئے مزدوروں کے چہرے سیاہ ہو گئے تھے۔ان میں سے ایک جس کا جسم کمر تک ننگا تھا، گوپال تھا۔

اس کا چہرہ، ہاتھ اور سینہ، سب کوئلے کی گرد سے سیاہ تھے۔صرف اس کی آنکھیں جلتے ہوئے کوئلوں کی طرح دہک رہی تھی، جو اسے دوسرے مزدوروں سے نمایاں کرتی تھی۔

یہ کمر توڑ کام تھا۔ جو پسینہ گوپال کے چہرے اور بدن سے بہہ رہا تھا، وہ بھی سیاہ ہی تھا۔

سائرن کی آواز پر سارے مزدوروں نے اپنے اوزار رکھ دیے اور جانے لگے، لیکن گوپال نہیں گیا۔اس نے اپنا کام جاری رکھا۔کنٹرکٹر کے آدمی نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی محنت کیوں کر رہا ہے؟ گوپال نے جواب دیا کہ وہ کمانا چاہتا ہے تاکہ وہ رات کو 'سیلر بوائے' نائٹ کلب جاسکے۔

'سنا ہے وہاں سالی میمیں ننگا ناچتی ہیں!'

امر، جو کنٹرکٹر کا کلرک تھا، روپے کی گنتی کررہا تھا۔ پھر گوپال کے اوورٹائم کے روپے دیتے ہوئے، ذرا تعجب ظاہر کرتے ہوئے بولا، 'ارے بھائی، تم اتنی سخت محنت کیوں کرتے ہو؟'

''امر بھیا، ساری محنت میں اس لیے کرتا ہوں کیونکہ میں امیر آدمی کا بیٹا نہیں ہوں لیکن مجھے غریبوں جیسی زندگی گزارنا اچھا نہیں لگتا۔ آج میں نے اُووَر ٹائم اس لیے کیا ہے کہ 'سیلر بوائے' بار اور نائٹ کلب میں پینے کا مزا لینا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ حساب کتاب کا رجسٹر پھینکو اور مزے اڑاؤ۔ میں کہتا ہوں تم ایک بار بھی روزی کو دیکھ لوگے تو تمھارے جیسا دھرماتما بھی پھسل پڑے گا۔''

امر آدرش وادی تھا۔ وہ گوپال کی بات چیت سے متاثر نہیں ہوا لیکن رنجیت، جو اس سیکشن کا منیجر تھا، گوپال کی بات کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ گوپال کے چلے جانے کے بعد اس نے امر سے پوچھا، ''یہ کالے چہرے والا مزدور کون ہے؟''

''اس کا نام گوپال ہے۔ وہ کالے چہرے والا نہیں، بلکہ گورا چٹا ہے، بالکل ایک انگریز کی طرح۔''

گوپال چال کے سامنے بستی کے نل پر نہا رہا تھا۔ اس کا چہرہ صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا تھا۔ جب اس نے اپنا چہرہ دھویا اور تولیے سے اس کو رگڑا تو اس کا اصلی رنگ ظاہر ہو گیا۔

وہ ایک اچھے ناک نقش والا خوب صورت اور مضبوط بازوؤں والا نوجوان تھا۔

اس کی کھولی کی دیواروں پر لڑکیوں کی رنگین تصویریں چپکی ہوئی تھیں۔

گوپال نے نیلے رنگ کی جنس اور ایک اسمارٹ اور چست جیکٹ (جو باہر کے کسی ملک سے آئی لگتی تھی) پہنی۔ پھر ایک بانکا ہیٹ اپنے سر پر اس طرح سے لگایا جیسے اوباش لوگ لگاتے ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور خود ہی خود مسکرا دیا۔

سیلر بوائے بار اور نائٹ کلب روزمرہ کی طرح جگمگا رہا تھا۔

سینٹرل گیٹ پر سیلر بوائے کا نیون سائن جگمگ کر رہا تھا۔ ایک دوسرا سائن نظر آیا 'اسپیشل شو ٹو نائٹ' ٹکٹ بیس روپے۔

اب گوپال نے اپنی جیب سے پیسے نکالے تو صرف بارہ روپے نکلے۔ دربان نے اسے

اندر جانے سے روک دیا اور گوپال ناامید ہو کر سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ اتنے میں پردے کے پیچھے سے ایک نازک ہاتھ باہر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سوچ سکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اسے اندر کھینچ لیا گیا۔

یہ روزی تھی جس نے اسے اندر کھینچ لیا تھا۔

اب وہ ایک چھوٹے سے بھرے ہوئے بار اور نائٹ کلب کے اندر تھا۔

''سالی۔ حرام زادی۔ مجھے اس طرح گھسیٹتی ہے۔ کیا تو سمجھتی ہے میں بٹاٹے کی بوری ہوں؟''

''نہیں ٹماٹر کی''، اس کے گالوں پر چٹکی لیتے ہوئے روزی بولی، ''جب تم آنا چاہو تو میرا نام ان کو بتا دینا۔ پھر کوئی دقت نہیں ہوگی۔''

میں لڑکیوں سے خیرات نہیں لیتا۔ میں انھیں روپے دیتا ہوں۔ یہ لو، وہ بارہ روپے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہتا ہے، یہی سب اس وقت میرے پاس ہے۔ میں تمھارا صرف آٹھ روپے کا قرضدار ہوں۔'

''لیکن پینے کے لیے روپے کہاں ہیں تمھارے پاس؟ اس سے ایک بیئر کی بوتل آ جائے گی۔''

''مس روزی! مس روزی، ناچ کے لیے تیار ہو جاؤ''، ایک لڑکے نے اعلان کیا۔

گوپال نے کہا، ''تم جاؤ روزی۔ پینے کا انتظام میں خود کر لوں گا۔ تم ذرا انتظار کرو اور پھر دیکھو تماشا۔''

''اچھا پھر ملوں گی''، روزی بولی اور گوپال کی طرف اپنی انگلی کے اشارے سے ایک بوسہ پھینکتے ہوئی اندر چلی گئی۔

گوپال بار کے اندر گیا جہاں بہت سے غیر ملکی اونچے اسٹولوں پر بیٹھے کئی طرح کی شرابیں پی رہے تھے۔

اس نے ان میں سے ایک تگڑے آدمی کے شانے پر تھپکی لگائی۔ 'ہائے جونی' کہہ کر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ غیر ملکی نے اس سے اپنا ہاتھ ملایا۔ اس نے کہا، ''لیکن تم غلطی پر ہو۔ میرا نام پیٹر ہے جونی نہیں۔ تم یہاں کیا کرتے ہو؟''

گوپال اس غیر ملکی کا ہاتھ زور سے دبا رہا تھا۔ وہ طیش میں آ گیا اور بولا 'وائز گائے!''

اس نے اپنے ہاتھ سے پٹھے کو دکھاتے ہوئے کہا،"کیا ہم سے مقابلہ کرو گے؟"

"یقینی!"گوپال بولا،"میں ایک بوتل بیئر کی شرط لگاتا ہوں۔تم جیت نہیں سکتے۔"

"مجھے منظور ہے۔بیئر کی ایک بوتل"، ودیشی نے کہا۔

گوپال نے اپنی سیدھی کہنی کو کاؤنٹر پر رکھا۔غیر ملکی نے اپنی کہنی کو ٹکا دیا۔
بار میں بیٹھے ہوئے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ان میں کچھ غیر ملکی بھی تھے کچھ گوپال کی طرف داری کر رہے تھے اور کچھ اس غیر ملکی کی۔دونوں ایک دوسرے کو ہرانے کے لیے اپنی پوری طاقت لگا رہے تھے۔آخرکار گوپال جیت گیا۔اور ٹھیک اس وقت جب بیئر کا جام اس کی طرف بڑھایا گیا تو، آرکے اسٹرا کا میوزک گونج اٹھا۔روشنیاں مدھم ہو گئیں۔روشنی کا ایک دائرہ گھیرے اسٹیج پر گرا اور اس میں روزی نمودار ہوئی۔ایسے بیباک لباس میں، جو اس کے جسم کو اور زیادہ نمایاں کر رہا تھا۔

اس کی آنکھیں گوپال پر تھیں۔

گوپال نے اپنا بیئر کا جام اوپر اٹھایا، یہ جتانے کے لیے کہ آخر اس نے اپنی شراب کا مفت انتظام کر ہی لیا۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر گانا اور ناچنا شروع کر دیا۔

یہ ایک تڑپانے والا 'پاپ' گیت تھا جس کا بنیادی خیال یہ تھا کہ 'کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ کل ہم مر جائیں گے'، ایک فلسفہ جو سب ملاحوں کے لیے دلکش ہوتا ہے۔

جب گانا ختم ہو گیا تو لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ان میں گوپال بھی تھا۔

گوپال کی تالیوں کا جواب روزی نے اس طرح دیا کہ اس نے اس کی طرف ایک بوسہ لہرا دیا۔روزی کی بوسہ لہرانے والی ادا کو اس غیر ملکی سیاح نے دیکھ لیا جس کے ہاتھ کو گوپال نے دبایا تھا اور وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ روزی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

"شیور بے بی، شیور!"اس نے اٹھتے ہوئے روزی کی طرف بانہیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

روزی اچنبھے میں پڑ گئی کیونکہ اس نے اشارہ تو گوپال کی طرف کیا تھا۔

'سوری! وہ کہتی ہے،"میرا مطلب اس کی طرف ہے۔یہ میرا بوائے فرینڈ ہے۔

''کون؟''غیر ملکی سیاح پوچھ بیٹھا،''یہ بلاڈی انڈین؟''
جب گوپال نے یہ سنا تو اس تگڑے موٹے تازے ملاّح کی گردن کے پٹھے کو پکڑ لیا اور اس نے ایک مکا رسید کیا۔
وہ غیر ملکی سیاح بھی تگڑا تھا، اٹھا کھڑا ہوا اور اس نے جوابی حملہ کیا۔ دونوں میں خوب لڑائی ہوئی، خوب گھونسے چلے۔ آخر کار غیر ملکی سیاح کا سانس پھول گیا اور اس نے اپنی ہار مان لی۔ پھر شراب پیے ہوئے سیاح نے معافی مانگی اور بار بار کہا،''سوری برادر، تم میرے بھائی ہو۔ تم ہرگز بلاڈی ہندوستانی نہیں ہو سکتے۔''
آخر کار گوپال نے روزی کو ڈریسنگ روم میں آنے کو کہا۔ روزی مسکرا کر اس کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ڈریسنگ روم میں آ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ روزی گوپال کے کندھے سے لگ گئی اور اپنی بانہوں کا ہار گوپال کے گلے میں ڈالتے ہوئے بولی،''گوپال، مائی ڈارلنگ!''
جب وہ گوپال کے گلے میں بانہیں ڈالنے لگی تو اس نے دیکھا کہ گوپال کی قمیض کندھے سے پھٹی ہوئی ہے۔
'اپنی شرٹ تو دیکھو، وہ اشارہ کرتے ہوئے بولی،''بیچارہ۔ کوئی بیوی نہیں پھٹے ہوئے شرٹ کو رفو کرنے کے لیے۔ آؤ میں تمھاری قمیض کو سی دوں گی''۔ روزی ناچ، گانے کے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے سے سوئی، دھاگا اٹھاتی ہے اور گوپال کی پھٹی ہوئی قمیض کو سینے لگتی ہے۔
گوپال کو روزی کا انداز اچھا لگا لیکن اس نے آہ بھر کر کہا،'میری زندگی کے لباس میں بہت سے بخیے اُدھڑے ہوئے ہیں روزی! آخر تم کس کس کو رفو کرو گی؟''
روزی گوپال کی قمیض کے ادھڑے ہوئے بخیے کو سوئی سے سی دینے کے بعد اس کے قریب آ گئی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ اس وقت ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ مدہوشی کے عالم میں روزی کی آنکھیں اس وقت بند تھیں۔ اونچی ایڑی کا جوتا اس نے پیروں سے گرا دیا۔ اب گوپال کے ہاتھ نے روزی کے فراک کے زپ کو کھولنا شروع کر دیا اس سے پہلے کہ گوپال پوری زپ کھولے روزی نے کہا،''گوپال، مجھے اپنی بیوی بنا لو تا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ تمھاری دیکھ بھال کر

سکوں۔''

شادی کے نام پر گوپال کھنچ سا گیا جیسے اس کو جال میں پھنسایا جا رہا ہو۔ ادھ کھلے زپ پر گوپال کے ہاتھ رک گئے۔ ٹھیک اسی وقت ڈوک کا سائرن زور سے بجنا شروع ہوا۔ سائرن کی تیز آواز سے روزی چونکی اور گوپال کو اچھا بہانا مل گیا وہاں سے کھسک جانے کا۔

گوپال نے فراک کے زپ کو پھر اوپر چڑھا دیا۔ روزی کی بانہوں سے اپنے آپ کو الگ کرتے ہوئے گوپال نے روزی کے گال کو تھپتھپایا اور بولا، ''کسی اور وقت سہی بے بی۔ میری نائٹ شفٹ کا وقت ہو چکا ہے۔''

اور گوپال، سسکیاں بھرتی روزی کو چھوڑ کر اکڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ روزی نے اپنے آپ کو کپڑوں کے ڈھیر پر پٹک دیا مایوس ہو کر وہ ہچکیاں لینے لگی۔

○

میم صاحب

ڈوک سے آج پھر کوئلہ اتارا جا رہا تھا۔ کوئلہ اتارنے والے مزدوروں میں گوپال بھی تھا جو ایک بہت بڑی ٹوکری میں کوئلہ بھر بھر کر ایک ٹرک میں ڈال رہا تھا۔ جیسے ہی وہ ٹوکری کا کوئلہ ٹرک میں ڈال کر مڑا تو ایک دم بھونچکا سا رہ گیا۔

سامنے سفید بلاوز اور سفید ساڑی پہنے ایک نوجوان خوب صورت لڑکی بکھرے ہوئے کوئلے کی کالی زمین پر چلی آ رہی ہے۔ کالی زمین پر وہ لڑکی ایسی لگ رہی تھی جیسے ریگستان کی ریتیلی زمین پر کمل کا پھول کھل اٹھا ہو۔

لڑکی بڑے اطمینان سے آگے بڑھی چلی آ رہی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ ایک طرف 'خطرہ کرین سے ہوشیار' کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ اس نے تو صرف اتنا دیکھا کہ کالا بھسنڈ ایک مزدور اپنے ہاتھ کے اشارے سے جلدی جلدی اپنی طرف آنے کو کہہ رہا ہے۔ وہ اس آدمی کا اشارہ نہ سمجھ سکی۔ اتنے میں ایک دوسرے مزدور نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ زمین پر گر گئی۔ وہ کالا مزدور بھی اس کے اوپر گر گیا۔ یہ مزدور کوئی اور نہیں گوپال تھا۔

اس کا کالا چہرہ، اس کے کالے کالے ہاتھ، اس کا کالا جسم، کمر تک ننگا، اس کے گندے اور گھناؤنے کپڑے۔ لڑکی اس کے منہ پر تھپڑ مارنے ہی والی تھی کہ اس نے دیکھا کرین کا بڑا خوفناک

جبڑا اس جگہ آ کر گرا جہاں سے گوپال نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تھا۔

کرین نے اس جگہ اپنا جبڑا کھول کر کئی من کوئلہ اگل دیا۔

کچھ پل کے لیے وہ خوب صورت لڑکی اور کالا بھسنڈ گوپال زمین پر ایک دوسرے کی بانہوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ گوپال کے دماغ میں ایک خوشبو گھسی چلی جا رہی تھی، جو شاید لڑکی کے بالوں میں لگے ہوئے خوشبودار تیل کی تھی یا پھر لڑکی کے جوان جسم کی۔ اور سفید ساڑی والی لڑکی کو ایک مرد کے پاس سے کوئلے کی گرد اور پسینے کی بو آ رہی تھی اور اس کی سانس کی گرمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

اب وہ اٹھا اور تیزی سے اس لڑکی کو اٹھایا۔ لڑکی کے سفید ہاتھوں پر، بازوؤں پر اور اس کے سفید کپڑوں پر کالے دھبے پڑ گئے تھے یہاں تک کہ اس کا چہرہ بھی کالا ہو گیا تھا۔

لوگ۔ مزدور، کلرک، سپروائزر، امر، رنجیت ادھر ادھر سے دوڑ پڑے۔

ان لوگوں کے قریب آنے سے پہلے ہی گوپال نے لڑکی سے کہا، ''اے میم صاحب، مرنا ہے تو اپنے گھر میں زہر کھا کر مرو۔ یہاں کیسا جھک مارنے آئی ہو؟''

''تم بڑے بدتمیز ہو جی۔ اتنا بھی نہیں جانتے شریف لڑکیوں سے کس طرح بات کرتے ہیں؟''

اس کی آنکھوں نے لڑکی کے جسم کی طرف دیکھا جو کپڑوں کے اندر سے نمایاں ہو رہا تھا، ''کپڑوں کے پردے میں سب لڑکیاں ایک ہی جیسے ہوتی ہیں۔ میم صاحب!''

اس سے پہلے کہ لڑکی کچھ جواب دے سکے، مزدور لوگوں نے انھیں گھیر لیا۔ اس لڑکی سے سب بڑی عزت سے پیش آئے۔

امر نے کہا، ''شاباش گوپال، تم نے بڑی ہوشیاری دکھائی۔''

لیکن دوسرے بھی ساتھ ہی بول اٹھے، ''مس صاحب، چوٹ تو نہیں لگی؟''

''مس صاحب، اس وقت تو بھگوان نے آپ کو بچا لیا......''

'مس مالتی، رنجیت بولا، آپ خیریت سے تو ہیں؟ مالک کو میں نے خبر بھجوا دی ہے، وہ آتے ہی ہوں گے۔''

اب گوپال کو معلوم ہو گیا کہ اس لڑکی کا نام مالتی ہے اور جس کمپنی میں وہ کام کرتا ہے اس

کے مالک سے اس کا گہرا تعلق ہے۔
ٹھیک اسی وقت ایک خوب صورت کار بڑی تیزی سے وہاں آ کر رکی۔
لگ بھگ پچالیس برس کی عمر کا آدمی۔ جو کالا سوٹ پہنے تھا جس کے بال اور مونچھوں کا رنگ کھچڑی جیسا تھا، جس کے چہرے سے ہوشیاری ظاہر ہوتی تھی — اور جس کے چشمے کے سنہرے فریم کے پیچھے سے مکار آنکھیں نظر آ رہی تھیں...... ایک چھڑی کی مدد سے گاڑی سے اترا اور تیزی سے مالتی کے قریب آیا......

''سلام مالک!''

''نمستے مالک!''

مزدوروں نے سلام کیا اور پیچھے ہٹ گئے۔
وہ مالتی کے پاس آیا اور اسے گلے سے لگالیا۔
''بھگوان نے بڑی مہربانی کی ہے بیٹی کہ تمھاری جان بچ گئی — (مزدوروں سے) — چلو — اپنا کام کرو — (کرین آپریٹر سے) کرین بھی چالو کرو، کام بند نہیں ہونا چاہیے — امر، چلو اپنے دفتر میں — (مالتی سے) چلو بیٹی — رنجیت، تم بھی آؤ میرے ساتھ۔''
مالتی کار میں بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہوئے اس نے پیچھے پلٹ کر گوپال کی طرف دیکھا — پھر وہ آدمی بھی کار میں بیٹھ گیا اور رنجیت ڈرائیور کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
اپنے پیچھے گرد کا غبار چھوڑتی ہوئی کار وہاں سے چل دی۔
لیکن گوپال اسی جگہ کھڑا رہا اور اس کار کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اس کوئلہ کمپاؤنڈ سے باہر نہیں چلی گئی۔ پھر وہ کوئلہ ڈھونے کے لیے کوئلے کے ڈھیر کی طرف چل دیا۔
امر اس کے پیچھے چلاتے ہوئے دوڑ کر آیا: ''گوپال! او گوپال!!
''کیا ہوا، امر بھیا؟ تم تو ایسے چلا رہے ہو جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو!''
''یہی سمجھو — بابو بھائی نے تمھیں بلایا ہے۔''
''بابو بھائی!''
''ہاں بھئی، بابو بھائی — ہمارے مالک جو ابھی ابھی اپنی بھتیجی کو لینے آئے تھے۔''

''تو وہ چھوکری ان کی بھتیجی تھی!''

''ہاں بھئی، مگر اب جلدی کرو۔ مجھے حکم ملا ہے کہ تمھیں اسی وقت جیپ میں بھیجوں۔''

''لگتا ہے، بھتیجی نے میری شکایت کر دی ہے؟۔۔۔احسان فراموش کہیں کی۔۔۔ایک تو سالی کی جان بچائی.....''

''دیکھ گوپال، مالک کے پاس جانا ہے تو زبان سنبھال کر بات کرنا......!''

''اور اگر میں نہ جاؤں تو؟''

''جب بابو بھائی کسی کو بلاتے ہیں تو وہ انکار نہیں کر سکتا۔''

ایک جیپ تیزی سے بیلارڈ اسٹیٹ بلڈنگ کے سامنے آکر رکی اور اس کے بریک لگانے کی آواز آئی۔

گوپال نیچے کود گیا۔

رنجیت اس کا انتظار کر رہا تھا۔اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

''بڑی دیر لگا دی تم نے؟''اس نے اعتراض کیا،''مالک اب اور بگڑیں گے۔چلو میرے ساتھ!''

وہ بلڈنگ میں چلنے لگے۔

بابو بھائی کے دفتر کے لیے کوری ڈور سے گزرتے ہوئے وہ ایک کمرے کے سامنے پہنچے جس کے دروازے پر پیتل کی ایک پلیٹ پر'بابو بھائی' لکھا ہوا تھا۔

رنجیت نے دروازے کی طرف اشارہ کیا،''جاؤ اندر۔''

''میں؟ اکیلا؟''گوپال کچھ گھبرایا۔

''چلو جی''، گوپال نے ہمت کر کے کہا،''زیادہ سے زیادہ مالک سالا نکال ہی تو دے گا!''

پھر اس نے اپنے منہ کو لگام دی تاکہ منہ سے کوئی گالی نہ نکل سکے اور اس نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر چلا گیا۔

بابو بھائی کا آفس ایک ڈکٹیٹر کے آفس کی طرح تھا۔

وہ اس کمرے کے آخری کنارے پر بیٹھا تھا تا کہ دوسرے آدمیوں کو مالک تک پہنچنے کے لیے لمبا راستہ طے کرنا پڑے۔ اسی دوران بابو بھائی آنے والوں کا جائزہ لے سکتا تھا۔

گوپال نے ڈرتے ہوئے اس کے پاس جا کر سلام کیا۔

گوپال کو پریشان کرنے کے لیے بابو بھائی میز پر رکھے ہوئے کاغذوں کو دیکھنے لگا تا کہ گوپال انتظار کر سکے اور یہ جان سکے کہ اس کو کیوں بلایا گیا ہے؟ گوپال نے ایک دو بار کھانس کر مالک کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

آخرکار بابو بھائی نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا، ''کیا تمھیں سردی لگ گئی ہے؟''

''نہیں صاحب۔''

''کھانسی؟ برون کائٹس؟ یا دمہ؟''

''نہیں صاحب۔''

''پھر تم کھانس کیوں رہے ہو؟''

''میں معافی چاہتا ہوں صاحب۔''

اس کے بعد بابو بھائی نے جو کہا تو گوپال کو اطمینان سا ہوا، ''ہم تمھارے احسان مند ہیں کہ مالتی کی جان بچانے کے لیے تم نے اتنا کچھ کیا ہے۔ لگتا ہے تم بہت بہادر ہو؟''

''میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں مس مالتی جی کے کام آیا۔''

''ہم نہیں چاہتے کہ تم جیسا سمجھدار آدمی بوجھ اٹھا اٹھا کر اپنی زندگی برباد کرے۔ یہ تو قلیوں کا کام ہے۔ ہم تم کو ایک ہلکا مگر ذمہ داری والا کام دیں گے اور تمھاری پگار بھی دوگنی ہو جائے گی۔ کہو منظور ہے؟''

''ہاں صاحب، پگار ڈبل ہو جائے گی تو میں آپ کے ہر ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔''

''تم میرے لیے نوکری نہیں کرتے۔ کمپنی کے لیے کرتے ہو۔ اور کمپنی کیا ہے؟ یہ مزدور ہیں تم جیسے۔ تم لوگ ہی کمپنی ہو۔ کل سے تم سپروائزر رہو۔ تم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ مزدور کام کرتے رہیں اور وقت برباد نہ کریں۔''

''آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گا صاحب۔''

''ایک بات اور، آج ہم کو جہاز پر سے اناج اتارنا ہے۔ اناج کے ان چوروں سے ہوشیار رہو جو ہماری سرکار کو اور غریب جنتا کو اس اناج سے محروم کرتے ہیں۔ بے ایمانی ایک بیماری ہے جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ تم کو اسپیشل بونس دیا جائے گا اگر تم کسی اناج چور کو پکڑو گے۔''

''میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا صاحب۔''

''مجھے معلوم تھا۔'' ہاں، تو اب تمھیں یہ منظور ہے؟ جب ضرورت ہوا کرے گی رنجیت تمھیں ہمارا حکم سنا دیا کرے گا، اب تم جا سکتے ہو۔''

''شکریہ صاحب، بہت بہت شکریہ۔ آپ کو نہیں معلوم صاحب مجھے کتنی خوشی ہوئی یہ سب جان کر۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ برخواست کر دیا جاؤں گا۔''

''لیکن تم نے ایسا کیوں سوچا؟''

''میں سمجھا مس مالتی نے میری شکایت کی ہوگی۔ آپ جانتے ہیں صاحب، میں نے ان کو زمین پر گرا دیا تھا۔ ایک ہی طریقہ تھا ان کو کرین کی زد سے بچانے کا۔''

''میں جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا۔ میں نے مالتی سے کہہ دیا ہے جب کبھی وہ ڈوکس میں گھومنا چاہے۔ وہ تم کو گائڈ کی حیثیت سے لے جائے، کہو کیا خیال ہے؟''

''نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' گڑبڑا کر اس نے کہا، ''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے صاحب۔ میرا مطلب ہے میرے لیے بڑی عزت کی بات ہے۔''

اور پھر وہ نمسکار کرتے ہوئے باہر چلا گیا۔

بابو بھائی نے جاتے ہوئے گوپال کو کچھ اس طرح سے دیکھا جیسے اس نے کامیابی سے ایک جنگلی جانور کو اپنے بس میں کر لیا ہو۔ اپنا سونے کا سگریٹ کیس اٹھایا۔ ایک سگریٹ جلایا اور بڑے اطمینان سے اپنے منہ سے دھوئیں کا ایک بادل چھوڑا۔

O

چور سپاہی

ڈوک پر اناج کی بوریاں جہاز سے اتاری جارہی تھیں۔ مزدور پہلے تو اناج کی بوریوں کو ایک گودام کے پاس لاکر رکھتے تھے پھر ان کی گنتی ہوکر ان کو رجسٹر میں چڑھایا جاتا تھا، پھر وہ بوریاں ٹرکوں میں بھری جارہی تھیں۔

یہ کام رات کو ہو رہا تھا لیکن وہاں رات کا اندھیرا نہیں، دن کی روشنی ہو رہی تھی کیونکہ بڑے بڑے بجلی کے لیمپ جل رہے تھے۔

یہ سب کام رنجیت کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ گوپال ٹرک کے اوپر کھڑا کھڑا بوریاں گن رہا تھا۔ رنجیت نے گوپال سے کہا،'ذرا ہوشیار رہنا کسی نے بوری میں چاقو مار کر کئی کیلو اناج دوپہر کو چرالیا ہے۔''

'فکر مت کرو' گوپال نے جواب دیا،'' میں چوروں پر کڑی نظر رکھوں گا۔ سیٹھ صاحب نے مجھے اسپیشل بونس دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

دو مزدوروں اناج کے ایک بورے پر کراس (X) کا نشان دیکھا اور ایک دوسرے کی طرف آنکھ ماری۔

ٹرک کے اوپر بوریوں کو رکھتے ہوئے مزدوروں نے رنجیت سے کہا،'' ہوشیار رہنا، اس بوری کو سب سے اوپر رکھو۔''

''کیوں؟'' گوپال نے پوچھا: ''کیا اس بوری میں سونے کے دانے بھرے ہیں؟''

''زیادہ سوال مت کرو''، رنجیت نے کچھ سخت ہو کر کہا: ''بس اتنا یاد رکھو یہ سیٹھ صاحب کا حکم ہے۔ اگر تمھیں ڈبل پگار لینی ہے تو اپنا منہ بند ہی رکھو۔''

گوپال نے زیادہ سوال جواب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اناج سے بھرے ہوئے ٹرک ڈوک کے گیٹ سے گزر رہے تھے۔

اب وہ ٹرک سڑک پر دوڑ رہے تھے۔

ایک ٹرک کے اوپر گوپال بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مچھلی پکڑنے کا ایک کانٹا اور ڈور تھی۔

اس کے آگے والے ٹرک کے اوپر بیٹھا ہوا ایک مزدور زور سے بولا: ''ارے گوپال، کیا تم مچھلی پکڑنے جا رہے ہو؟''

''ہاں میرے دوست! ایک بہت بڑی مچھلی۔''

ٹرک چلے جا رہے تھے۔

چلتے ٹرک کے اوپر بیٹھے گوپال نے محسوس کیا کہ ٹرک کے پیچھے کوئی بھاگ رہا ہے۔

ایک مچھلی پکڑنے والے کی طرح گوپال نے اپنی ڈور پھینکی۔

ڈور میں لگا ہک گرا اور اندو کی ساڑی میں الجھ کر رہ گیا جو ہمیشہ کی طرح چلتے ٹرکوں میں لدی اناج کی بوریوں میں چاقو سے سوراخ کر کے اناج چراتی تھی۔

گوپال نے ڈور کو کھینچا ہک پھنس چکا تھا۔

'اب میں نے چور پکڑ لیا ہے''، اس نے اپنے آپ سے کہا اور زور سے کھینچا۔

اندو نے محسوس کیا اس کی ساڑی کندھے سے پھسلتی جا رہی ہے۔ جب اس نے اپنی ساڑی کے پلّو میں پھنسے ہوئے ہک اور اس میں لگی ڈور کو دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ آج وہ پکڑی گئی۔

لیکن ساڑی پرانی اور پھٹی ہوئی تھی۔

جب گوپال نے ڈور کو سختی سے کھینچا تو ساڑی پھٹ گئی اور اندو آزاد ہو گئی۔

وہ بھاگنے لگی۔

گوپال نے ٹرک رکوایا، اوپر سے نیچے کودا۔

اندو گہری پرچھائیوں کی طرف بھاگی— اب وہ اتنی دور تک بھاگ چکی تھی کہ ایک پرچھائیں بن گئی تھی۔

گوپال اس سائے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

آخرکار گوپال نے اس کو پکڑ لیا— اندو کے آگے گودام کی دیوار تھی۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

گلی میں لیمپ— پوسٹ کی روشنی میں اس نے 'چور' کو دیکھا— یہ ایک لڑکی تھی— گندی، غریب لیکن خوب صورت۔

''کون ہو تم؟'' گوپال نے چلّا کر پوچھا۔

''میں اندو ہوں صاحب''، اس نے ڈرتے ڈرتے بڑے بھولے انداز میں جواب دیا، ''میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گی۔''

''لیکن اس دوپہر کو بھی تو نے اناج چرایا تھا— بول چرایا تھا کہ نہیں؟''

''ہاں صاحب، چرایا......لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''میرے باپ نے سب کچھ لے لیا اور اسے بیچ دیا دارو خریدنے کے لیے۔''

''اچھا تو اس لیے دوبارہ چرانا چاہتی ہو۔''

''ہاں صاحب......بات یہ ہے، کل رکھشا بندھن ہے مجھے راکھی خریدنی ہے اپنے بھائی کو باندھنے کے لیے......اور پیڑے بھی تو لینے ہیں۔

''چھوکری بری نہیں''، اس کی طرف آگے بڑھتے ہوئے اس نے سوچا۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھا، اپنی کلپنا میں کیا دیکھتا ہے کہ اندو کے چیتھڑوں میں لپٹی مالتی اس کے سامنے کھڑی ہے۔

گوپال کہہ رہا تھا، ''جانتی ہو اگر ہم فلم میں ہوتے اور ایسی کالی رات میں ویلن تمھیں ایسی ویران جگہ دیکھ لیتا......''

''لیکن صاحب''، اندو نے دیوار کی طرف سرکتے ہوئے جواب دیا، ''میں جانتی ہوں آپ ویلن نہیں ہیں— آپ ہیرو ہیں— اصلی ہیرو—''

''اصلی ہیرو......میں......میں.....'' گوپال نے ہنسنا شروع کیا۔ اس نے اندو (جو اس وقت اسے مالتی نظر آ رہی تھی) کو پکڑ لیا۔

اسی وقت پولیس کی سیٹی سنائی دی۔ وہ جھٹ سے اپنے تصور سے لوٹا تو محسوس کیا وہ مالتی نہیں اندو تھی— اور اب تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

پولیس!

دونوں چونک اٹھے۔

گوپال نے اندو کو اندھیرے میں ڈھکیل دیا— اب وہ نظر نہیں آ سکے گی۔

وہ پیچھے پلٹا اور ایک شرابی کا روپ دھار لیا۔ کچھ گنگناتے ہوئے آگے کی طرف لڑکھڑانے لگا۔ سیدھا جا کر لیمپ پوسٹ سے بھڑ گیا جا کر اس پر اپنا سر مارا۔

سامنے سے ایک حوالدار آیا۔ اسے غور سے دیکھا پھر اطمینان کا سانس لیا کہ کوئی چور، ڈاکو یا اسمگلر نہیں بلکہ ایک شرابی ہے جو لیمپ پوسٹ کو اپنے سامنے سے ہٹ جانے کو کہہ رہا ہے۔

حوالدار صاحب،' گوپال نے مراٹھی میں کہا،'اس آدمی سے کہو کہ میرے سامنے سے ہٹ جائے۔''

حوالدار مسکرایا اور گوپال کو کندھے سے پکڑ کر لیمپ پوسٹ کے سامنے سے ہٹا دیا۔

''لے ہٹا دیا، اب ٹھیک ہے نا؟'' حوالدار نے پوچھا۔

''ہاں''، اب گوپال گجراتی بولنے لگا'' بدھو سارو چھے''

وہ آگے کی طرف لڑکھڑایا— ایک پنجابی گانا گنگنانے لگا۔

حوالدار خوش بھی ہوا اور تعجب بھی کرنے لگا— پہلے مراٹھی اور پھر گجراتی اور اب پنجابی— کیا یہ پئے ہوئے ہے یا میں پئے ہوئے ہوں؟

گوپال راستے کی پرچھائیوں میں سے غائب ہو گیا تھا۔

حوالدار گشت کرنے دوسری طرف چلا گیا۔

اندو نے، جو اندھیرے کے پیچھے سمٹی کھڑی تھی، اطمینان کا سانس لیا اور گوپال کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

○

ہیلو، مس مالتی

گوپال صاف ستھری جیکٹ اور سلیکس پہنے اور ٹوپی کو بڑے البیلے طریقے سے لگائے ہوئے استقبال کر رہا تھا۔

''ہیلو، مس مالتی!'' وہ ٹوپی اتار کر کہتا ہے۔

''انگریزی نہیں بولتی؟'' جواب نہ پاکر پوچھتا ہے،''پارلی وائس فرانچائز؟''

''آپ ہندی تو بولتی ہوں گی؟''

وہ اس سوال کو پنجابی، مراٹھی، گجراتی، تمل، کنڑ بھاشاؤں میں دہراتا ہے۔

اب ہم گوپال کو اس کے خالی کمرے میں اس کے تصور کی مالتی سے بات کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

لیکن وہاں اس کی پرانی محبوبائیں موجود ہیں۔ فلم اسٹاروں کی تصویریں اور بے ہنگم ماڈلس کی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی ہیں۔

''تم سب جلتی ہو''، گوپال ان تصویروں سے کہتا ہے۔

پھر ٹوپی پہن کر کہنے لگتا ہے،''ہم مس مالتی کو ڈاکس کی سیر کرانے جاتا ہے— سمجھی؟ جلنے والے جلا کریں۔''

اور آنکھ مار کر 'بائے بائے ڈارلنگ' کہتا ہوا تیزی سے کمرے سے نکل جاتا ہے اور زور سے کمرے کا دروازہ بند کر لیتا ہے۔

'شپ یارڈ' کا کلرک امر اپنی میز پر بیٹھا ہوا مزدوروں کی حاضری لے رہا تھا اور ان کو ان کی پگار دے رہا تھا۔ کچھ مزدور کام نہ ملنے کی شکایت کر رہے تھے کہ وہ بے روزگار ہیں۔ امر انھیں تسلی دے رہا تھا، ان کی ہمت بڑھا رہا تھا کہ انھیں اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ انھیں سمجھاتے ہوئے وہ اپنی جیب سے تھوڑے پیسے نکال کر بھی ان کو دے رہا تھا۔

''بھئی کام تو نہیں دے سکتا۔ اس وقت یہ لے جاؤ۔ جب کام ملے واپس کر دینا۔''

گوپال کونے میں بیٹھا بیڑی پیتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا لیکن اس کو جلدی نہیں تھی۔ جب آخری مزدور چلا گیا اور امر اور وہ اکیلے رہ گئے تو وہ امر کے پاس آ کر بولا، ''تم سالے کیا حاتم طائی کے باپ ہو؟''

''کیوں گوپال؟ کیا ہوا؟''

چار سو روپلی تو تمھیں پگار ملتی ہے — اور اس میں سے بھی روز دو چار روپے ان مفت خوروں کو دیتے رہتے ہو؟''

''بھئی کبھی میں بھی ان کی طرح ہی بے کار اور مفت خور تھا۔ اب دو کتابیں پڑھ کر کلرک ہو گیا ہوں۔ مگر ہوں تو میں مزدور ہی۔ کیوں، تمھیں ان لوگوں سے ہمدردی نہیں؟''

''ہے بھی — اور نہیں بھی —— امر بھائی، اپن نے تو دنیا میں ایک ہی سبق سیکھا ہے — ہر ایک کو اپنی فکر کرنی چاہیے — دوسرے کی چنتا کی اور مارے گئے۔''

''ہاں بھائی تم کہہ سکتے ہو — سیٹھ نے تمھیں سپروائزر بنا دیا ہے نا! پگار بھی ڈبل کر دی ہے۔ لو لگاؤ انگوٹھا اور لو اپنی پگار۔''

اس نے رجسٹر اپنے سامنے رکھا پھر سیاہی لگا اسٹامپ پیڈ کھولا — گوپال نے اپنا انگوٹھا پیڈ پر رکھا۔ امر بولا، ''گوپال، کتنی بار کہا اتنی زبانوں سے گٹ پٹ کرتا ہے، دو چار لفظ لکھنا بھی سیکھ لے۔ مگر تو مانتا ہی نہیں۔''

اسٹامپ پیڈ پر انگوٹھا دباتے ہوئے گوپال نے جواب دیا، ''چھوڑو بھی امر بھیا۔ بوڑھے

طوطوں نے کبھی پڑھنا لکھنا سیکھا ہے وہ تو بول ہی سکتے ہیں۔''

یہ بات مالتی اور رنجیت نے سن لی جو ابھی دروازے سے اندر آئے تھے اور جن کو گوپال اور امر دیکھ نہیں پائے تھے۔

اپنے انگوٹھے کا نشان رجسٹر پر لگا کر (مالتی اس کو انگوٹھا لگاتے دیکھ رہی تھی) گوپال مالتی کی طرف پلٹا جواب اس کے سامنے ایسے کھڑی تھی جیسے کوئی لپکتا ہوا شعلہ — وہ خوش تھی۔ بھڑکیلے لباس میں وہ بہت سندر لگ رہی تھی۔

اس نے مالتی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے انگوٹھے کی طرف، جس پر سیاہی لگی تھی۔

وہ اپنی ہنسی نہیں روک سکی۔ اس نے گوپال کو نہیں پہچانا تھا۔

وہ بھی ہنسا۔

وہ بھی ہنسی۔

وہ پھر سے ہنسا۔

رنجیت کو ان دونوں کا ہنسنا اچھا نہیں لگا۔ وہ جل کر بولا، 'اے......!'

''جی رنجیت صاحب!''

سیٹھ صاحب کا حکم ہے کہ تم مس مالتی کو سارا ڈوکس ایریا گھماؤ گے۔''

''مگر رنجیت جی''، مالتی بیچ میں بولی، ''کا کا جی نے تو کہا تھا گوپال تمھارے ساتھ جائے گا!''

''گوپال ہی تو ہے یہ!'' رنجیت بولا، ''ویسے آپ کو اس بے وقوف کے ساتھ جانا پسند نہ ہو تو غلام حاضر ہے۔'' اس نے بڑے انداز سے جھک کر کہا۔

''تو گوپال یہ ہے؟ — میں تو سمجھتی تھی گوپال تو کالا کلوٹا ہوگا!'' آخرکار گوپال بول اٹھا —

''میری صورت پر نہ جائیے مس صاحب — میرے کرتوت سب کالے ہیں۔'' مالتی اپنی ہنسی روک نہ سکی۔

اب گوپال مالتی کو ڈوکس پر گھما رہا تھا۔ پہلے پیدل پھر جیپ میں۔

''گوپال تم جیپ چلا سکتے ہو۔ مگر اپنے دستخط نہیں کر سکتے؟''

''مس صاحب ڈوکس میں کام کرنے سے پہلے میں ایک میکینک کا اسسٹنٹ ہوا کرتا تھا۔

موٹر چلانا سیکھ گیا۔ اگر کسی ماسٹر یا ماسٹرنی کا اسسٹنٹ ہوتا تو قلم چلانا بھی سیکھ جاتا۔

''مگر زبان چلانا تو خوب جانتے ہو......''

''زبان چلانا۔ باتیں بنانا۔ یہ کام میں ہر زبان میں کر سکتا ہوں۔ آپ بہت اچھی ہیں......چھوکری بچھد وسارو چھے......ہی ملگی فارسندر آ ہے۔''

''ارے واہ۔ تم تو چلتا پھرتا اکھل بھارتیہ بھاشا سمیلن ہو!''

''مس صاحب، ڈوکس پر ہر جگہ کے لوگ کام کرتے ہیں۔ سب کی بولی کے دو۔ دو چار۔ چار شبد سیکھ لیے۔''

''کوئی غیر ملکی زبان بھی آتی ہے؟''

''لیس لیس......نو......نو......ہیلو سر واٹ یو وانٹ؟ واٹ بلاڈی کنٹری یو کم فرام! آئی اسپیک گڈ گڈ انگلش، نو تھینک یو سر......مرسی میڈم......وولے پارلی فرانچائز......''

مالتی ایک دم ہنس پڑی۔

''بے وقوف......وے پارلی فرانچائز نہیں پارلی وائس فرانسائز۔''

''میں بھی تو اناڑی ہوں مس صاحب......'' وہ بولا۔

پھر دونوں ہی ہنس پڑے۔

اب وہ ڈوکس کے کنارے پر کھڑے تھے۔

ان کے آگے بندرگاہ تھی۔ اور پھر نیلا سمندر۔

دور دراز کے بڑے بڑے جہاز ڈوکس میں کھڑے تھے۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈوکس کا علاقہ اتنا بڑا ہے۔ میں تو بچپن سے کاکا جی سے کہتی تھی، مجھے ڈوکس دیکھنے کا بہت شوق ہے، مگر ان کو کبھی فرصت نہیں ملتی۔ سنا ہے بچپن میں میرے والد مجھے کندھے پر بیٹھا کر یہاں لایا کرتے تھے......چار پانچ برس کی تھی تو میرے والد اور والدہ دونوں چھوڑ کر چلے گئے......''

گوپال نے تعجب سے پوچھا، ''تمھارے پتا کندھے پر بیٹھا کر لاتے تھے......اتنے بڑے سیٹھ ہو کر؟''

''میں تو چھوٹی تھی......مگر سنا ہے وہ اتنے بڑے سیٹھ نہیں تھے۔ ڈوکس میں کام کرتے کرتے اپنی کمپنی بنالی تھی......آج مجھے یہاں آکر ایسا لگا جیسے وہی مجھے یہاں لے کر آئے ہیں۔''

وہ اپنے والد کی یادوں میں کھوئی تھی کہ اچانک موٹر کے تیز ہارن نے اس کے خیالوں میں خلل ڈال دیا۔

مالتی اور گوپال نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

وہ رنجیت تھا جس نے ابھی ابھی گاڑی میں بریک لگائے تھے۔ گاڑی رکنے پر وہ نیچے اترا۔

'مس مالتی، شکر ہے آپ مل گئیں۔ سیٹھ صاحب آپ کی بڑی چنتا کر رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے ہر طرف، ہر جگہ دیکھا۔ گوپال، تم یہیں ٹھہرو۔''

مالتی سمجھانے لگی، ''اس میں گوپال کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں خود سارا ڈوکس ایریا دیکھنا چاہتی تھی......آؤ چلیں۔''

وہ جیپ میں سامنے والی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔

''تم کیا سوچ رہے ہو گوپال؟'' وہ پوچھنے لگی، ''کیا تم نہیں آرہے ہو؟''

''اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ پیدل واپس جا سکتا ہے۔''

اور رنجیت نے جیپ کو ایکدم تیز کر دیا۔

گوپال وہاں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرایا۔ اس کے ہونٹوں سے 'ولے پارلی فرانچائز' لفظ پھڑ پھڑانے لگے۔ پھر اس نے ایک پتھر اٹھایا اور دور پانی میں پھینکا — پتھر ڈوب گیا اور اپنے پیچھے کئی بلبلے چھوڑ گیا۔

○

گرو منتر

بابو بھائی اور مالتی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے اور چاندی کی تھالیوں میں شام کا کھانا کھا رہے تھے۔
بابو بھائی مالتی سے ڈوکس پر گھومنے کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔
''اچھا تو مالتی ڈوکس پر جانے کی تمھاری خواہش تو پوری ہوگئی؟''
''ہاں کاکاجی۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتی تھی جہاں کبھی میرے والد صاحب کام کرتے تھے۔''
''بہت پرانی بات ہے اور اب تو سب لوگ تمھارے والد صاحب کو ایک کنٹراکٹر کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔ کمپنی کے مالک جنھوں نے اپنی کمپنی کی بنیاد رکھی تھی۔''
''لیکن میں جانتی ہوں کبھی انھیں ڈوکس میں والد صاحب ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ گوپال کی طرح۔''
''ارے وہ گوپال؟ وہ بڑا ہوشیار نوجوان ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ٹریڈ یونین ڈنین کے چکر میں نہیں پڑتا۔ وہ ان کا وفادار ہے جو اس کو روپیہ دیتے ہیں۔ میں نے اس کو سپروائزر بنادیا ہے اور بھی اوپر جاسکتا ہے۔ تم نے اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی؟''
''مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اتنا ہوشیار ہے، اتنی زبانوں میں بات کرسکتا ہے لیکن اپنے نام کے دستخط نہیں کرسکتا!''

''ہاں، یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تگڑے لیکن دماغ نہیں۔''

''ان کو عقل کیسے آسکتی ہے جب ان کو تعلیم ہی نہ دی گئی ہو؟'' اور پھر بولی: ''کاکاجی، اب میں نے تو اپنی تعلیم پوری کر لی ہے۔ بیکار بیٹھنے سے کیا فائدہ۔ اگر میں ڈوکس کے مزدوروں کی بستی میں کوئی اسکول کھول لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟''

'ہوں'۔ بابو بھائی نے ایک پل کے لیے سوچا اور پھر بولے، 'کیوں نہیں؟ ہم کو مزدوروں کو خوش رکھنے کی ضرورت ہے تا کہ ان کو محسوس ہو کہ ہم ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ جب ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے مالک کی بھتیجی خود ان کے لیے اسکول چلا رہی ہے تو ہمارے بارے میں اچھا ہی سوچیں گے...... تھینک یو مائی ڈیئر! تمھارا خیال بہت اچھا ہے!''

سیلر بوائے بار—

گوپال ایک کونے میں ٹیبل پر بیٹھا پی رہا تھا۔ اب تک کئی بار پی چکا تھا۔

روزی ناچ رہی تھی۔

لیکن گوپال کی پی ہوئی آنکھوں سے لگتا تھا یہ مالتی ہے جو ناچ رہی ہے اور اس کو پیار سے اشارے کر رہی ہے۔

ایک غیر ملکی سیلر آیا اور گرمجوشی سے اس کو پیچھے سے ایک دھپ لگا گیا۔ اچانک دھکا لگنے سے مالتی کی تصویر غائب ہوگئی اور گوپال کو اپنے سامنے روزی ناچتی ہوئی نظر آئی۔

گوپال منہ بنا کر بڑبڑایا، ''دھت تیری کی! سارا مزہ کرکرا کر دیا— اب مجھے اور پینی پڑے گی۔''

''تم نے کیا کہا!'' غیر ملکی سیلر نے پوچھا اور پھر خود ہی کہا، 'کوئی بات نہیں، میری طرف سے پیو— چلو۔''

اس نے گوپال کے سامنے ایک گلاس رکھا اور گوپال نے اسے حلق سے نیچے اتار لیا۔

مزدوروں کی بستی—

شراب میں دھت گوپال لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہہ رہے تھے یا گنگنا رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ضرور کسی کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔

اپنے کمرے میں داخل ہوکر اس نے لائٹ جلائی۔
نشے کی حالت میں دیوار پر لگی فلم اسٹاروں کی تصویروں کی طرف دیکھا اور آپ ہی آپ بولا،
''تم چلی گئی مس صاحب، اور مجھے سمندر کے کنارے کھڑا چھوڑ گئیں؟ اس لیے کہ میں دستخط نہیں کر سکتا؟''
پھر اس نے خود کو بستر پر گرا دیا اور گہری نیند سو گیا۔

اسکول کا گھنٹہ بج رہا تھا۔
بچے مزدوروں کی بستی سے بھاگ رہے تھے۔
ان میں فضلو چاچا کے گیارہ بچے بھی تھے۔
بچے اسکول آتے ہیں۔ اسکول بانس کی چٹائیوں سے بنا ہوا ہے۔
مالتی ٹیچر کی حیثیت سے کھڑی ہوئی تھی۔
بچے اس کو گھیرے ہوئے تھے۔
مالتی نے بچوں کو بیٹھنے کے لیے کہا۔
''بچو، پہلے ہم سب مل کر گائیں گے۔ پھر پڑھیں گے لکھیں گے۔''
سب بچے زور زور سے تالی بجاتے ہیں۔
مالتی 'اچک دانہ، بچک دانہ' ٹائپ کا گانا شروع کر دیتی ہے، جو گانا بھی ہے اور پہیلیوں کا ایک سلسلہ بھی۔
''یہ غیر محدود ہے۔''
''تم اس کا کنارا نہیں دیکھ سکتے۔''
''یہ ساری دنیا کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔''
''لیکن تم اسے پانی کے ایک پیالے میں بھی رکھ سکتے ہو۔''
''سمندر! سمندر!!'' سب بچوں نے ایک ساتھ مل کر جواب دیا۔

x x x

''یہ یہاں سے آتے ہیں۔''

"یہ وہاں سے آتے ہیں۔"

"یہ بھاری سے بھاری وزن لے جاتے ہیں۔"

"لیکن یہ پانی سے ہلکے ہوتے ہیں۔"

بچے چلا پڑے، 'جہاز! جہاز!!"

X X X

"ساری دنیا یہاں ہے۔"

"انگلینڈ، امریکا، فرانس۔"

"روس، چین، جاپان۔"

"لیکن وہ ہندوستان میں ہے۔"

بچوں نے مل کر کہا، ڈوکس! ڈوکس!!"

X X X

"وہ دن کو کام کرتا ہے۔"

"وہ رات کو کام کرتا ہے۔"

"وہ کبھی آرام نہیں کرتا۔"

"وہ پہاڑوں کو ہٹا سکتا ہے لیکن اپنی طاقت کو نہیں پہچان سکتا۔"

بچے اسے آسانی سے نہیں بتا سکے۔ ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ ایک آواز آئی، 'مزدور۔'

سارے بچوں نے، اوران کی ٹیچر نے پلٹ کر دیکھا۔

گوپال دروازے میں کچھ کتابیں اور سلیٹ لیے کھڑا تھا۔

بچے اتنے بڑے طالب علم کو دیکھ کر ہنسنے لگے اور گوپال جھینپ کر واپس جانے لگا لیکن مالتی کی آواز نے اسے روک لیا۔

"بیٹھو گوپال!"

گوپال کلاس کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا حالانکہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں بیٹھنا اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔

مالتی بلیک بورڈ پر 'آ' حرف ہے اور بچوں سے کہتی ہے کہ وہ اپنی سلیٹ پر لکھیں۔
مالتی نے ایک بچے کا ہاتھ پکڑ کر 'آ' لکھوایا۔
اب مالتی ایک جوان ہاتھ کو پکڑ کر..... گوپال کے ہاتھ کو، 'گا' لکھوا رہی تھی۔
اب کلاس ختم ہوگئی۔ آخر میں مالتی گوپال کی مدد کر رہی تھی کہ وہ اپنا نام لکھنا سیکھ لے۔
گوپال کو مالتی کی انگلیاں بجلی کی طرح چھو گئیں۔
''دیکھئے آپ مجھے ہاتھ نہ لگائیے۔'' گوپال نے اس سے درخواست کی۔
''کیوں؟ کیا تم اچھوت ہو؟''
''کیا معلوم؟ شاید اچھوت ہی ہوں۔ اپنا وقت بے کار نہ کیجیے مس مالتی مجھے لکھنا نہیں آئے گا۔''
''کیسے نہیں آئے گا؟'' دوبارہ اس نے گوپال کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی انگلیوں کو 'گوپال' لکھنا سکھانے لگی، ''سب سے پہلے اپنا نام لکھنا سیکھو یہی سب سے بڑا گرومنتر ہے۔''
گوپال نے اس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔
وہ سر کو جھکا کر اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔
''بچّوں کے ہنسنے کی پرواہ نہ کرو تم ہمارے گھر آ جایا کرو، جب بھی تمھیں فرصت ملے۔ میں وہاں تمھیں پڑھایا کروں گی۔''
''سچ مس مالتی!''
''ہاں!''
''میں پوچھ سکتا ہوں، کیوں؟''
''کیونکہ— کیونکہ تم نے میری جان بچائی ہے۔ کیا یہ ایک وجہ کافی نہیں ہے؟''
اس نے سر ہلایا، ''ہاں۔''

گوپال اپنے کمرے میں لکھنے کی پریکٹس کر رہا ہے۔
سلیٹ پر وہ 'گوپال' لکھ رہا تھا۔ گوپال— گوپال— گوپال۔

اس کے بوڑھے پڑوسی (فضلو چاچا) نے گوپال کو کام کرتے دیکھا تو پکارا: ''ارے او گوپال، اب سو جا تھوڑی دیر، رات کالی کرنی ہے کیا؟''

''ابھی سو جاؤں گا چاچا۔'' گوپال نے اس کو یقین دلایا لیکن سلیٹ پر لکھنا جاری رکھا۔۔۔

گوپال! گوپال!! گوپال!!!

اور پھر اس کے کان میں مالتی کی آواز سنائی دی:

''سب سے پہلے اپنا نام لکھنا سیکھ لو۔ یہی سب سے بڑا گرو منتر ہے۔''

O

دور اور پاس

رات کو۔۔

اناج سے بھرے ہوئے ٹرک آفس کے پاس آ کر رکے۔

ایک بوری میں سوراخ ہے اور اس میں سے اناج گر رہا ہے۔

رنجیت ٹرکوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کو پھٹی ہوئی بوری کا پتہ چلا تو وہ زور سے چلّایا،
''گوپال، ارے او گوپال! سو رہا ہے حرام زادے!''

رنجیت کی آواز کو سن کر گوپال ٹرک کے اوپر سے کود پڑا اور رنجیت کے سامنے آیا۔

''کیا کہا رنجیت بابو؟'' اس نے آستین چڑھاتے ہوئے پوچھا، ''ایک بار پھر کہو۔''

''ایک تو ڈیوٹی پر سوتا ہے۔ اوپر سے گھورتا ہے۔ میں کیا ڈرتا ہوں تجھ سے؟ حرامزادہ......
حرام......''

وہ دوسرا حرام زادہ ختم نہ کر سکا کیونکہ گوپال کا ایک طاقتور گھونسا اس کے چہرے پر پڑا۔
لیکن رنجیت خود بھی تگڑا تھا۔ دونوں میں گتھم گتھا لڑائی ہوئی۔

امر نے لڑائی کو روکنے کی کوشش کی اور چلّایا، ''گوپال! گوپال! رنجیت بابو! رنجیت بابو!''
لیکن ایک تیز آواز نے لڑائی کو روک دیا۔

''رنجیت!''

''گوپال!''

یہ سیٹھ بابو بھائی کی آواز تھی اور اس میں بجلی کا سا اثر تھا۔ دونوں نے لڑائی روک دی۔

''اب ہاتھ ملاؤ تم دونوں۔''

گوپال اور رنجیت نے جھینپ کر ہاتھ ملایا۔

'رنجیت! خبردار جو کبھی گوپال کو ہاتھ لگایا..... اور گوپال، دیکھو آئندہ ڈیوٹی پر نہ سونا۔ یاد رکھو یہ اناج ہماری بھوکی جنتا کا پیٹ بھرنے کو آتا ہے۔ اگر اس کو لوگوں تک پہنچنے سے پہلے چوروں نے ہڑپ کرلیا تو ہماری جنتا بھوکی رہ جائے گی۔ اب تم جاؤ اور سو جاؤ۔''

جب گوپال کچھ ہچکچایا تو بابو بھائی نے بڑی نرمی سے کہا،'' جاؤ، جاؤ۔ اور امر اب تم بھی گھر جاؤ آج ہم خود تمھاری جگہ کام دیکھیں گے۔''

جب وہ جانے لگتے ہیں تو گوپال نے احسان مند نگاہوں سے سیٹھ کو دیکھا لیکن امر کی نگاہوں میں شک اور شبہ بھرا ہوا تھا۔

ڈوکس کے احاطے سے گزرتے ہوئے گوپال نے کہا،'' یہ سیٹھ تو کمال کا آدمی ہے! کون اپنے کام کرنے والوں کا اتنا خیال رکھتا ہے؟''

''لیکن''، امر نے کہا،'' مجھے تو کچھ دال میں کالا محسوس ہوتا ہے۔''

''امر بھیا''، گوپال نے جواب دیا،'' تم تو بڑے ہی شکی مزاج ہو۔''

پھر ڈوکس کے آفس میں اسی رات کو—

اناج کی ایک بوری کو زمین پر اتارا گیا۔

سیٹھ بابو بھائی نے رنجیت سے کہا،'' بیوقوف کہیں کا تمھیں بھی گوپال سے آج کے دن ہی جھگڑا مول لینا تھا!''

جیسے ہی بابو بھائی اور رنجیت وہاں سے گئے اندود بے پاؤں اس بوری کے پاس آئی۔ اس

میں زور سے ایک چاقو مارا۔ اناج نیچے گرنے لگا تو اندو نے اپنی ساڑی کے پلّو میں اناج بھر لیا۔

اندو کا گھر—

اندو کے پھٹے ہوئے پلّو میں تین چار کیلو گیہوں بندھا تھا۔ اس کا شرابی باپ اس کا معائنہ کر رہا تھا۔

"اچھا تو آخر تجھے آج کچھ مل ہی گیا۔"

"ہاں بابا! ایک ہفتے کے لیے کافی ہوگا۔"

"نہیں صرف ساڑھے تین دن۔ اس کا آدھا تم گھر کے لیے رکھ لو اور آدھا میں بیچ دوں گا......"

"اور دارو خرید و گے؟"

"مجھ جیسے بوڑھے اور بیمار آدمی کو دارو تو چاہیے ہی۔" اس نے کہا اور اندو سے اناج چھین کر آدھا اناج اپنی قمیض میں بھر کر دارو کی دکان کی طرف بھاگ گیا۔

اندو اپنے بوڑھے باپ پر بڑبڑاتی رہ گئی۔

اگلے دن—

جھونپڑپٹی کی ایک چھوٹی سی دوکان میں دن کی روشنی میں رنگ برنگی راکھیاں جھلملا رہی تھیں۔ اندو راکھی خریدنے کے لیے آئی۔ آج وہ پہلے سے زیادہ صاف ستھری نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو کنگھی کر کے جمایا ہوا تھا۔ ایک گلاب کا پھول بھی اس کے بالوں میں لگا ہوا تھا۔ جتنی ساڑیاں اس کے پاس تھیں، ان سب میں اچھی ساڑی اس نے پہنی جو کم میلی اور کم پھٹی ہوئی تھی۔

راکھی خرید کر وہ جھونپڑپٹی کی گلی سے گزر رہی تھی اور امر کے جھونپڑے کے پاس آئی۔

"امر بھیا، بھیا!" اس نے پکارا، "جانتے ہو آج کون سا دن ہے؟"

"میری چھوٹی بہن آئی ہے تو......" امر نے جواب دیا، "رکھشا بندھن کا دن ہونا چاہیے۔"

وہ امر کی کلائی پر راکھی باندھ رہی تھی۔ اس وقت دروازہ کھلا اور گوپال داخل ہوا۔ اس نے لڑکی کو دیکھا، جس کی پیٹھ اس کی طرف تھی اور سمجھا، کہ اس کا دوست اپنی محبوبہ سے خفیہ ملاقات کر رہا ہے۔

''سوری امر بھیا!'' گوپال بول اٹھا، ''میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔''

امر نے ہنستے ہوئے کہا، ''یہ تو اندو ہے۔''

''اندو، یہ میرا دوست گوپال ہے۔''

اندو نے پلٹ کر گوپال کو دیکھا تو گھبرا سی گئی جس نے ایک رات اس کو اناج چراتے ہوئے پکڑ لیا تھا اور بغیر بندھی ہوئی راکھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔

یہ سب دیکھ کر پہلے تو گوپال حیران ہوا، پھر مسکرایا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' گوپال نے پوچھا۔

''یہ مجھے راکھی باندھنے آئی ہے۔ رکھشا بندھن کے دن بہنیں بھائیوں کے راکھی باندھتی ہیں۔ کیا تمھیں نہیں معلوم؟''

''میں کیا جانوں؟'' گوپال نے اپنی آواز میں کچھ تلخی سے کہا، ''میری کوئی بہن ہی نہیں ہے۔''

جب اندو نے امر کے راکھی باندھ دی تو امر نے اسے دو روپے کا نوٹ دیا۔

اندو باہر جانے کے لیے پلٹی، تو گوپال نے کہا، ''کیا میرے بھی راکھی باندھو گی؟''

اندو نے انکار کرتے ہوئے کہا، ''نہیں، میرے پاس ایک ہی راکھی تھی۔''

''تو تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟ کب ملے تم؟''

''کب ملے؟'' گوپال بول پڑا، ''ہم ملے جب وہ......اور میں......''

''مچھلی پکڑ کر......'' اندو نے کہا اور پھر وہ جھونپڑی سے بھاگ گئی۔

''یہ مچھلی پکڑنے کا کیا قصہ ہے؟''

تب گوپال نے امر کو بتایا کس طرح اس نے اندو کو ٹرک سے اناج چراتے ہوئے پکڑا تھا۔

امر بولا، ''ہاں، اس کا باپ لنگڑا ہے۔ بیساکھیوں کے سہارے سے چلتا ہے۔ ایک ایکسیڈنٹ میں اس کے پاؤں کچل گئے تھے۔ وہ مہینے میں ایک بار آتا ہے پچاس روپے کی پینشن وصول کرنے۔

مہینے بھر کی پینشن دو چار دن میں شراب پی کر اڑا دیتا ہے۔ اور پھر یہ کام اندو کو کرنا پڑتا ہے۔''
پھر گوپال کی طرف دیکھ کر بولا، ''لیکن تم نے اسے کیوں نہیں پکڑوا دیا؟ تمھیں ایک اسپیشل بونس مل جاتا کیا ہوتا اگر ایک غریب لڑکی پکڑی جاتی۔ تمھیں اسپیشل بونس نہیں چاہیے......''
''کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اس کی اتنی ضرورت نہیں امر بھیا! لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے سیٹھ صاحب کو اتنے سے اناج کی کیوں فکر لگی رہتی ہے؟''
''یہ بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آئی؟'' امر نے کہا۔

بابو بھائی کی گاڑی اسی بنگلے کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ گوپال اندر آیا، پوربی بھاشا میں چوکیدار سے بولا ''میرا نام گوپال ہووت ہے۔
''مس مالتی آپ کا انتظار کرت ہے۔'' چوکیدار نے کہا اور اس کو ایک دوسرے نوکر کے حوالے کر دیا، ''گوپال جی کو مس صاحب کے پاس لے جاؤ۔''
نوکر گوپال کو مکان کی طرف لے گیا جو شاندار طریقے سے سجایا ہوا تھا۔
ڈرائنگ روم سے ہو کر وہ ایک لفٹ کے پاس آئے۔ لفٹ ان کو تیسری منزل کے ٹیریس پر لے گئی۔
صبح سویرے سورج کی روشنی میں مالتی بینت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی چائے اور دوسری چیزیں، اخبار وغیرہ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ٹیریس پر ایک جھولا بھی پڑا ہوا تھا۔
''ہیلو گوپال!'' مالتی گوپال کا استقبال کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''تم جا سکتے ہو۔'' مالتی نے نوکر سے کہا، ''چائے اور بھجوا دینا۔''
''سلام مس صاحب!'' نوکر نے کہا اور چلا گیا اور پیچھے پلٹ کر گوپال کو دیکھتا گیا۔
''بیٹھ جایئے۔'' مالتی نے گوپال سے کہا۔
گوپال ادب سے بیٹھ گیا۔
''کہو گوپال، کل کا سبق یاد کیا؟''
''جی مس صاحب!''

''دکھاؤ۔''

اس نے اپنی نوٹ بک کھولی اور اسے دکھائی۔

اس نے بار بار ''گوپال! گوپال!'' کے دستخط کیے ہوئے تھے۔

''بہت اچھا پڑھنے کی مشق کرو۔ میرے ساتھ بولو۔''

پھر اس نے کتاب پڑھنا شروع کیا اور گوپال اس کے بعد دہراتا گیا۔

'''آ' سے آدمی — جیسے تم۔''

'''ب' سے بکری! جیسے......''

دونوں ہنس پڑے۔

'''ج' سے جلیبی — میں جلیبی کھاؤں گا!''

''تم میرا سر کھاؤ گے۔''

''ضرور کھاؤں گا!'' وہ ایک دم بول پڑا، پھر اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے کہا، ''شما کیجیے، مس صاحب!''

'''گ' سے گوپال!''

'''گ' سے گوپال — یعنی میں۔''

'''م' سے......'' وہ بولی اور رک گئی۔

'''م' سے......'م' سے......'م' سے...... مالتی۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بول پڑا۔

جب وہ مسکرانے لگی تو وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا تاکہ اپنی پریشانی کو چھپا سکے۔ اس کی نظر ٹیریس کے دوسرے کنارے پر رکھی ہوئی ایک عجیب سی چیز پر جا کر جم گئی۔

''مس صاحب، وہ کیا ہے؟ توپ؟ مشین گن؟''

''نہیں''، وہ زور سے ہنسی، ''وہ دوربین ہے، اس میں سے دیکھو تو دور کی چیز کو پاس لے آتی ہے۔''

''میں دیکھوں، مس صاحب؟''

وہ مالتی کے ساتھ ٹیلس کوپ کے پاس گیا جو ایک لکڑی کے اسٹینڈ پر جڑی ہوئی تھی۔

ٹیلس کوپ کے بارے میں گوپال کی بے چینی کو دیکھ کر مالتی مسکرا رہی تھی۔

گوپال نے اس میں دیکھا۔ مالتی اس کو ٹھیک کرنے لگی۔ گوپال خوش ہو کر چلایا،''وہ دیکھو مس صاحب دور سمندر میں کشتی بالکل پاس آگئی ہے!''

''اس سے کا کاجی آدھی رات کو چاند ستاروں کو دیکھتے ہیں۔''

''چاند ستاروں میں کیا دھرا ہے؟ زمین پہ دیکھنے کی کم چیزیں ہیں؟''

''جیسے؟'' مالتی نے پوچھا۔

''جیسے'' گوپال نے مالتی کے گلاب کے پھول جیسے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھ کر کہا،''جیسے گلاب کا پھول، سنگ مرمر کے پاک مندر، اٹھلاتی ہوئی سمندر کی لہریں اور ان پر ڈولتی ہوئی کشتی جیسے سمندر میں وہ کشتی ڈول رہی ہے۔''

اپنے جذبات کو چھپانے کے لیے گوپال دوبارہ ٹیلس کوپ میں جھانک کر دیکھنے لگا۔ اس نے سمندر میں ایک بوٹ کو آتے ہوئے دیکھا۔

○

لپ اسٹک کا نشان

ایک بجلی کے فانوس کے نیچے ایک ڈائنگ ٹیبل سجی ہوئی تھی مگر کھانے والے دو ہی تھے۔ بابو بھائی اور مالتی۔

"کہو مالتی بستی میں تمھارا اسکول کیسا چل رہا ہے؟"

"بہت اچھا چل رہا ہے کاکا جی۔ اب تو ہمارے یہاں ایک سو گیارہ بچے پڑھتے ہیں، مگر ان میں سے گیارہ بچے صرف ایک آدمی فضلو چاچا کے ہیں۔"

اس پر بابو بھائی ہنسا۔

"مگر دلچسپ بات یہ ہے کاکا جی کہ وہ گوپال ہے نا' جس نے میری جان بچائی تھی' وہ بھی پڑھنے آتا ہے۔"

"ارے واہ! وہ بھی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھتا ہے؟"

"پہلے دن جب وہ اسکول میں آیا تو بچوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ بڑا شرمایا۔ اس لیے میں نے کہہ دیا تھا کہ میں اسے یہاں پڑھا دیا کروں گی۔ دو دن سے وہ یہیں آ رہا ہے۔"

"یہاں، گھر پر!" بابو بھائی تھوڑا پریشان ہو گیا لیکن اس نے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا۔ بات کو ذرا سنبھالتے ہوئے اس نے کہا، "بیٹی، یہ تمھارا سماج سدھار کا کام ہمارے تمھارے لیے کہیں

خطرہ پیدا نہ کر دے؟''

''خطرہ! کیسا خطرہ کاکا جی؟''

بابو بھائی نے کہا،''میرا مطلب تھا کہ وہ گھر کی کوئی چیز اٹھا کر نہ چلتا بنے؟''

مالتی نے ہنسی کا ایک قہقہہ لگا کر اس خیال کو ختم کر دیا تھا۔

''نہیں کاکا، گوپال ایسا نہیں ہے۔ بڑا ایمان دار ہے۔ پھر آپ کی بڑی عزت کرتا ہے اور بڑا بھولا ہے۔ آج میں اسے ٹیرس پر پڑھا رہی تھی۔''

''کہاں پڑھا رہی تھیں؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''اوپر ٹیرس پر''، مالتی نے دہرایا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کاکا یہ سن کر بے چین کیوں ہو گئے۔

''وہ تو اتنا بھولا بھالا ہے کہ آپ کی دوربین دیکھ کر پوچھنے لگا کہ یہ کیا ہے اور کس کام آتی ہے؟''

''وہ میری ٹیلسکوپ تک پہنچ گیا۔ کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟''

وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ مالتی کو افسوس ہوا کہ خوامخواہ اپنے کاکا کے غصے کو بھڑکا دیا۔

کچھ سیکنڈ کے بعد ہی بابو بھائی نے اپنے غصے پر قابو پا لیا تھا،''میرا مطلب یہ ہے بیٹی کہ غیر آدمی کو گھر میں لانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے۔ اتنی نازک اور قیمتی چیز ہے، اس کو لاپرواہی سے توڑ پھوڑ دے تو؟''

''جی''، مالتی کچھ اداس سی ہو کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی،''اب میں اسے اوپر کبھی نہ آنے دوں گی! آپ اطمینان رکھیے!''

بابو بھائی کا چہرہ کچھ عجیب سا نظر آ رہا تھا جس پر تناؤ، فکر اور غصہ تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کی جو ڈراؤنی تھی اور تلخ بھی۔

امر بستی سے گزر رہا تھا۔ وہ اندو کی جھونپڑی کے پاس آیا تو ایک آواز نے اس کا استقبال کیا۔

''امر بھیا! امر بھیا! اندر آ جایئے!''

''کیا بات ہے اندو؟ ایک اور راکھی باندھنا چاہتی ہو کیا دو روپے پانے کے لیے؟''

''نہیں، تمھیں پتہ نہیں ان دو روپیوں کا کیا ہوا؟ باپو نے چھین لیے اور دارو پینے چلے گئے۔''

''بڑے افسوس کی بات ہے سکھارام اتنا اچھا مزدور ہو کے اتنا گر سکتا ہے؟ کیا تم اپنے باپ کے بارے میں مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

''نہیں''، وہ شرماتے ہوئے بولی، ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے لیکن باپو کے بارے میں نہیں۔'' پھر اس نے کہا، ''وہ تمھارا کون دوست تھا جو تمھارے گھر آیا تھا؟''

''اچھا وہ! وہ گوپال تھا۔ میرا بہت پرانا دوست ہے۔''

''وہ کیسا آدمی ہے؟'' اندو نے پوچھا۔

''بہت برا!''

''سچ!'' اس نے مذاق کو سچ سمجھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں تو مذاق کر رہا ہوں لیکن ایک طرح سے یہ ٹھیک بھی ہے۔''

امر بولا، ''وہ بہت اچھا آدمی ہے لیکن جو اچھا پن اس میں ہے وہ اسے نہیں پہچانتا۔ وہ ایک ایسا آدمی ہے جس میں بہت بڑی طاقت چھپی ہوئی ہے، لیکن وہ اس طاقت کو نہیں جانتا۔ وہ بڑا ذہین آدمی ہے لیکن وہ اپنی عقل کو نہیں پہچانتا جو اس کے دماغ میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ دس زبانیں بول سکتا ہے اور یہ سب ڈوکس کے مزدوروں سے اس نے سیکھی ہیں لیکن وہ ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا کسی زبان کا۔ ایسے آدمی کو تم کیا کہو گی؟''

اندو نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بولی، ''آپ کی آدھی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں لیکن میرا خیال ہے، آپ کا مطلب ہے وہ ایک بہت بڑے جہاز کی طرح ہے جو سمندر میں کہیں بھی جا سکتا ہے لیکن وہ ساحل پر کھڑا ہے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اسے کدھر جانا ہے؟''

''بالکل ٹھیک اندو۔ حقیقت میں ہم سب ساحل پر کھڑے ہیں کیونکہ ہم گہرے سمندر میں جانے سے ڈرتے ہیں۔''

گوپال کی کھولی (جھونپڑا)—

گوپال نے اپنی کھولی کی دیوار سے ننگی تصویریں پھاڑ کر پھینک دی تھیں اور اب وہ اس جگہ کوئلے سے لکھ رہا تھا۔ مالتی! مالتی!! مالتی!!!

ایک نوجوان پڑوسی اندر آیا اور سیٹھ کی بھتیجی کا نام لکھا دیکھ کر گوپال کا مذاق اڑایا۔

'ابے واہ'، پڑوسی گوپال کی طرف پلٹا، ''تو تو پورا مجنوں بن گیا ہے!— لیلا لیلا پکاروں میں بَن میں— پر دیکھ بیٹا، سیٹھ کی چھوکری سے عشق وشق کرے گا تو سالے جوتے پڑیں گے جوتے......''

''کیا بک رہا ہے بے؟ گوپال نے اپنے دوست کے بات کرنے کے انداز کو پسند نہیں کیا۔

''مس مالتی جی تو میری گرو ہیں— ان کا میں بڑا آدر کرتا ہوں— ان کے بارے میں خبردار اگر کبھی ایسی ویسی بات کہی تو— وہ میری گرو ہیں، گرو! سمجھا۔''

نوجوان نے فقرہ کسا، ''گرو جی کون سا شاستر پڑھاوے ہیں؟ پریم شاستر؟''

اس بیہودہ ریمارک پر گوپال نے اس آدمی کو پکڑ لیا، 'مار ڈالوں گا سالے اگر اب مالتی کے بارے میں کوئی گندی بات منھ سے نکالی۔''

''ارے معاف کرنا یار...... میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

''مذاق کر رہا تھا!'' گوپال نے دہرایا اور اسے زور کا دھکا دیا۔

ابھی تک غصے میں بھرا گوپال بستی سے گزرنے لگا، اپنی کتابیں اور کاپیاں لے کر لیکن یہاں بھی دنیا کی زبانوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا.

''کیوں گوپال؟ تیری رادھا کہاں ہے؟''

''ابے سیٹھ کی چھوکری سے پیار کرے گا تو جوتے کھائے گا جوتے۔''

ابے کتاب لے کر کیا پریم شاستر کا پاٹھ پڑھنے جا رہا ہے!''

''کوا چلا ہنس کی چال— اپنی بھی گیا بھول!''

ان فقروں کا خیال کیے بنا گوپال تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ وہ بابو بھائی کے بنگلے تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اندر جانا چاہتا تھا لیکن جا نہیں سکا۔

آوازیں— فقرے۔ جو پڑوسیوں نے اس پر کسے تھے، بھوت کی طرح اس کا پیچھا کرتے رہے۔

وہ دیر تک مالتی کے گھر کو دیکھتا رہا پھر وہ پلٹا۔

اس رات وہ سیلر بوائے میں تھا۔

پیتا رہا۔ خوب پیتا رہا۔

یہاں تک کہ وہ مدہوش ہو گیا۔ جب روزی اس کے پاس آئی تو اس نے بڑے جوش سے اس کا استقبال کیا۔

''ہیلو ڈارلنگ!'' وہ آپ ہی آپ بولا۔

''ہیلو اسٹرینجر''، وہ ناک بھوں چڑھا کر بولی، ''سنا ہے آج کل کسی سیٹھ کی چھوکری کے چکر میں ہو میری جان!''

''سیٹھ کی چھوکری پر لعنت بھیجو۔ جی تم یہاں بیٹھو کچھ پیو گی؟''

''تمھارے گلاس میں سے صرف ایک گھونٹ'' اس نے کہا اور اس کے گلاس میں سے ایک گھونٹ پیا اور گلاس کے حلقے پر اس کی لپ اسٹک کا نشان پڑ گیا۔ وہ اس نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کھڑی ہوئی اور بولی، ''یہ میری نشانی تمھیں میرے پیاسے ہونٹوں کی یاد دلاتی رہے گی— یہیں بیٹھے رہنا میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں۔''

وہ چلی گئی— گوپال کو اس کے گلاس کے ساتھ چھوڑ کر۔ وہ ایک گھونٹ لینا چاہتا تھا۔ گلاس کے کنارے پر روزی کی لپ اسٹک لگی دیکھ کر رک گیا۔

اسی وقت ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس کی میز پر آ کر بیٹھ گیا، ''کیوں کاکا؟'' گوپال اس سے مخاطب ہوا، ''کیا حال ہے؟''

''میلے میں چلتا ہے؟''

''میلے! کیسا میلے؟ کہاں ہے میلہ؟''

''اپنی بستی میں تو نے نہیں سنا۔ سیٹھ صاحب خود آئیں گے۔ ان کی بھتیجی مالتی بھی آئے گی......''

نشے میں مدہوش گوپال سمجھا کہ وہ اس پر فقرہ کس رہا ہے۔ اس نے سختی سے آدمی کا کالر پکڑ لیا اور چلّایا، ''مالتی دیوی کا نام مت لو!''

''ارے بھائی تو تو بہت پی گیا ہے گوپال! میں تو چلتا ہوں۔ میلے میں آنا ہے تو آ جانا ناچ

ہوگا— گانا ہوگا— بڑا مزا آئے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے آخری گھونٹ حلق میں اتارا، گلاس کو رکھا اور چلا گیا۔

اتنے میں روشنیاں مدھم ہوگئی اور آر۔ کے۔ اسٹرا کی آواز بلند ہوئی— روزی کا کیبر ے پروگرام شروع ہو چکا تھا۔

روزی انتہائی خوشی کے عالم میں مست ہو کر ناچ رہی تھی کیونکہ گوپال اس کا گوپال اس کے پاس آچکا تھا۔

لیکن مدہوش اور پیار میں ڈوبی ہوئی گوپال کی آنکھوں میں روزی نہیں تھی جو ناچ رہی تھی۔

اس کے کیبر ے کی مست حرکتوں میں وہ مالتی کو ناچتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کو ترسا رہی تھی—

ورغلا رہی تھی—

لبھا رہی تھی—

پکار رہی تھی—

اشاروں سے بلا رہی تھی—

اور پھر کیبر ے ختم ہوگیا۔

روشنیاں ہوگئیں اور مالتی پھر سے روزی ہوگئی۔

اپنا کام ختم کر کے روزی خوش خوش، چہکتی دمکتی اس میز کے پاس آئی جہاں کچھ ہی دیر پہلے گوپال بیٹھا تھا لیکن اب وہ اسے وہاں نظر نہ آیا، صرف وہ گلاس ٹیبل پر رکھا تھا جس میں شراب ابھی تک تھی، اتنی ہی جتنی اس کے ایک گھونٹ پینے کے بعد تھی اور اس گلاس کے کنارے پر اس کے لپ اسٹک کے نشان موجود تھے۔

O

سونے کے بسکٹ کون کھا گیا؟

جھونپڑ پٹی میں جشن کسی بھی بہانے ہو سکتا ہے۔ رکھشا بندھن ہو یا بیساکھی، ہندوؤں کا تیوہار ہو یا مسلمانوں کا، مہاراشٹر کا 'گوندا آلا' ہو یا پنجابی بھنگڑا۔ اس میں جھونپڑ پٹی کے مزدوروں کی ساری ملی جلی آبادی شامل ہو جاتی ہے۔ مہاراشٹرین، گجراتی، پنجابی، تمل، تیلگو، ملیالی سب کے سب حصہ لے رہے تھے۔

پروگرام دیکھنے والوں میں سیٹھ بابو بھائی، مس مالتی (جس کی آنکھیں گوپال کو دیکھ رہی تھیں)، رنجیت جو مالتی کی آنکھوں کا جائزہ لے رہا تھا اور امر جو اس پروگرام کا انتظام کر رہا تھا۔

''بھائیو اور بہنو!'' امر پروگرام دیکھنے کے لیے آنے والوں سے مخاطب ہو کر بولا، ''میں آپ سب کی طرف سے سیٹھ بابو بھائی اور ان کی بھتیجی مس مالتی جی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سیٹھ جی کو تو ہم برسوں سے ایک ہمدرد کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر مالتی دیوی نے بھی اپنا اسکول چلا کر جہاں وہ ہمارے بچوں کو پڑھاتی ہیں، ہر مزدور کے دل میں اپنا گھر بنا لیا ہے......''

یہ آخری لفظ اس وقت کہے گئے جب مدہوش گوپال مجمعے میں داخل ہو کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا۔

اب امر کہہ رہا تھا، ''سیٹھ جی کو کمپنی کے کام سے جانا ہے مگر میں مالتی دیوی سے درخواست کروں گا کہ وہ سیٹھ جی کی طرف سے جشن میں ہمارے ساتھ شریک رہیں۔ اب میں سیٹھ جی

سے درخواست کروں گا کہ وے دو لفظ آپ لوگوں سے کہیں......"

سیٹھ بابو بھائی تالیوں کے شور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بھائیو اور بہنو"، اس نے کہنا شروع کیا،" آپ نے تو سنا ہوگا سیٹھ بڑا پیٹ یعنی سیٹھ کا بڑا پیٹ ہوتا ہے۔" پھر اس نے اپنے سپاٹ پیٹ کی طرف اشارہ کیا،" کیا آپ کو میرا پیٹ بڑا دکھائی دیتا ہے؟"

"نہیں، نہیں!" مزدوروں کی آواز ایک ساتھ نکلی۔

"تو مجھے سیٹھ نہ مجھیے۔ اپنا بھائی، اپنا ساتھی مجھیے۔"

مزدوروں کی طرف سے تالیاں۔

"آج آپ کا جشن ہے۔ اسے بڑی دھوم دھام سے منایئے اور اس خوشی کے موقع پر اپنی کمپنی میں کام کرنے والوں کو میں ایک مہینے کے بونس کا اعلان کرتا ہوں۔"

تالیوں کا شور اور آوازیں— "سیٹھ بابو بھائی کی جے!"

'سیٹھ بابو بھائی کی جے!"

رنجیت اور اس کے آدمی نعرے لگا رہے تھے جس میں بھولے بھالے مزدور بھی شامل تھے۔

پھر سیٹھ نے اپنی تقریر یوں ختم کی،" اب میں آپ سے اجازت لوں گا— میں جس کام سے جارہا ہوں وہ بھی آپ ہی کا کام ہے۔ آپ کی کمپنی کا کام ہے، آپ کے دیش کا کام ہے۔ (تالیاں) میری بھتیجی مالتی دیوی جس نے اس سال بی اے کا امتحان دیا ہے اور اپنے کالج میں ڈانس کے لیے گولڈ میڈل حاصل کیا ہے وہ میری طرف سے آپ کی خوشی میں شریک رہے گی......"

مالتی نے الجھن سی محسوس کی۔

مدہوش گوپال نے بیوقوفی سے تالیاں بجائی۔

اند دبستی کی لڑکیوں سے کانا پھوسی کرتی ہے جو ناچ گانے کے لیے تیار ہیں۔

سیٹھ اور رنجیت چلے گئے۔

کار میں رنجیت نے سیٹھ جی سے کہا: ایک بات سمجھ میں نہیں آئی؟ آپ کو ایک مہینے کے

بونس کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی تو مزدوروں نے مانگ بھی نہیں کی تھی!''

''تم آج کی سوچتے ہو رنجیت ہم آگے کی سوچتے ہیں۔ میں جانتا ہوں دوسری کمپنیوں کے مزدور تین مہینے کا بونس مانگنے والے ہیں۔ بنا مانگے ہم نے ایک مہینے کا بونس دے کر ابھی سے اس کی روک تھام کر دی۔ اور پھر آج کی رات جب سب ناچ گانے میں مگن ہوں گے ہم اپنا کام بڑے اطمینان سے کر سکیں گے۔ آج کی رات تقدیر نے ساتھ دیا تو ہم کروڑ پتی بن جائیں گے۔''

بستی میں ناچ گانا جاری تھا۔

جوان مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں اپنے اپنے علاقے کے لباس میں اپنے اپنے رنگ میں ناچنے کے لیے آگے آ رہی تھیں۔

اب وہ مختلف زبانوں کے بولوں اور تانوں میں مختلف گروپ کورس کی شکل میں گا رہے تھے۔

صرف ایک ہی آدمی تھا جو ہر گانے میں شامل ہو سکتا تھا اور وہ گوپال تھا، جو مدہوشی کے عالم میں بھی ہر گانے اور ناچ میں شامل ہو جاتا تھا۔

ناچتے ہوئے اندو نے مالتی سے ہاتھ باندھے ہوئے درخواست کی کہ وہ بھی ناچنے والوں میں شامل ہو جائے۔

مالتی ناچنا نہیں چاہتی تھی لیکن جب مدہوش گوپال نے چلّا کر کہا، ''آؤ مس صاحب آؤ......کالج میں ڈانس کرتی ہو......ہم مزدوروں کے ساتھ بھی ناچ کر دیکھو......۔''

مالتی نے اس ریمارک کو چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا اور ڈائس سے نیچے اتر آئی ناچنے والوں میں شامل ہونے کے لیے۔

اس کے بعد گانے نے گوپال اور مالتی کے درمیان ایک ڈوییٹ کی شکل اختیار کر لی جس میں دونوں نے اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

اندو نے موقع ماحول کا جائزہ لیا۔ ناامیدی محسوس کی اور ناچ گانے سے خود کو الگ کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ وہاں سے بھاگ گئی۔

گانے کے میوزک کے ٹکڑوں پر سیٹھ، رنجیت اور ان کے آدمیوں کی اسملنگ کی حرکتوں کو بتایا اور دکھایا گیا۔

اناج کی بوریاں ٹرکوں پر چڑھائی جا رہی تھیں۔ ان میں بہت سی بوریاں ایسی بھی تھیں جن پر کراس (X) کا نشان بنا ہوا تھا، زمین پر پھینکی گئیں۔ جب وہ بوری کی طرف پلٹے تو دیکھا کہ پہلے ہی سے اس بوری کو چاقو سے پھاڑا گیا ہے۔

سیٹھ نے تیزی سے ہاتھ ڈال کر بوری میں کچھ تلاش کیا، لیکن اس کا ہاتھ خالی باہر آیا۔

اب سیٹھ رنجیت پر بھڑک پڑا، ''کون ذمہ دار ہے اس کا؟ اس سے پہلے بھی ایک بوری پھٹی ہوئی تھی لیکن وہ بغیر نشان کے تھی لیکن آج کسی نے نشان والی بوری کو پھاڑ دیا ہے، اور سونا غائب ہے ہمارا سونا ہمارا سونا......''

رنجیت نے سیٹھ سے کہا، ''اتنی زور سے مت بولیے سیٹھ جی۔ آپ فکر نہ کیجیے۔ میں پتہ چلا لوں گا۔ مجھ سے بچ کر کوئی نہیں جا سکتا۔''

سیٹھ نے اس کو موقعے کی نزاکت سے واقف کر دیا، ''یہ سونے کے بسکٹوں کا سوال نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کوئی ہمارا بھید جانتا ہے۔ کون جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے سی۔ آئی۔ ڈی ہو یا سی۔ بی۔ آئی، تم کو بہت احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔''

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں میں پتہ چلاؤں گا سیٹھ صاحب لیکن آپ بھی اپنا وعدہ یاد رکھیے!''

''کون سا وعدہ!......او......مالتی......ہاں ہاں ٹھیک ہے......تم ہی اس سے شادی کرو گے!''

''سیٹھ صاحب، مجھے مالتی کا اس گوپال کے بچے سے اس طرح یوں بے تکلف ہو جانا بالکل پسند نہیں۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ کام کا آدمی ہے۔ ممکن ہے اس کے ذریعے ہی ہمیں کچھ پتہ چل جائے! پتہ لگاؤ اس سونے کے بارے میں کون جانتا ہے۔'' اور پھر اپنے ہاتھ کو گلے کی طرف لے جا کر اشارے سے اس کو بتایا، جیسے گلا کاٹ رہا ہو، ''اسے ختم کر دو۔''

اس وقت اندو اپنی جھونپڑی میں داخل ہو رہی تھی۔

''کیوں ری؟'' اس کے باپ نے، جو اس کا بیقراری سے انتظار کر رہا تھا بولا — بولتی کیوں نہیں......؟''

اندو نے اپنے پیچھے کچھ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''بابا آج بھی ٹرکیں بھری ہوئی جا رہی تھیں، اس لیے میں نے سوچا شاید کچھ ہاتھ لگ جائے۔''

بوڑھے کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی، 'تو کچھ ملا؟''

'اناج کا تو ایک بھی دانہ نہیں لا سکی......' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''تو پھر کیا ملا ہے؟'' اس نے پوچھا اور جب اندو نے فوراً جواب نہ دیا، تو غصہ کرتے ہوئے بولا، ''اری بول......کیا ملا ہے آج؟''

''آج تو بابا یہ ملے ہیں۔'' اور جیوں ہی وہ اپنے چھپے ہوئے ہاتھ پیچھے سے آگے لائی تو اس کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے سونے کے بسکٹ تھے۔

سکھا رام کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کو سمجھنے کے لیے تھوڑا وقت لگا۔

''سونا!'' اس نے پہلے تو آہستہ سے سرگوشی کے انداز میں کہا، پھر ذرا زور سے دہرایا، ''سونا! ارے کمبخت، کیا اسمگلنگ کے لیے بڑے گھر کی ہوا کھلائے گی؟ یہ بیچنے کے لیے جاؤں گا تو پولیس سیدھے مجھے جیل خانے لے جائے گی۔ اس کا میں کیا کروں گا؟''

''بابا میں تو خود سونا دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ میں تو صرف دو چار سیر دانے چرانے گئی تھی۔ بوری میں چاقو مارا تو یہ سونے کے ٹکڑے میرے آنچل میں گرے......!''

''مگر اس میں یہ آئے کہاں سے اور کیسے؟''

جب بابو بھائی گھر میں داخل ہوئے تو کھانے کی میز پر مالتی کو اپنا انتظار کرتے ہوئے پایا۔

وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

لیکن بابو بھائی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

''ہیلو کاکا!'' اس نے اپنے چاچا کا استقبال کیا۔

''ہیلو مالتی!'' اس نے کھانے کی میز پر اداسی کے عالم میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ نوکر شام کا کھانا لانے کی تیاری کر رہے تھے، ''تم نے کھانا کھا لیا ہوتا! میں نے کتنی بار کہا ہے میرا انتظار نہ کیا کرو......''

''کوئی بات نہیں کاکاجی...... میں بھی ابھی آئی ہوں۔ بستی کے میلے میں بڑا مزا آیا۔ سچ مچ یہ لوگ بڑا انجوائے کرتے ہیں......انھوں نے اپنے ناچ گانے میں مجھے بھی گھسیٹ لیا تھا۔''

''تم بھی ناچی؟'' پہلے تو وہ غصے میں بولا پھر غصے کو دباتے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا، ''اچھا کیا...... مالکوں کو اپنے مزدوروں کی سماجی زندگی میں دلچسپی ہی نہیں بلکہ حصہ بھی لینا چاہیے......''

''ہائی۔ دا۔ دے۔ کاکاجی......وہ گوپال ہے نہ وہ تو بہت اچھا گاتا ہے۔ آج تو وہ میرے ساتھ ناچا بھی خوب!''

بابو بھائی کے ہاتھ سے چمچہ شوربے کی پلیٹ میں گر گیا اور ایک آواز پیدا ہوئی۔

''تم اس دو کوڑی کے قلی کے ساتھ ناچی؟ وہ لوگ خوب ہنستے ہوں گے—مالک کی بھتیجی ایک قلی کے ساتھ ناچ رہی ہے۔''

مالتی اس کو غصے میں بھرا دیکھ کر سہم گئی۔

''کاکاجی! میں سچ کہتی ہوں کاکاجی مجھے تو مالک اور مزدور میں کوئی فرق ہے اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ مجھے تو سب انسان نظر آتے ہیں......''

''وہ بیوقوف بھی یہی کہتا تھا۔''

''کون کاکاجی؟''

''تمھارا باپ اور میرا بھائی ہمیشہ کہا کرتا تھا' مزدور مالک بھائی بھائی ہیں آخر مزدوروں نے ایک دن اس کو مار ڈالا۔''

''کاکاجی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں اس کے سر پر سینکڑوں ٹن کی بھاری بوریاں گرا دیں کہہ دیا گا ایکسی ڈینٹ ہو گیا ہے!''

مالتی جیسے سوچ میں گم تھی۔ پھر وہ اپنے آپ سے کہنے لگی، ''مگر گوپال ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ تو آپ کی بڑی عزّت کرتا ہے۔''

بابو بھائی نے اوپر کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب طرح کے جذبات تھے۔ وہ بولا، ''بیٹی، یہی تو دنیا میں نہیں معلوم کون دوست ہے کون دشمن؟''

جذبات کی ایک جھلک اس کے چہرے پر تھی جو پاگل پن سے ملتی جلتی تھی۔

جب مالتی نے اس کے چہرے کو دیکھا تو اس کی اپنی آنکھوں میں ایک ڈر چھا گیا اور پریشانی بھی!

○

ویران ساحل کے کنارے

چال کے برابر میں گوپال بیڑی پی رہا تھا۔ ایک گھونگھٹ والی، مگر جانی پہچانی شکل اس کے پاس سے گزر گئی۔

وہ اندو تھی اور گوپال کو وہاں کھڑا دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔

اتنی رات گئے اندو کو امر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر گوپال کو تعجب ہوا کیونکہ امر تو ایک برہم چاری دھرماتما سمجھا جاتا تھا!

گوپال نے امر کے کمرے کی طرف ایک قدم بڑھایا، یہ جاننے کے لیے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ پھر وہ خود رک گیا جیسے کہہ رہا ہو" میں کون ہوتا ہوں دخل دینے والا؟"

امر اپنے کمرے میں سونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" امر نے آواز دی، "اندر آ جاؤ یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا!"

اندو کو دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔

"اندو تم یہاں! اس وقت؟"

اندو ڈرتے ہوئے کہنے لگی، "دروازہ بند کر دیجیے۔"

"تم جانتی ہو اندو میں نے آج تک یہ دروازہ بند نہیں کیا۔"

''بات ہی ایسی ہے امر بھیا!''

امر کو کچھ شبہ ہوا۔ وہ بگڑ اٹھا۔ ''امر بھیا۔ اور دروازہ بند کرنے کو کہتی ہو۔ چلی جاؤ اپنے گھر یا میں تمھیں چھوڑ آتا ہوں۔''

آخر کار اندو سونے کے بسکٹ نکالنے پر مجبور ہوگئی اور خاموشی سے امر کو دکھانے لگی۔

اب امر کو اندو کے آنے کا مقصد معلوم ہوگیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

جیوں ہی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی، گوپال پر اس کا ردّعمل ہوا۔

کچھ دوسرے پڑوسی بھی جو برآمدے میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، امر کے کمرے کی طرف شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

دروازہ بند کر کے امر اندر کی طرف پلٹا۔

''یہ کہاں سے ملے؟'' اس نے بگڑ کر پوچھا، ''اب تم اور تمھارا باپ اناج کی چوری کرتے کرتے سونے کی اسمگلنگ بھی کرنے لگے ہو۔''

''میں نے تو صرف اناج چرانے کے لیے بوری میں چاقو مارا تھا امر بھیا، مگر اناج کے ساتھ یہ میری جھولی میں آ گرے۔''

امر نے پوچھا، ''کس کا ٹرک تھا؟''

''بابو بھائی کا۔''

''ہوں تو یہ ہمالی کا ٹھیکہ اسمگلنگ کی آڑ ہے؟ لاؤ مجھ دے جاؤ نہیں تو تمھارا باپ نہ جانے کب اپنے نشے کے لیے بازار میں انھیں بیچنے کے لیے جائے۔ میں سوچوں گا، کیا کرنا چاہیے۔ مگر اس کی چرچا نہ کرنا، سمجھی؟''

اندو نے خاموشی سے اپنا سر ہلایا پھر وہ بولی، ''تو میں جاؤں امر بھیا؟''

امر نے چٹخنی کھول دی۔

چٹخنی کھلنے کی آواز آتے ہی برآمدے میں بیٹھے لوگوں پر اس کا جو ردّعمل ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔

امر اندو کے ساتھ باہر آیا۔ خاموش برآمدے سے گزر کر سیڑھیاں اترنے لگا۔

تاش کھیلنے والوں میں سے ایک نے حقارت سے زمین پر تھوکا، ''بڑا دھرماتما بنتا تھا!''

دوسرے دن—
ڈوکس کے علاقے میں—
البیلے ڈھنگ سے ٹوپی لگائے، بیڑی منہ میں دبائے، جیکٹ کو کندھے پر لٹکائے، گوپال کام سے لوٹ رہا تھا کہ ایک کار کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

مالتی اسپورٹس کار میں بیٹھی اس کی طرف ہاتھ ہلا رہی تھی، ''ہیلو گوپال!'' وہ بولی۔

گوپال گاڑی کے پاس گیا۔ ہاتھ جوڑ کر کہا، ''نمستے مس صاحب!''

''پڑھنا لکھنا بند کر دیا۔ کیوں؟''

''آپ نے راستہ دکھا دیا ہے۔ اب میں گھر پر خود ہی پڑھ لیتا ہوں۔''

''یہ تو اور اچھا ہے چلو، تمھیں چھوڑ دوں کہاں جانا ہے؟''

''کہیں نہیں۔''

مالتی ہنس پڑی، ''پھر تو اپنا راستہ ایک ہی ہے۔ میں بھی کہیں نہیں جا رہی ہوں۔'' اس نے اپنے بازو والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا، ''بیٹھو!''

''نہیں، مس صاحب۔'' گوپال بولا، ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ موٹر چلائیں اور میں نواب کی طرح بیٹھوں؟''

''تو تم چاہتے ہو تم موٹر چلاؤ اور میں مہارانی کی طرح آرام سے بیٹھوں؟''

''جی''، گوپال نے جواب دیا، ''آپ بالکل سہی سمجھیں۔''

مالتی بازو سے ہٹ گئی اور گوپال نے ڈرائیونگ وہیل سنبھال لیا۔ کار تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

رنجیت ایک کونے میں چھپ کر ان دونوں کو اس طرح بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا، مگر اسے مالتی اور گوپال نہیں دیکھ سکتے تھے۔

کار تیزی سے میرین ڈرائیو کی طرف بڑھ رہی تھی۔

چوپاٹی—

پیڈر روڈ—

حاجی علی—

ورلی سی فیس—

ماہم، باندرا، کازوے—

گھوڑ بندر روڈ سے ملاڈ—

اور پھر مرڈ آئی لینڈ!

مالتی کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

وہ تیز ڈرائیونگ کا لطف اٹھا رہی تھی۔

وہ ہنس رہی تھی۔

گوپال کو تیز گاڑی چلانا پسند تھا لیکن وہ مالتی کے قریب ہونے کی وجہ سے اور تیز چلانا چاہتا تھا۔

بریک لگانے کی زوردار آواز کے ساتھ گاڑی 'مڈ آئی لینڈ' پر ساحل کے کنارے، ناریل کے پیڑوں کے نیچے جا کر رک گئی۔

گوپال نے پھرتی سے کار روکی۔ باہر نکلا، کار کے دوسری طرف آیا، دروازہ کھولا، شوفر کی طرح سلام کیا اور مالتی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

''میم صاحب!' وہ بولا،'' آ گیا آپ کا کہیں نہیں۔''

''اور تمھارا کہیں نہیں؟'' مالتی نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''میم صاحب''، گوپال نے اپنے کندھے کو سکوڑ کر کہا،'' میرا کہیں نہیں ابھی کہیں نہیں ہے۔ ساحل پر ویرانی ہی ویرانی اور خاموشی ہی خاموشی ہے۔

ناریل کے پیڑ۔

سمندر کی لہریں—

چاندی کی طرح سفید ریت، جس پر ان کے قدموں کے نشان پڑ گئے تھے، جب وہ اس پر چلنے لگے تھے۔

یہ سب چیزیں خاموشی سے کانا پھوسی کرتے ہوئے ایک پیغام دے رہی تھیں—

شانتی کا۔
خوب صورتی کا۔
محبت کا۔
اب وہ اکیلے تھے!
ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بچتے رہے۔ جب تک وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلے گئے۔

پھر وہ ایک ساتھ ہی پلٹے ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔
"پہلے آپ!"
"پہلے آپ!"
"کیا کہنے والی تھیں آپ؟"
"کچھ نہیں!"
""اور آپ کیا کہنے والے تھے؟"
"کچھ نہیں!"
پھر وہ ہنسنے لگے۔ اس بار تھوڑی اور بے تکلفی کے ساتھ۔
اب وہ گھٹنوں پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔
سمندر کی ایک گہری اور تیز لہر مالتی کے پاؤں سے ٹکرائی وہ ڈگمگائی۔
گوپال کو اس کو سہارا دینا پڑا۔
اب وہ گوپال کی بازوؤں میں تھی۔
ان کے چہروں کے درمیان صرف کچھ انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ گوپال کے ہونٹ مالتی کے ہونٹوں پر جھک کر آگے بڑھتے ہوئے نظر آئے۔
مالتی کے ہونٹ کانپنے لگے۔ کیا وہ ایک سوال تھا یا دعوت؟ ایک چیلنج یا انکار؟ اس نے گوپال کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور بولی، "جی؟"

گوپال سمجھ گیا یا غلط سمجھا کہ وہ انکار تھا۔ اس نے اتنا کہا،" کچھ نہیں میم صاحب۔"
پھر اس نے مالتی کو سیدھا کر دیا اور وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی۔
"چلیے میں آپ کو گھر پہنچادوں۔"
کچھ ناراض سی اور کچھ ناامید ہوکر مالتی بولی، 'چلو'
کار میں واپس آ کر گوپال نے وہیل کو سنبھال لیا اور غصے کے عالم میں کار کو اسٹارٹ کیا۔
راستے میں مالتی نے خاموشی کو توڑا۔
"تم مجھ سے کچھ ناراض ہو؟"
"ناراض تو ہوں مگر آپ سے" نہیں!
"پھر کس سے ناراض ہو؟"
"اپنے آپ سے، اپنی قسمت سے، دنیا سے، سماج سے، مگر سب سے زیادہ اپنے آپ سے۔ لیجیے مس صاحب آپ کا گھر آ گیا۔"
اور پھر اس نے کار کو گھر کے سامنے روک دیا۔
مالتی اس کی طرف پلٹی، "لو، جو بات کہنی آئی تھی وہ تو ابھی تک کہی ہی نہیں۔"
فرمایے کیا حکم ہے؟"
"کل شام کو ہماری کمپنی کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ تم آؤ گے نا؟"
"کیوں، سیٹھ صاحب نے مجھے پٹوانا چاہتی ہیں؟"
"سیٹھ صاحب سے میں نے پوچھ لیا ہے وہ کہنے لگے، ضرور بلاؤ، گوپال پر ہمیں بڑا فخر ہے! آؤ گے نا؟"
"دیکھیے سوچوں گا، یہ بات سسپنس میں رہے تو اچھا ہے!"
"جب مالتی گھر میں داخل ہوئی، گوپال وہیں کھڑا رہا۔ جب اس کو معلوم ہوگیا کہ وہ جا چکی ہے اور اس کی آواز کو نہیں سن سکتی، تو وہ خوشی سے چلّا اٹھا، یاہو!"

سیلر بوائے اور کیپر سے——

گوپال پی رہا تھا— روزی کو ناچتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ امر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے داخل ہوا۔
کچھ لوگ امر کا مذاق اڑانے لگے۔
''ارے دیکھو تو آج کون آیا ہے یہاں؟''
''پوجیہ دھرماتما مہاراج آئے ہیں!''
''ارے یہ وہی دھرماتما ہیں جو آدھی رات کو چھوکریوں کو اپنے بند کمرے میں بلا کر دھرم شاستروں کی تعلیم دیتے ہیں!''
''کیوں امر جی، بولو کیا پیو گے، انڈین، وہسکی؟ جمیکن رم؟ پلس بیئر یا صرف شربت دیدار؟''
امر ذرا بھی طیش میں نہیں آیا۔ اس نے صرف اتنا کہا، ارے بھائی جو چاہے کہہ لو مگر میں گوپال سے ملنے آیا ہوں۔ معلوم ہے وہ کہاں ہے اس وقت؟۔
''وہ کیا بیٹھا پی رہا ہے۔ ارے گوپال یہ تیرا صوفی یار تیرے رنگ کو بھنگ کرنے آیا ہے۔ ابھی بڑے زور کا بھاشن دے گا......''
گوپال امر کو بڑے طنز سے مبارک باد دے رہا تھا۔ پچھلی رات والی بات وہ نہیں بھولا تھا جب آدھی رات کو اندو امر سے ملنے اس کے کمرے میں آئی تھی۔
''آؤ، امر بھیا آؤ! اب تو تم بھی ہم پاپیوں کی ٹولی میں شامل ہوتے جا رہے ہو نا؟ بولو آج کیا پیو گے؟''
''ارے بھائی کچھ نہیں۔'' امر نے انکار کیا، ''میں تو تم سے کچھ بات کرنے آیا ہوں۔''
''تو بولو بات کیا ہے؟''
''پہلے یہ بتاؤ ڈوکس کے آس پاس کبھی گول مال ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟''
گول مال؟' گوپال نے امر کے سوال کو دہرایا، ''سچ پوچھو تو میں نے تو بس ایک بار تمھاری دوست اندو کو اناج چراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہی چھوکری جو آدھی رات کے بعد تم سے اکیلے ملنے آئی تھی!''
''میں اندو کی نہیں، سیٹھ اور اس کے آدمیوں کی بات کر رہا ہوں۔''
''اور میں سیٹھ اور اس کے آدمیوں کی بات نہیں کر رہا ہوں، سمجھے۔''

پھر اس کے لہجے میں کچھ نرمی آئی اور وہ امر سے بحث کرنے لگا، ''ایسی باتیں خطرناک ہوتی ہیں، امر بھیا! میری مانو، تم بھی اس گول مال میں نہ پڑو۔ سیٹھ کیا کہتا ہے، کیا نہیں کرتا ہمیں اس سے کیا واسطہ؟ گورنمنٹ جانے سیٹھ جانے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں سیٹھ ہمیں اچھی پگار دیتا ہے۔ میٹھے بول بات کرتا ہے۔ آج رات مجھے اپنی پارٹی پر بلایا ہے، اور مجھے کیا چاہیے — لو شراب پیو!''

''ٹھیک کہتے ہو دوست، تمھیں اور کچھ نہیں چاہیے!'' پھر امر اٹھ کھڑا ہوا، ''مگر مجھے چاہیے سچ اصلیت! میں جب تک اس کو ڈھونڈ نہیں لوں گا میں چین سے نہیں بیٹھ سکتا......''

اور امر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اسی وقت جگّا، جو رنجیت کا آدمی تھا آیا اور گوپال کے قریب بیٹھ گیا اور حکم دیا۔

''ارے چھوکرے ایک بوتل ہمارے دوست کے لیے......''

''دوست!'' گوپال نے دہرایا، اُدھر دیکھتے ہوئے جدھر امر گیا تھا، ''وہ سالا مجھے دوست کہتا ہے۔ میں بھی اسے دوست سمجھتا ہوں، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ آگ میں ہاتھ ڈالے تو میں بھی آگ میں ہاتھ ڈالوں!''

''بالکل نہیں! مگر وہ کہتا کیا ہے؟''

سالا اپنے آپ کو دھرماتما سمجھتا ہے۔ خدائی خدمتگار! سالا سیٹھ صاحب کے کام میں ٹانگ اڑانا چاہتا ہے!''

جگّا نے کچھ ایسا منہ بنایا جیسے وہ امر کے ارادے کے بارے میں جاننے کے لیے بےقرار ہو۔

''سالا کہتا ہے، ادھر کچھ گول مال چل رہا ہے۔ میں نے لاکھ سمجھایا، سالے ایسی باتیں خراب ہوتی ہیں، مگر وہ مانتا نہیں، مجھے ڈر ہے کہ ایسی باتیں اور کسی سے کرے گا تو سالا کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے، میرا دوست ہے نا؟''

''تم فکر نہ کرو۔ امر تمھارا دوست ہے تو ہمارا بھی دوست ہے ہم اسے سمجھا دیں گے۔

جگّا کی آنکھوں میں ایک خطرناک چمک پیدا ہو گئی تھی۔

''سمجھایا تو میں نے بھی تھا مگر وہ بڑا ضدی ہے تم فکر نہ کرو۔ جگّا کے سمجھانے کے سامنے

کوئی ضد نہیں ٹھہرتی۔ میرے سمجھانے کا الگ ہی ڈھنگ ہے۔ تم بالکل چنتا نہ کرو۔ ہم تمھارے دوست کی دیکھ بھال کرے گا تم شراب پیو۔

جگا کھڑا ہوا اور اپنے دوسرے ساتھی کے پاس گیا۔

اسی دوران روزی ایک لپٹا ہوا پارسل لیے گوپال کے پاس آئی اور اس سے کانا پھوسی کرنے لگی۔

''یہ لو، گوپال! مگر ان کپڑوں کو حفاظت سے کل واپس کر دینا نہیں تو ٹونی کو پتہ چل گیا تو وہ چلائے گا۔

''تم فکر نہ کرو، روزی۔ گوپال نے اس کو یقین دلایا۔ پھر اپنا گلاس اوپر اٹھایا روزی کا جامِ صحت پینے کے لیے، ''تم بڑی اچھی لڑکی ہو...... یہ تمھاری صحت کا جام!''

اس نے گلاس خالی کر دیا۔

O

انتقام کی آگ

بابو بھائی کے گھر پارٹی ہو رہی تھی۔ مالتی کے باپ کی مورتی کو پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے تھے۔

''مالتی بیٹی، اپنے پتا کی مورتی کو نمسکار کرو۔ آج کے دن ہی انھوں نے اپنی کمپنی کی بنیاد رکھی تھی۔''

مالتی اپنے ہاتھوں کو جوڑتی ہے، ''پتا جی، مجھے اپنے نقش قدم پر چلنے کی شکتی دو۔''

''ایسا مت کہو بیٹی۔'' بابو بھائی کے چہرے پر بدنیتی کے آثار ابھر آئے تھے، ''جس طرح ہم نے بھائی کو کھو دیا۔ اس طرح ہم تمھیں نہیں کھونا چاہتے!''

مالتی کو اپنے چاچا بابو بھائی کی اس بات پر بڑا تعجب ہو رہا تھا۔ اسی وقت گوپال اندر آیا تو اس کی توجہ گوپال کی طرف ہوگئی۔ وہ اس وقت کالا سوٹ پہنے ہوئے تھا اس لیے سب نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

'مالتی'، اس کے چاچا نے کہا، ''جاؤ بیٹی اپنے مہمانوں کو ریسیو کرو!''

جس وقت گوپال کی آنکھیں مالتی کو ڈھونڈ رہی تھیں، نوجوان مردوں اور عورتوں کے ایک گروپ نے آ کر اسے گھیر لیا۔

''ہیلو جی!'' ایک لڑکی نے کہا۔

''ہیلو مسٹر''، ایک نوجوان بولا، ''میرا نام جولی ہے۔ آپ کا کیا نام ہے؟''

''گوپال۔''

''بھائی گوپال، یہ سوٹ تو بڑا بڑھیا سلوایا ہے تم نے۔ تمھارا ٹیلر کون ہے؟ لافنس؟ رام کنگ؟ اسکوائر؟''

''جی!'' بوکھلائے ہوئے گوپال نے جواب دیا۔ جو ان میں سے ایک کا بھی نام نہیں جانتا تھا۔

ایک اور نوجوان بھی گفتگو میں شامل ہو گیا، ''ارے بھئی ہم تو دیکھتے ہی سمجھ گئے تھے کہ یہ سوٹ انھوں نے لندن میں سلوایا ہے۔ وہاں یہ اسٹائل اٹھارہویں صدی میں بہت مقبول تھا۔''

''نہیں جی آپ کیا بات کرتے ہیں۔ یہ تو لیٹسٹ فیشن ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، میں نے ایک بینڈ ماسٹر کو بالکل ایسا ہی سوٹ پہنے دیکھا تھا۔ پھر یہ پرانا اسٹائل کیسے ہو سکتا ہے؟''

اب گوپال سمجھ گیا کہ وہ نوجوان مرد اور عورتیں جو اچھے اچھے کپڑے پہنے تھے، دراصل اس کے کپڑوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔

وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مالتی وہاں آ گئی اور گروپ میں شامل ہو گئی اور دوستانہ طریقے سے گوپال کو مبارکباد دینے لگی۔

''ہیلو گوپال!''

''ہیلو مس مالتی!''

''ارے بھئی مالتی، تمھارے یہ دوست تو بڑے فارمل ہیں۔''

رنجیت بیچ میں بول پڑا، ''یہ مالتی دیوی کا دوست نہیں ہے نوکر ہے ڈوکس میں کام کرتا ہے۔''

''کام کرتا ہوں''، گوپال نے جل کر کہا، ''حرام کا نہیں کھاتا ہوں۔''

''ارے بھئی، مالتی نے صورت حال کو سنبھالتے ہوئے کہا، ''گوپال کو میں نے آج کی پارٹی میں اپنے دوست کی حیثیت سے بلایا ہے۔ آپ لوگ کیوں ان کے پیچھے پڑ گئے؟''

''ہم تو ان کے کپڑوں کی تعریف کر رہے تھے۔'' نوجوانوں میں سے ایک نے سمجھایا۔

''تو آپ جاننا چاہتے ہیں''، گوپال نے پوچھا،'' کہ میں نے یہ سوٹ کہاں سلوایا ہے؟ بات یہ ہے کہ میں نے یہ سلوایا نہیں، کرائے پر لیا ہے—صرف ایک رات کے لیے۔ کہیے تو کرایہ بھی بتادوں؟''

مالتی ایک دم بیچ میں بول پڑی،'' یہ گوپال ہیں نہ میرے دوست، بڑے مذاقیہ ہیں۔ تم لوگوں کو بنا رہے ہیں۔''

ہنسی کا ایک قہقہہ پھٹ پڑا۔ پھر مالتی گوپال کو ایک طرف لے گئی اور کہا،'' آؤ گوپال میرے ساتھ، کہو کیا پیو گے؟''

بیرا کوکٹل کے گلاس لیے ان کے پاس پہنچا۔

''کیمپا کولا''، گوپال بولا۔

مالتی ہنس پڑی،'' میں نے تو سنا ہے تم وہسکی کی بوتل پی جاتے ہو اور آج صرف کیمپا کولا؟''

''مس صاحب''، کیمپا کولا کا ایک گلاس لیتے ہوئے گوپال بولا ایک مزدور وہسکی کہاں پی سکتا ہے؟ میں تو دیسی ٹھرّا پیتا ہوں مگر آج صرف کیمپا کولا۔''

''تو پھر''، مالتی نے کہا،'' میں بھی آج یہی پیوں گی۔''

اس نے بھی ایک گلاس لیا اور پھر گوپال کی طرف پلٹی۔

''سنا ہے تمھاری دوستی ایک کیبرے ڈانسر روزی سے تھی۔''

''تھی نہیں—ہے۔ اب میری دوستی معمولی ڈانسر سے نہیں تو کیا ایک کروڑ پتی کی کالج میں پڑھنے والی بھتیجی سے ہوگی؟''

''دوستی کا کیا بھروسہ؟'' مالتی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی،'' کسی سے بھی ہوسکتی ہے؟''

وہ اور کچھ کہنا چاہتی تھی، یا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اتنے میں سیٹھ بابو بھائی ان کے بیچ میں آیا۔

''نمستے سیٹھ جی!'' گوپال نے نمسکار کیا۔

''ہیلو گوپال! بھئی بہت اچھا ہوا تم آ گئے۔ کھانا کھائے بغیر نہ جانا......''

پھر دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر اس نے اعلان کیا، ''بھئی سنا ہے یہ گوپال بہت اچھا گاتا ہے۔ اس سے گانا ضرور سننا!''

اس پر زور شور سے تالیاں بجنے لگی۔ اسی وقت ایک نوکر آیا اور سیٹھ بابو بھائی سے کانا پھوسی کرنے لگا۔ بابو بھائی نے اپنی انگلی سے باہر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اپنے مہمانوں پر ایک نظر ڈالی اوران کا جائزہ لیا اور پھر مالتی سے بولا، ''بٹی تم مہمانوں کی خاطر تواضع کرو۔۔۔ میں ابھی آتا ہوں!''

پھر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اپنے آفس روم میں وہ بیٹھا ہی تھا کہ نوکر امر کو لے کر آ گیا۔

''ارے بھئی امر آؤ...... آؤ...... بیٹھو......''

''میں کھڑا ہی ٹھیک ہوں سیٹھ جی، معاف کیجیے گا اس وقت آپ کو تکلیف دی مگر دو دن سے آپ سے ملنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ رنجیت صاحب ملنے ہی نہیں دیتے......''

''ارے بھئی، معاف کرنا''، سیٹھ جی نے بڑی ڈپلومیسی سے کہا، ''میں اس فنکشن کے انتظام میں اتنا مصروف تھا کہ کیا بتاؤں خیر اب بولو، کیا کہنا ہے؟''

''کہنا نہیں سیٹھ صاحب، آپ کو کچھ دکھانا ہے۔''

تب اس نے سونے کے دو بسکٹ اپنی جیب سے نکالے اور سیٹھ کے آگے معائنے کے لیے پیش کیے۔

سیٹھ نے ایکٹنگ کرتے ہوئے تعجب سے دیکھا، اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اور اپنے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا، ''ارے بھئی یہ کیا ہے؟''

''آپ ہی بتایئے نا!'' امر تلخ لہجے میں بولا۔

''لگتا تو سونا ہے، مگر آیا کہاں سے؟ کیا اسمگلنگ کا دھندہ شروع کر دیا؟''

''اسمگلنگ کا دھندہ تو ہے سیٹھ جی۔ اب یہ میں نے شروع کیا ہے یا کسی اور نے یہ آپ بتایئے۔''

''مجھے کیا معلوم؟'' وہ فوراً بولا اور پھر سوال کیا، ''یہ تمھیں ملے کہاں سے؟''

''ایک اناج چور نے آپ کی ٹرک میں لدی بوریوں میں ایک چھری ماری تو اس میں سے اناج کے ساتھ یہ سونے کے بسکٹ گر پڑے......''

''تب تو یہ اسمگلنگ کا مال ہے..... کوئی ہمارے ٹرکوں کو اس غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہے..... تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

''پولیس کو رپورٹ کرتا''، امر سیٹھ کی طرف دیکھ کر بولا، جیسے کہنا چاہتا ہو،''لیکن تم نہیں کرو گے!''

سیٹھ نے فون اٹھایا ایک نمبر ملایا بولا،'اینٹی کرپشن برانچ؟''

دوسرے کمرے میں رنجیت نے فون اٹھایا جواب دیا،''ہاں۔''

''میں بابو بھائی بولتا ہوں دیکھیے ہمارے ایک آدمی امر کمار کو سونے کی اسمگلنگ کا کچھ پتا چلا ہے—جی ہاں—مال بھی ہاتھ آیا ہے—اسے ہم آپ کے پاس بھیج رہے ہیں—وہ آپ کو سب کچھ بتا دے گا..... پوری تحقیقات کیجیے..... کیونکہ یہ مال ہماری ٹرک سے نکلا ہے تو اس میں ہماری بڑی بدنامی ہوتی ہے..... تھینک یو..... انسپکٹر صاحب! ہاں ایک بات اور امر ہمارا خاص آدمی ہے۔ بڑا ایماندار اور آدرش وادی ہے۔ اس کی جلدی چھٹی کر دیجیے گا.....۔''

دوسری طرف رنجیت دانت بھینچ کر کہتا ہے،''وہ تو ہم کر ہی دیں گے۔''

''جاؤ بھئی سیدھے وہیں جاؤ اور یہ گولڈ بسکٹ وہیں لے جاؤ..... میں بھی تمھارے ساتھ چلتا مگر گھر میں یہ پارٹی ہو رہی ہے.....''

پارٹی میں تالیوں کا شور بلند ہوتا ہے جب مالتی یہ اعلان کرتی ہے،''اب میں گوپال سے درخواست کروں گی کہ وہ ایک گانا ہمیں سنائیں.....''

(گانے کا خیال یہ ہو کہ گوپال ان لوگوں سے بدلہ لینے کی کوشش کر رہا ہے جنھوں نے اس کا مذاق اڑایا وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ لوگ اسے اپنے سے کم تر ہی سمجھ رہے ہیں اور ان لوگوں میں مالتی بھی شامل ہے.....اس کی چوٹ عام طور پر امیروں پر ہوتی ہے اور خاص کر امیر لڑکی مالتی پر۔ اب وہ نشے میں ہے اور اس لیے اب اسے کوئی ہوش نہیں ہے۔ وہ صاف صاف اور بے ڈھنگ طریقے سے بات کرتا ہے۔)

میوزک کے ٹکڑوں پر—

امر پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہا ہے۔ پہلے بس میں، پھر پیدل۔ ایک بھاری ٹرک اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

جب امر پولیس اسٹیشن کے سامنے پہنچتا ہے، وہ دونوں سونے کے بسکٹ اپنی جیب سے نکالتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت بھاری ٹرک تیزی سے آ کر اس سے ٹکراتا ہے اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔ پولیس آفیسرس اور پولیس کانسٹبل دوڑے ہوئے باہر آتے ہیں۔

یہ دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی سڑک پر پاؤں پسارے پڑا ہے اور خون میں لت پت ہے۔ جب وہ اس کے قریب آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ مر چکا ہے اور اس کے ہاتھ میں دو سونے کے بسکٹ ہیں۔

پارٹی میں گوپال کا گانا ختم ہونے پر سب تالیاں بجاتے ہیں۔ ان میں مالتی بھی شامل تھی جس نے سنجیدگی کی حد تک گانے کو پسند کیا تھا۔ دوسرے تعریف کر رہے تھے لیکن ذرا تیکھے انداز میں۔

''ارے واہ، یہ گوپال تو تان سین کے خاندان سے معلوم ہوتا ہے......''

اتنے میں ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

رنجیت نے ٹیلی فون اٹھایا۔ سنا سیٹھ بابو بھائی کو دیا، یہ کہتے ہوئے، ''سیٹھ صاحب بڑی بری خبر ہے!''

سیٹھ نے فون لیا۔ سب کے سب خاموش ہیں اور سیٹھ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ سیٹھ سنتا ہے صرف یہ کہتے ہوئے 'ہاں ہاں......کون؟ امر کمار......ہاں وہ ہمارے یہاں کام کرتا ہے۔ کیا کہا؟ کیا ہوا؟ اوہ مائی گاڈ! بیچارہ!! پھر کہیے' اس کے پاس اسمگلنگ کیا ہوا سونا نکلا ہے؟ نہیں صاحب، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں ابھی آتا ہوں!''

اس نے فون رکھ دیا! ہر ایک جاننے کے لیے بیقرار تھا کہ کیا ہوا ہے۔

''سیٹھ صاحب، امر بھیا کو کیا ہوا؟'' گوپال نے سیٹھ جی سے بیقراری کے عالم میں پوچھا۔

سیٹھ نے اپنے چہرے کو غمگین بنالیا، ''بھائی تمھارے امر بھیا کو کسی ظالم ٹرک ڈرائیور نے کچل کے رکھ دیا۔''

''امر بھیا بے چارے! کیا وہ مر گئے؟'' مالتی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

سیٹھ نے غمگین ہو کر سر ہلا دیا اور پھر بولا، "اس سے بھی بری خبر تو یہ ہے کہ مرتے وقت اس کے پاس اسمگلنگ کیا ہوا سونا نکلا ہے۔"

گوپال اٹھ کھڑا ہوا اور غصے میں بولا، "یہ کبھی نہیں ہو سکتا!"

بابو بھائی بھی اٹھ کھڑا ہوا گوپال کے بالکل سامنے۔ اس نے گوپال کی آنکھوں میں گھور کر دیکھا۔ پھر سوچ سمجھ کر خاموشی میں بولا، "تم بچے ہو ہم جانتے ہیں اس دنیا میں کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا؟"

پھر اس نے بنا ارادے مالتی کی طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے سے وحشت ظاہر ہوتی تھی۔ مالتی ڈر گئی۔ کیوں اور کس لیے، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

ڈرم کو پیٹا جا رہا تھا—

یہ کیبرے بار کا بینڈ تھا—

روزی مگن ہو کر ناچ رہی تھی۔ وہ تیز رفتار سے گھوم رہی تھی۔

گوپال کے سامنے کئی خالی بوتلیں پڑی تھیں۔

آج وہ بے تحاشہ پیے جا رہا تھا۔

ناچ کے بعد روزی اس کے پاس آئی، "گوپال، تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ جب سے امر بھیا کی چتا کو جلا کر آئے ہو اتنی بوتلیں خالی کر چکے ہو کیا تمھارا بھی جان دینے کا ارادہ ہے؟"

"تو مری جان لے لو— میری جان"، اس نے جذبات میں ڈوب کر کہا۔

"تمھاری جان کیوں؟ ان کی جان لوں گا جنھوں نے امر بھیا کی جان لی ہے— جان ہی نہیں، ان کا نام، ان کی عزت لی ہے— ایک دھرماتما آدمی کو مرنے کے بعد اسمگلر بنا دیا ہے!"

"تمھیں اس سے کیا؟ تم اپنے کام سے کام رکھو۔"

"نہیں روزی، میرا کام تو اب شروع ہوا ہے— اب تک تو میں ایک سنہرا سپنا دیکھ رہا تھا۔ امر بھیا کی موت نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ مجھے امر بھیا کا کام پورا کرنا ہے۔"

اور یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''تمھارے سامنے قسم کھاتا ہوں روزی کہ جب تک میں امر بھیا کے قاتلوں کا پتہ نہ چلا لوں گا، شراب کی ایک بوند بھی نہیں پیوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے آدھی خالی بوتل کو اٹھایا اور اسے میز پر چکنا چور کر دیا۔

گلاس کے ٹوٹے ہوئے ہر ٹکڑے میں اس کے چہرے کا عکس نظر آ رہا تھا جس پر انتقام کی آگ دہکتی دکھائی دے رہی تھی۔

○

بخار نہیں اترا

اندوا پنے جھونپڑے کے قریب کھڑی تھی جب گوپال اس کے پاس پہنچا۔

''اندو۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''جی''، اس نے جواب دیا۔

''تمھارے بابا کہاں ہیں؟''

''داروخانے میں — امر بھیا کی موت نے انھیں پاگل بنا دیا ہے۔ ہر وقت یہی بڑبڑاتے رہتے ہیں — بھاگو یہاں سے بھاگو — موت کا چکر پھر سے چل پڑا ہے۔''

''پھر سے چل پڑا ہے!'' گوپال نے یہ لفظ دہرائے، ''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''شرابی کی بات کا بھی کوئی مطلب ہوتا ہے؟'' اور وہ گوپال کی طرف دیکھنے لگی۔

''برا نہ مانو تو ایک بات بتاؤ گی؟''

''کہیے۔''

''اس رات کو تم امر بھیا سے ملنے کیوں گئی تھیں؟''

''نہ گئی ہوتی تو امر بھیا بھی نہ مرے ہوتے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس رات ہی میں نے انھیں سونے کے بسکٹ دیے تھے جو مرتے وقت ان کے ہاتھ میں پائے گئے۔''

''تم نے دیے تھے! تمھیں کہاں سے ملے تھے؟''

''سیٹھ بابو بھائی کے ٹرک پر لدی ہوئی اناج کی ایک بوری میں سے۔ اسی لیے تو وہ کل رات کو سیٹھ جی سے ملنے گئے تھے۔''

''ہوں'' اب بات گوپال کی سمجھ میں آ رہی تھی، ''تو سیٹھ کا اصل بزنس اسمگلنگ ہے.....''

پرچھائیوں میں رنجیت کا ایک آدمی چھپا ہوا تھا، جو سیلر بوائے بار میں بھی موجود تھا، ان کی یہ باتیں سن رہا تھا۔

رنجیت کے آدمی نے جا کر اسے وہ سب باتیں بتا دیں جو اس نے سنی تھیں۔

رنجیت نے اس سے پوچھا، ''ابے تجھے یقین ہے، یہ وہ دونوں ہی تھے جو یہ بات کر رہے تھے؟''

''میرے باپ کی قسم سرکار!''

''تیرا کوئی باپ بھی تھا— یہ تو آج ہی معلوم ہوا!''

رنجیت نے ان سب باتوں کی خبر سیٹھ کو دے دی۔

''پھر تو ان دونوں کو بھی امر کے پاس جانا ہوگا!''

''حکم ہو تو اس کا بھی انتظام کر دوں۔''

''نہیں، ابھی نہیں..... روز روز ایسے بھیانک ایکسی ڈنٹ ہونے لگے تو پولیس شبہ کرنے لگے گی۔''

''ایکسی ڈنٹ اور قسم کے بھی ہو سکتے ہیں صاحب!

اگلے دن—

مزدوروں کی بستی!

گوپال کام کے لیے جا رہا تھا۔

مالتی اپنے اسکول کی طرف۔

دونوں ملے۔

''ہیلو گوپال!''

''نمستے مس مالتی۔''

''امر بھیا تمھارے بڑے دوست تھے — ان کی موت کا بڑا افسوس ہے۔''

گوپال خاموش رہا۔

''اس دن سے تم ملے نہیں؟ کہاں رہے؟''

گوپال اب بھی خاموش تھا۔

''تمھیں کیا ہوا گوپال؟''

''اپنی زندگی کا ٹائم ٹیبل بدل رہا ہوں، مس صاحب!''

''اور ہماری دوستی؟''

''اب بیکار کے سپنے دیکھنے چھوڑ دیے ہیں میں نے۔ اپنا کام دیکھیے مس صاحب۔ مزدوروں سے بات کرنا آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔''

مالتی کوشش و پنج میں چھوڑ کر وہ چلا گیا۔ وہ حیران تھی اور بڑبڑا رہی تھی —

''مزدور!''

''ارے بھئی یہ کام تو مزدوروں کا ہے۔'' کلرک، جو اب امر کی جگہ کام کر رہا تھا۔ گوپال سے بولا۔

گوپال اس وقت ایک بھاری بوری اٹھا کر لے جا رہا تھا۔

''بابو جی، میرے لیے یہ کام نیا نہیں ہے — میں پہلے بھی یہی کام کرتا تھا۔''

''مگر بھئی تم نے تو یہ کام چھوڑ دیا تھا؟'' وہ گوپال کے ساتھ بھاگتے ہوئے پوچھ رہا تھا جو بوجھ سے دبا ہونے پر بھی تیز تیز چل رہا تھا۔

''ہاں بھئی، کچھ دن کے لیے حرام خوری کی عادت پڑ گئی تھی...... اب پھر ایمان کی روٹی کھانا چاہتا ہوں۔''

اچانک وہ رک گیا۔ ابھی تک وہ بوجھ کے ساتھ جھکا ہوا تھا۔ اس کے سامنے سیٹھ بابو بھائی

کھڑا تھا۔

''یہ کیا بچپنا ہے گوپال؟ کیا دماغ خراب ہو گیا ہے؟''

''خراب ہو گیا تھا مگر اب ٹھکانے پر آ گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ جو کام کروں گا، اسی کی مزدوری لوں گا۔''

''......مگر تمھیں مزدوری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''کہ میں اپنی محنت اور پسینے کی کمائی کھا رہا ہوں حرام خوری کی نہیں!''

''اچھا بھئی، جو جی چاہے کرو۔ میں تو افسوس کرنے آیا تھا تمھارے دوست کا۔ تم تو جانتے ہو ایسے ایکسی ڈنٹ تو ہوتے ہی رہتے ہیں امر کی جگہ میں بھی ہو سکتا تھا!''

لیکن گوپال وہاں سے جا چکا تھا۔

پھر بابو بھائی بولا، ''اور تم بھی ہو سکتے ہو!''

اور جس انداز میں اس نے 'ہو' کہا اس میں سخت دھمکی تھی۔

وہ رات—

سیلر بوائے بار اور کیبرے—

گوپال کندھے پر اپنا جیکٹ ڈالے داخل ہوا۔

اس نے رنجیت کے آدمی منگتا اور بھیکو کو ایک میز پر بیٹھے ہوئے دیکھا اور سیدھا ان کی طرف گیا۔

اس کو بڑا تعجب ہوا جب ان دونوں نے بڑی گرمجوشی سے اسے خوش آمدید کہا اور اپنے ساتھ پینے کے لیے مجبور کیا۔

''آؤ گوپال''، منگتا نے کہا، ''صبح سے شام تک سالے سیٹھ کے لیے جان دیتے ہیں—اپنا خون پسینہ بہاتے ہیں دارو پی کر ہی اپنا غم دور کر لیں!''

انھوں نے گوپال کو گلاس لینے کے لیے مجبور کیا اور اپنے لیے الگ الگ گلاس لیے۔ گوپال نے شراب کا پوز بنا لیا لیکن گلاس کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر چپکے سے شراب کو میز کے نیچے پھینک دیا۔

بار بار ان لوگوں نے اس کا گلاس بھرا اور ہر بار گوپال نے شراب کو اسی طرح پھینک دیا۔ ایک پیے ہوئے شرابی کا روپ دھار کر۔

جب وہ سمجھے کہ گوپال پوری طرح پی چکا ہے اور اس کا برتاؤ کافی پیے ہوئے شرابی جیسا ہے تو انھوں نے اس کو لڑائی کے لیے بھڑکایا۔

گوپال نے ان کا گیم کھیلا۔ ان میں سے ایک کو اس نے پکارا، ''ابے او بابو سیٹھ کے چمچے......''

''تو مجھے چمچہ کہتا ہے؟'' منگتا چلایا۔ کھڑے ہو کر اس نے دوسری میز پر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا، ''یارو یہ سالا مجھے چمچہ کہتا ہے!''

ان سب نے کھڑے ہو کر گوپال کو گھیر لیا اور اس کو مارنا شروع کر دیا۔ پہلے گوپال نشے میں وحشت شرابی کا روپ دھار کر زمین پر گر گیا۔ پھر مار کھانے کے لیے لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا۔

پھر ان کو تعجب ہوا اور ان پر دہشت حاوی ہو گئی کیونکہ اس 'پیے ہوئے آدمی' نے ایک چھلانگ لگائی اور ان کو ایک کے بعد ایک گھونسے مارنے لگا۔

اب ایک باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔

اور آخر کار غنڈے یہ کہتے ہوئے پیچھے ہٹے، 'ارے اس گوپال پر تو شراب کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا!''

جب وہ چلے گئے تو گوپال کو پتہ چلا کہ اس کے بھی کچھ زخم لگے ہیں۔ جو لوگ اس کی طرف دوڑے، ان میں روزی تھی جو اسے اپنے کیبین میں لے گئی۔

''گوپال، تم تو کہہ رہے تھے اب میں کبھی نہیں پیوں گا۔ آج کیا ہوا جو لڑائی جھگڑا مول لے بیٹھے؟''

''روزی، میں نے تو ایک بوند بھی نہیں پی۔ یہ لڑائی جھگڑا نہیں تھا یہ لوگ مجھے اس بہانے مار ڈالنا چاہتے تھے۔''

''اس جگہ آ کر تم سیٹھ بابو بھائی کو گالی دے رہے تھے، یہ بات بڑی خطرناک ہو سکتی ہے۔''

''کیوں؟ سیٹھ بابو بھائی کا اس جگہ سے کیا تعلق ہے؟''

''تم بھی کتنے بھولے ہو؟ چلو اندر، میرے ساتھ آؤ۔ تمھاری مرہم پٹی کرتی ہوں اور تمھیں بتاتی بھی ہوں۔''

اپنے کمرے کے اندر روزی گوپال کے زخموں پر پٹی باندھتے ہوئے بولی: ''کیا تم نہیں جانتے، سیٹھ بابو بھائی ہی تو اس جگہ کا مالک ہے۔ ہر رات کو یہاں کی سب آمدنی سیٹھ کے آدمی آکر لے جاتے ہیں۔ اس لیے تو اس کے گرگے یہاں رہتے ہیں۔''

''بابو بھائی اور داروخانے کا مالک! ارے واہ! تم نے تو بڑے پتے کی بات بتائی۔ تھینک یو، تھینک یو!''

''آہستہ بولو۔ یہ جگہ بڑی خطرناک ہے اور میری بات مانو تو سیٹھ سے دشمنی لینے سے پہلے یہاں سے بھاگ چلو۔ میں بھی یہ دھندہ چھوڑنا چاہتی ہوں۔''

پھر اس نے کانا پھوسی کی، ''مجھے ایسا لگتا ہے یہاں کوئی خطرناک کام ہو رہا ہے۔ دوسرے دیشوں کے سیلر آتے رہتے ہیں اور سیٹھ کے آدمیوں سے کھسر پسر کرتے رہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم بھی کسی مصیبت میں پھنس جائیں...... چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔''

''نہیں روزی، میں اب میدان چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا۔''

روزی کو حسد بھرا شبہ ہوا، ''کیا ابھی تک اس مالتی کا بخار نہیں اترا؟ پاگل مت بنو ڈارلنگ، سیٹھ کو معلوم ہو گیا تو تمھیں مار ڈالے گا۔''

گوپال کے چہرے پر سخت جذبات ابھر آئے اور اس نے دانت پیس کر کہا، ''اگر اس سے پہلے میں نے سیٹھ کو نہ مار ڈالا......''

O

سونے کا پنجرہ

رات اندھیری اور بھیانک رات!

مالتی اپنے بیڈروم میں تھی۔ اپنے نرم بستر پر آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔

مگر وہ سو نہیں سکی۔

اس نے عجیب عجیب آوازیں سنیں۔

کون ہنس رہا تھا یہ غیر انسانی ہنسی جیسے شیطان ہنس رہے ہوں؟

وہ ڈر گئی لیکن وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کون ہنس رہا ہے؟

وہ اپنے بستر سے اٹھی، ڈریسنگ گاؤن پہنا اور باہر چلی گئی۔

لمبے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے وہ ایک بند دروازے پر آئی۔ دروازہ اسٹیل کا بنا ہوا ہے۔ وہ بینک کے سیف ڈپازٹ لاکر کی طرح ہے لیکن جب اس نے چابی کے سوراخ میں جھانکا تو اسے پتہ چلا کہ یہ تو بالکل الگ طرح کا بینک ہے۔

بند کمرے کے اندر۔۔۔

بابو بھائی بیٹھا ہے' اس کا چاچا!

لیکن اس وقت اس کا روپ کچھ اور ہی تھا۔

ایک رحم دل بوڑھے کے بجائے آج وہ ایک چالاک اور مکار آدمی دکھائی دے رہا تھا۔
اب اس کی لالچی آنکھوں میں ہوس تھی۔ وہ میز پر پڑے سونے کے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا اور ہنس رہا تھا ایک پاگل کی طرح۔

مالتی اسے یوں ہنستے دیکھ کر ڈر گئی۔

وہ سمجھی کہ بوڑھا پاگل ہوگیا ہے۔

وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے کندھوں پر کوئی ہاتھ رکھ رہا ہے۔

وہ چیخی اور پلٹ کر دیکھا۔

''ڈر گئی؟'' رنجیت نے کہا

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ''، وہ سکڑ گئی اور اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''اب ہاتھ لگانے سے کیا شرمانا مالتی۔ بہت جلد ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔ اسی کا تو ریہرسل کر رہا تھا۔''

اس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ وہ بولی، ''کیا بکواس کر رہے ہو؟ کس نے کہا تم سے؟''

''تمھارے چاچا سیٹھ بابو بھائی کے علاوہ اور کون کہہ سکتا ہے— میری وفاداری کا کچھ تو انعام ملنا چاہیے۔ میں ان کے لیے سونے کا انتظام کرتا ہوں۔ بدلے میں وہ مجھے اپنی چاندی جیسی بھتیجی کا ہاتھ دیں گے۔ سودا بالکل نقد اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے۔''

''میں بکاؤ نہیں ہوں۔ تم بھی سن لو اور اپنے سیٹھ صاحب سے بھی کہہ دینا۔''

وہ چلی جا رہی تھی کہ اسی وقت رنجیت نے اسے سختی سے پکڑ لیا اور دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا، ''کہاں جاتی ہو میری جان، اپنے کاکا سے تو ملتی جاؤ۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک خفیہ گھنٹی کا بٹن دبایا جو اندر کی طرف بجتی تھی۔

گھنٹی کی آواز سن کر سیٹھ فوراً کھڑا ہو گیا اور کسی چیز سے سونے کو ڈھک دیا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا۔

''یہ کیا ہے رنجیت؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہ آپ کی بھتیجی ہے سیٹھ صاحب۔'' رنجیت نے مالتی کو گھسیٹتے ہوئے جواب دیا، ''آپ کی

یہ بھتیجی آپ کی ہی جاسوسی کر رہی تھی۔''

''اس کو چھوڑ دو یہاں اور تم جاؤ۔ کل صبح کا تو سب کام تیار ہے؟''

''سب تیار ہے۔ بس آپ کے حکم کا انتظار رہے گا۔ میں جاتا ہوں، مگر اپنے وعدے کا خیال ہے تو اپنی بھتیجی سے کہہ دیجیے میری طرف نفرت سے نہیں...... پیار سے دیکھا کرے۔ گڈ نائٹ سیٹھ صاحب......۔''

''گڈ نائٹ''، سیٹھ نے کہا۔

''گڈ نائٹ مالتی''، رنجیت نے کہا۔

جب رنجیت چلا گیا تو مالتی نے نفرت سے اس کی طرف تھوکا۔

جیوں ہی دروازہ بند ہوا مالتی اپنے چاچا کی طرف پلٹی، ''تو میرے مرحوم والد کی کمپنی کو آپ اسمگلنگ کے لیے استعمال کر رہے ہیں؟''

''اسمگلنگ! کیسی اسمگلنگ؟ تم کیا بات کر رہی ہو؟''

مالتی نے ڈرامائی انداز میں سونے پر سے ڈھکا ہوا کپڑا ہٹادیا۔

''میں اس کی بات کر رہی ہوں جو سونا آپ نے اسمگلنگ کر کے اکٹھا کیا ہے۔ جب آپ پکڑے جائیں گے تو کتنی بدنامی ہوگی ہم لوگوں کی۔''

اب بابو بھائی ایک وحشی آنکھوں والے جنونی کی طرح بات کر رہا تھا، ''اچھا ہوا تمھیں اصلیت کا پتہ چل گیا۔ عمر بھر جس روپے سے تم نے پرورش پائی، تعلیم پائی، وہ یہی سونا ہے ورنہ تمھارے باپ نے جو کمپنی چھوڑی تھی اس کی اصل آمدنی سے تم اتنے بڑے کالج میں تھوڑی پڑھ سکتی تھیں!''

''اچھا ہوتا، اگر میں پڑھی نہ ہوتی جاہل اور ان پڑھ ہوتی۔ کم سے کم ایمانداری کی روٹی کھا کر دنیا میں سر اٹھا کر تو چل سکتی تھی!''

''ان پڑھ، جاہل ہوتیں......'' بوڑھے نے چوٹ کستے ہوئے کہا، ''اور اس بے وقوف، ان پڑھ، جاہل گوپال سے شادی کر لیتی......؟''

''ورنہ اس رنجیت غنڈے سے کرلوں جس کے پلّے آپ مجھے باندھنا چاہتے ہیں۔ اس

غنڈے سے تو گوپال لاکھ درجے اچھا ہے اور ابھی تو اس نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔کون جانے میں کل اسے ہی ہاں کہہ دوں؟''

سیٹھ غصّے میں بول دیتا ہے،''تو پھر سن لے کل سویرے اس کا بھی کام تمام ہو جائے گا!''

یہ سن کر مالتی کو ایک دھکا سا لگا۔

سیٹھ نے مالتی کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر گھسیٹا۔

بابو بھائی کوری ڈور میں مالتی کو گھسیٹتا ہوا لے گیا اور اسے اس کے بستر پر پٹک کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

پھر چلّایا،''چوکیدار!''

سفید یونی فارم پہنے ہوئے چوکیدار ڈرتے ہوئے آیا۔

''جی سیٹھ صاحب!''

''دیکھو مس صاحب کی طبیعت خراب ہے''،اور پھر اپنے سر کی طرف اشارہ کیا،یہ بتانے کے لیے کہ اس لڑکی کا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے۔

پھر تنبیہ کرتے ہوئے کہا،''دیکھو یہ کمرے سے نکلنے نہ پائے۔اگر نکلی تو میں تمھیں گولی مار دوں گا! سمجھے!''

''جی،سیٹھ صاحب''،چوکیدار نے گھبرا کر کہا،''سمجھ گیا! سلام صاحب!''

سیٹھ چھت پر آیا۔

چاروں طرف دیکھا تاکہ اطمینان ہو جائے کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔

ٹیلی اسکوپ کی طرف جا کر اس کا رخ سمندر کی طرف کیا۔

اس میں سے دیکھا تو ایک دھندلا سا جہاز کا خاکہ نظر آیا جو اپنی لائٹ سے سگنل دے رہا تھا،جس کی روشنی بار بار جلتی اور بجھتی تھی۔

لال—

ہری—

لال—

ہری—
اس کے چہرے پر گہرا اطمینان ظاہر ہوتا تھا، لیکن آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک پاگل آدمی کا اطمینان ہے۔

دوسرے دن—
بھاری بکسوں کو وزنی کرینوں کی مدد سے ایک جہاز پر سے اتارا جا رہا تھا۔
رنجیت کے ٹکڑے اور بھیا نک آدمی کرینوں کو چلا رہے تھے۔
کرینوں کے شیڈ کی اونچائی سے ڈوکس پر چلتے پھرتے لوگ ننھی ننھی چیونٹیوں کی طرح نظر آتے تھے۔

ان میں سے ایک رنجیت تھا جو کرین آپریٹرس کو طرح طرح کے سگنل دے رہا تھا۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے باوجود رنجیت ایک ٹیلی فون بوتھ میں گیا۔ ایک نمبر گھمایا اور کہا، ''یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے صاحب!''

دوسری طرف سیٹھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا اور اپنا ناشتہ ختم کر رہا تھا اور فون پر بات بھی کر رہا تھا۔
''تو میں ابھی آتا ہوں!''
پھر وہ میز پر سے اٹھا۔ نوکر کو حکم دیا، ''دیکھو مس صاحب کا ناشتہ ایک ٹرے پر لگا کر ان کے کمرے میں دے دو اور یاد رکھو وہ باہر نہ نکلنے پائیں!''
پھر وہ باہر چلا گیا۔
جس وقت نوکر ناشتہ لگا رہا تھا تو کار کے اسٹارٹ ہونے اور جانے کی آواز آئی۔
نوکر ناشتے کی ٹرے کو مالتی کے کمرے تک لایا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔
مالتی کی آواز سنائی دی، ''کون ہے؟''
''میں ہوں مس صاحب' منوہن آپ کا ناشتہ لایا ہوں!''
''ٹھہرو ابھی نہ آنا میں کپڑے بدل رہی ہوں......''
نوکر مالکن کے کپڑے بدلنے کے خیال سے من ہی من مسکرانے لگا۔
پھر مالتی کی میٹھی آواز سنائی دی، ''اب اندر آ جاؤ منوہن۔''

نوکر جو ابھی تک مسکرا رہا تھا، ٹرے کے ساتھ اندر آیا۔

اس کے سر پر ایک دم مار پڑی۔

ٹرے اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

وہ ٹرے پر بیہوش ہو گیا۔

اور مالتی جھٹ سے نکل کر، دروازہ باہر سے بند کر کے بھاگ گئی۔

O

ایکسیڈنٹ — حادثہ — دُرگھٹنا

ڈوکس —

بھاری کرینیں —

بھاری کرینوں کو اوپر چڑھایا جا رہا تھا۔

بھاری کرینوں کو آہستہ آہستہ سے نیچے اتارا جا رہا تھا۔

سیٹھ کام کا معائنہ کر رہا تھا۔

رنجیت ایک طرف کھڑا تھا۔

کرین آپریٹر کڑی نگرانی کر رہے تھے۔

کچھ قلی بھاری بوجھ اٹھا کر لے جا رہے تھے۔

وہ کرینوں کے نیچے سے گزر رہے تھے۔

ان کے پیچھے گوپال بھاری بوجھ اٹھائے آ رہا تھا۔

اس کے پیچھے اندو آ رہی تھی۔

وہ اس سے کچھ کہہ رہی تھی کچھ بحث کر رہی تھی۔

سیٹھ اس کو دیکھ رہا تھا۔ اور رنجیت سیٹھ کی طرف۔

اندر گوپال سے کہہ رہی تھی، ''گوپال، تم یہاں کام کرنا چھوڑ دو۔ مجھے تمھاری جان کی طرف سے بڑی فکر ہے......''

''اری تو اپنی فکر کر......''

سیٹھ کا ہاتھ سگنل کے لیے اٹھا۔ پھر نیچے آیا۔ پھر رنجیت کا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا۔

مالتی اپنے چاچا کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی۔

کرین آپریٹر نے پہیے کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اندرا اوپر کی طرف دیکھنے لگی۔۔ دیکھتی ہے کہ کرین کی پیٹی تیزی سے نیچے کی طرف گر رہی تھی۔

ایک دم اس نے گوپال کو آگے کی طرف دھکا دے دیا۔

گوپال اپنے وزن کے ساتھ گر گیا۔

اس سے پہلے کہ اندرا اپنے آپ کو بچا سکے۔ وزنی پیٹی اس پر گر گئی اور اسے اپنے نیچے کچل دیا۔

سب لوگ اس طرف دوڑ پڑے جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔

جب سیٹھ آگے بڑھا تو اس نے مالتی کو دیکھا۔ وہ غصّے میں بھرا اس کے پاس گیا۔

وہ غصّے میں برس پڑا، ''تم یہاں کیا کر رہی ہو......؟''

جب اسٹریچر لانے والے، ڈاکٹر، قلی، ڈوکس مزدور سب حادثہ کی جگہ دوڑے ہوئے گئے۔ سیٹھ اور مالتی اکیلے کونے میں کھڑے تھے۔

مالتی کا چہرا زرد ہو گیا تھا۔ اس کے گالوں سے خون اڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ تھا اور وہ کچھ اونچی کانا پھوسی کی آواز میں بول رہی تھی، ''تو تم نے اس کو مار ڈالا، تم نے اس کو مار ڈالا، سیٹھ بابو بھائی!''

''کیا بک رہی ہو؟'' سیٹھ نے کہا اور ایک زور کا تھپڑ رسید کیا جس نے مالتی کو خاموش کر دیا۔

وہ مالتی کو کار کی طرف کھینچ کر لایا۔ اس میں بیٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا اور ڈرائیور سے کہا، ''گھر کی طرف گاڑی کو تیز چلاؤ! ......مس صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔۔ اتنا بھیانک ایکسی ڈنٹ دیکھا ہے نا......!''

گاڑی چلنے لگی۔

اسٹریچر لانے والوں نے اندو کے کچلے ہوئے جسم کو لال کمبل سے ڈھک دیا۔

گوپال کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ وہ پہلے تو ڈبڈبائی آنکھوں سے مری ہوئی اندو کو دیکھتا رہا، پھر اس نے اوپر کرین کی طرف دیکھا—اور پھر جیسے اس کی آنکھوں میں بدلے کی آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

آگ—

چتا کے شعلے—

اندو کی چتا!

اور صرف دو آدمی اس جلتی ہوئی چتا کو دیکھ رہے تھے۔ گوپال اور سکھارام اندو کا باپ، جو ہمیشہ کی طرح نشے میں تھا۔

وہ اپنے آپ سے کچھ بڑبڑا کر کہہ رہا تھا۔

جب چتا کے شعلے ٹھنڈے پڑ گئے، گوپال سکھارام کے پاس گیا۔

''چلو کاکا!''

''کہاں؟'' مدہوشی کی آواز میں بوڑھے نے جواب دیا، ''اپنی اندو کے پاس یا اس کے امر بھیا کے پاس؟''

پھر اس کی یادوں میں ایک خیال جاگ اٹھا۔ ایک روشنی آنکھوں میں ٹمٹمانے لگی—''یا ان سے بھی دور— تمھارے باپ نندو پہلوان کے پاس—یا مالتی کے والد متو بھائی کے پاس؟''

''کیا کہہ رہے ہو کاکا؟ میرے باپ کا مالتی کے پتا سے کیا تعلق؟''

''کیا تعلق؟ دوستی کا تعلق۔ مالک اور مزدور کی دوستی کیسے ہو سکتی ہے؟ لوگ تب بھی کہتے تھے یہ ہو ہی نہیں سکتا مگر ایسا تھا۔ تمھارا باپ مزدوروں کا بزرگ تھا، ان کا سرپرست تھا۔ متو بھائی کی چھوٹی سی کمپنی تھی۔ کوئی بڑا کاروبار نہیں تھا، مگر ان دونوں کی بڑی دوستی تھی، متو بھائی جو کبھی خود مزدور تھا، مزدوروں سے اچھی طرح پیش آتا تھا۔ اس نے تمھارے باپ سے مل کر مزدوروں کو کمپنی میں ساجھے دار بنانے کی ایک یوجنا بنائی تھی۔ لوگ کہتے تھے مالک اور مزدور بھی ایک ہو سکتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو متو بھائی اور نندو پہلوان کو دیکھ لو اور پھر ان دونوں دوستوں کا خاتمہ بھی

ایک ساتھ ہوا۔"

"کیا ہوا؟" اس کی کہانی سے متاثر ہو کر گوپال نے پوچھا۔

"ایک دن دونوں دوست جا رہے تھے۔ میں پیچھے پیچھے باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا کہ وہی ہوا جو آج ہوا ایک بڑی لوہے کی چٹی ان پر آ گری۔ میری ٹانگ گئی ان کی جان گئی......"

"اور یہ بھی جان بوجھ کر کیا گیا......"

"بابو بھائی نے اپنے بڑے بھائی اور اس کے دوست کی جان لی، اور مالک بن بیٹھا۔ کمپنی کو اپنے ڈھنگ سے چلانے لگا۔ بھائی کے بغیر بن ماں کی بیٹی کو بورڈنگ میں بھرتی کرا دیا۔ میرا منہ بند کرنے کے لیے پچاس روپے مہینہ کی پنشن مقرر کر دی۔ تو اس وقت دو برس کا تھا۔"

"بس کا کا بس۔" گوپال نے سختی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ غصے میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے غصے میں کہا،"اب مجھے اپنی ذمہ داری معلوم ہو گئی ہے۔"

اسی رات۔۔۔

گوپال کے ہاتھ میں ایک خنجر۔

وہ بابو بھائی کے بنگلے کی دیوار پر چڑھ رہا تھا۔

گھر میں داخل ہو رہا تھا

کھڑکی میں سے جلتی ہوئی روشنی دیکھی۔

احتیاط سے اس نے کھڑکی کے اوپر روشندانوں میں سے جھانکا۔ دیکھ کر اسے دھکا سا لگا۔

بیڈ روم میں۔۔۔

مالتی بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے منہ کو کپڑے سے بند کر دیا گیا تھا۔

ابھی تو وہ چھوٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بابو بھائی اس کے پاس کھڑا تھا اور ایک ڈاکٹر اس کے ہاتھ میں انجکشن لگا رہا تھا۔

گوپال چیخ کر شور مچانا چاہتا تھا لیکن پھر اپنے دل کو مضبوط کر کے اپنے آپ کو روک دیتا ہے۔

انجکشن دینے کے بعد بابو بھائی اور ڈاکٹر محسوس کرتے ہیں کہ مالتی کا جسم ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ انجکشن کے ذریعے اس کو نشیلی دوا دے دی گئی ہے۔ اب وہ اس کے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھول

دیتے ہیں۔ وہ آزاد ہے کہیں بھی جانے کے لیے۔ کچھ بھی کرنے کے لیے — لیکن وہ کچھ بھی نہیں کرتی ہے — کچھ بھی نہیں کر سکتی ہے —

لیکن بابو بھائی دوائی کے اثر کا امتحان لینا چاہتا ہے۔

اس نے مالتی سے پوچھا، ''اب بھاگنے کی کوشش تو نہیں کرو گی؟'' اس نے چابھی کے ایک کھلونے کی طرح اپنا سر ہلایا۔

''آج جو تم نے دیکھا تھا — اس مزدور لڑکی کی موت — وہ ایک ایکسی ڈنٹ تھا سمجھیں نہ — کہو ایکسی ڈنٹ — حادثہ — درگھٹنا!''

مدہوشی کے عالم میں مالتی نے ہلکے سے کہا، ''ایکسی ڈنٹ — حادثہ — درگھٹنا!''

''آج سویرے کیا ہوا تھا؟'' بابو بھائی نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

دوبارہ پھر مالتی نے مدہوشی کے عالم میں، بے جان سی ہو کر، ہلکے سے کہا، ''ایکسی ڈنٹ — حادثہ — درگھٹنا!''

ڈاکٹر نے بابو بھائی سے پوچھا، ''اب تو آپ SATISFY ہو گئے سیٹھ صاحب؟''

''ہاں — معلوم ہوتا ہے کام تو کیا ہے اس انجکشن نے!''

''تو میری فیس مل جانی چاہیے سیٹھ صاحب!'' ڈاکٹر کی اس درخواست کے پیچھے ایک دھمکی چھپی ہوئی تھی۔

''فیس! ہاں بھئی وہ بھی مل جائے گی آپ کو۔''

اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیٹھ نے کچھ نوٹ نکالے — ''پچاس روپے — سو روپے؟''

ڈاکٹر نے سختی سے کہا، ''آپ مذاق کر رہے ہیں سیٹھ صاحب۔'' اس کی آنکھوں میں ایک خطرناک چمک تھی۔

''اچھا بھئی، اب یہی ہیں میرے پاس — یہ لو اور جاؤ یہاں سے!''

اس کے ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل ٹھونس دیا اور اسے اپنے پیچھے کا دروازہ بند کر کے راستہ دکھایا۔

ان کے جانے کے بعد گوپال اندر کے کمرے میں کودا۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند کر دیں اور مالتی کے پاس گیا۔

"مالتی! مالتی!!" اس نے کانا پھوسی کی۔

مالتی نے نہ جواب دیا، نہ اس کو پہچانا۔

"مالتی جانتی ہو میں کون ہوں؟ گوپال!"

"میں تمھیں نہیں جانتی۔"

"مالتی جانتی ہو آج سویرے کیا ہوا تھا؟"

"ایک ایکسی ڈنٹ — حادثہ — درگھٹنا!"

"مالتی ہوش میں آؤ۔ تمھاری جان خطرے میں ہے۔ یہ تمھیں بھی مار ڈالے گا جیسے تمھارے پتا جی کو مار ڈالا تھا۔ میرے بابا کو مار ڈالا تھا......"

آخرکار "پتا جی" لفظ پر مالتی کے چہرے پر ردِ عمل ہوتا ہے۔

"پتا جی کو کیا ہوا؟" ایک بچی کی سی آواز مالتی کے ہونٹوں سے نکلی۔

"تمھارے پتا جی کو بابو بھائی نے مار ڈالا۔ ساتھ میں میرے بابا کو بھی......"

مالتی کی کھلی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں، جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ ایک مدُھر سا سنگیت اس کی یادوں سے ابھرنے لگا۔ اب اس کی آنکھیں وہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں جب وہ ایک بچّی تھی —

ایک چھوٹی بچّی اپنے باپ کی گود میں تھی۔ یہ اسے چومتا ہے اور اس کو بچہ گاڑی میں رکھ دیتا ہے۔

پھر وہ اپنے دوست کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ بھاری کرینوں کے نیچے ٹہل رہے ہیں۔

جوان بابو بھائی سگنل دیتا ہے۔

ایک بھاری پیٹی ان دونوں پر گرتی ہے۔ وہ دونوں کچل جاتے ہیں۔

لوگ دوڑتے ہیں۔

لوگوں کی بھاگ دوڑ میں بچہ گاڑی کو دھکا لگتا ہے اور وہ ٹکرا کر نیچے گر جاتی ہے۔

اس کے ننھے پہیے گھومنے لگتے ہیں۔

بے بی مالتی رونے لگتی ہے۔

چلانے لگتی ہے......۔

اور اب بڑی مالتی رونے لگی۔۔ اور ایسا لگتا تھا کہ نشہ آور دوا کے زہر کو اس کے آنسو دھو رہے ہیں۔

''تھینک یو گوپال!'' آخر کار اس نے کہا،''لیکن یہ سب تمھیں کیسے معلوم ہوا؟''

''اندو کے بابا نے آج اپنی بیٹی کی جلتی ہوئی چتا کے سامنے سب کچھ کہہ ڈالا۔''

''وہ میرے کاکا ہیں۔ مگر سونے کی لالچ نے ان کو پاگل بنا دیا ہے!''

باہر قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

گوپال اچھل کر کھڑکی میں سے کود جاتا ہے۔

سیٹھ رنجیت کے ساتھ لوٹتا ہے۔

مالتی پھر روپ دھار لیتی ہے جیسے دوائی کا اس پر اب بھی اثر ہو۔

سیٹھ نے کہا،''اس ڈاکٹر نے کمال کا انجکشن دیا ہے۔''

دوا کے اثر کا پتہ لگانے کے لیے سیٹھ مالتی سے پوچھتا ہے،''آج سویرے کیا ہوا تھا؟''

مالتی نشہ آور دوا والا ناٹک دہراتی ہے،''آج سویرے جو ہوا وہ ایک ایکسی ڈینٹ۔۔ ایک حادثہ۔۔ ایک درگھٹنا!''

سیٹھ رنجیت سے کہتا ہے،''رنجیت، تم مالتی کو سہارا دے کر کار میں لے چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

رنجیت کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ وہ مالتی کو سہارا دیتا ہے۔ اپنا ہاتھ مالتی کی کمر میں ڈالنے لگتا ہے۔

گوپال کھڑکی میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

رنجیت مالتی کو اٹھا کر باہر لے جاتا ہے۔

O

انجام یا آغاز

کار—

رنجیت اسٹیئرنگ وہیل کے پاس بیٹھا تھا۔

سونے کی تین بوریاں اس میں لادی جاتی ہیں۔

مالتی ڈھونگ رچاتی ہے اور ہر چیز دیکھتی ہے۔

سیٹھ اس کے پاس بیٹھتا ہے۔

''چلو رنجیت''، وہ حکم دیتا ہے۔

رنجیت گاڑی کو گیئر میں لیتا ہے۔ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ کار کے پیچھے جان کو خطرے میں ڈال کر گوپال اسٹپنی کو پکڑے ہوئے ہے۔

آدھی رات کو بمبئی کی سڑکیں چمک رہی ہیں۔

''گڈ بائی بمبئی انڈیا''، سیٹھ نے کہا۔

''کیا آپ ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں؟''

''ہاں رنجیت— اب اس ملک میں شریف آدمی کا رہنا مشکل ہو گیا ہے۔''

''مگر سامان تو اپنے ساتھ کچھ لیا نہیں؟''

''جس کے پاس سونا ہے اس کو سامان ہر جگہ مل سکتا ہے!''

''اور میرا کیا ہوگا سیٹھ صاحب؟ مالتی کو آپ لیے جا رہے ہیں؟''

''ہاں مالتی، مالتی کا اب یہاں رہنا خطرناک ہے۔ نا جانے، کب کیا بک دے؟''

اب کار ایک ویران ساحل پر پہنچتی ہے۔

گوپال اپنے آپ کو اونچے مٹی کے ٹیلوں میں چھپا دیتا ہے۔

ایک چھوٹی سی کشتی ان کا انتظار کر رہی ہے۔

سیٹھ مالتی کو کشتی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس کو کشتی میں بٹھاتا ہے۔

''آؤ رنجیت ہاتھ بٹاؤ''، سیٹھ سونے سے بھری تین بوریوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔

دونوں مل کر ایک بوری کشتی میں لے جاتے ہیں۔

پھر وہ دوسری بوری چڑھاتے ہیں۔ یہ بہت وزنی ہے۔ ریت پر گر جاتی ہے۔ سونے کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔

جب وہ تیسری بوری کے لیے آتے ہیں۔ رنجیت اسے چڑھانے سے انکار کرتا ہے۔

''اس کو وہیں رہنے دیجیے''، اس کے لہجے میں سختی ہے،''مجھے بھی تو اپنا حصہ چاہیے۔''

پاگل پن اور ہوس کا لالچ سیٹھ کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

''اگر تم چاہو تو لے سکتے ہو''، سیٹھ اس سے کہتا ہے اور اچانک ریوالور نکال لیتا ہے۔ اس کی طرف نشانہ لگاتا ہے— ''لے لو! لے لو!''

رنجیت بوکھلا کر ہنسنے لگا،''میں تو مذاق کر رہا تھا، سیٹھ صاحب۔''

''تو اٹھاؤ اسے......۔''

''اکیلا؟ آپ بھی تو ہاتھ لگایے۔''

''نہیں! اب تم اسے اکیلے ہی اٹھاؤ گے— میرے ہاتھ خالی نہیں۔'' اور اسے دھمکاتے ہوئے اپنے ہاتھ میں ریوالور لہرایا۔

آخر کار رنجیت نے وزنی بوجھ اٹھایا۔ ایک دو قدم چلنے کے بعد وہ ریت میں الجھ گیا اور

گر گیا۔ سونے کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

اس وقت کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو کار تیزی سے شہر کی طرف جا رہی تھی۔

سیٹھ نے دوڑتی ہوئی کار پر ایک دو فائر کیے۔ گوپال کے ہاتھ میں ایک گولی لگی۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح کار چلاتا رہا۔

کار—

گوپال کار کو تیزی سے چلا رہا ہے۔

کار پولیس کے اینٹی کرپشن برانچ کے پاس آ کر رکتی ہے۔

گوپال انسپکٹر کے دفتر میں تیزی سے داخل ہوتا ہے۔

''انسپکٹر صاحب''، گوپال کہتا ہے، ''میں سونے کی اسمگلنگ کی خبر لایا ہوں۔''

''لیکن مجھے تو لگتا ہے، آپ کسی کا خون کر کے آئے ہیں''، انسپکٹر نے گوپال کے ہاتھ پر لگے ہوئے خون کو دیکھ کر کہا، ''آئندہ کسی کا خون کرو تو پولیس کے پاس آنے سے پہلے ہاتھ تو دھولیا کرو۔''

اب گوپال نے اپنے ہاتھ پر لگے خون کے دھبوں کو دیکھا۔

''انسپکٹر صاحب میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ کسی نے میرا خون کرنے کی کوشش کی ہے— مگر وقت نہیں ہے— آیئے میرے ساتھ.....''

دونوں چل پڑے۔

گہرے سمندر میں—

چھوٹی سی کشتی جا رہی تھی، رنجیت اسے کھے رہا تھا۔

خفیہ طریقے سے مالتی اپنی ساڑی کا پلو پھاڑ رہی تھی اور اسے پانی میں پھینک رہی تھی۔ کبھی کبھار اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر وہ ربڑ ٹائر یا فلوٹ بائے پانی میں پھینک دیتی تھی۔

چھوٹی سی کشتی ایک بڑے لانچ کے پاس پہنچتی ہے۔
مالتی کو اس کے اوپر دھکیلا گیا۔
پھر سونے کی بوریوں کو اس میں لادا گیا۔
پہلی —
پھر دوسری —
جب رنجیت تیسری بوری لانچ میں رکھ رہا تھا تو بابو بھائی نے دھکا دے کر کشتی کو الگ کر دیا اور فوراً جیب سے ریوالور نکال کر اسے گولی مار دی۔
رنجیت اب تک بوری کو پکڑے ہوئے تھا، ڈگمگا کر بوری کے ساتھ پانی میں گر گیا۔
لانچ چلنے کے لیے تھی لیکن سیٹھ نے اس کو ٹھہرنے کا حکم دیا، ''روکو! روکو! ٹھہرو! بیوقوفوں! پہلے پانی میں سے میرا سونا تو نکالو — جو جتنا سونا نکال کر لائے گا میں اس کا آدھا سونا اسے انعام میں دوں گا۔''
کئی سیلر پانی میں کود پڑتے ہیں۔
جیسے ہی اسٹیمر چلنے کو ہوتا ہے، روشنی کا دائرہ اسٹیمر کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے اور اندھیرے کو چیرتی ہوئی انسپکٹر کی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے —
''ٹھہر جاؤ! ڈاکوؤ......''
اسٹیمر کی سرچ لائٹ چاروں طرف گھومتی ہے۔ اس کو بمبئی پولیس کی ایک لانچ نظر آتی ہے۔ انسپکٹر ایک لاؤڈ اسپیکر سے بولتا ہے۔ اس کے پاس ہی گوپال کھڑا ہے۔
''اب تم بچ نہیں سکتے''، انسپکٹر کہتا ہے، ''ہتھیار پھینک دو اور اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔''
سیٹھ بابو بھائی آپے سے باہر ہو کر بولا، ''یہ سب اس گوپال کا کیا دھرا ہے''، اس نے کانا پھوسی کے انداز میں کہا، ''یاد رکھو اس بار بوٹ میں ایک لڑکی بھی ہے دیکھوا سے اچھی طرح سے!''
اس نے اپنے سرچ لائٹ کو آف کر دیا تا کہ لانچ کی روشنی اسٹیمر کے ڈیک پر پڑے پھر مالتی کو روشنی کے دائرے میں دھکیل دیا۔

گوپال نے مالتی کو دیکھا وہ مجبور ہو گیا۔

اب سیٹھ کی آواز آئی، ''اس بوٹ میں کافی ڈائنامائٹ ہیں۔ اگر تم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو پورے اسٹیمر کو اڑا دیا جائے گا......اور ساتھ میں لڑکی کو بھی......''

پولیس بے بس ہو گئی۔

اسٹیمر نے حرکت کرنی شروع کی۔

سیٹھ کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا نشانہ مالتی کی طرف تھا۔

جب اسٹیمر گھوما تو گوپال نے انسپکٹر سے کہا، ''انسپکٹر صاحب، آپ اپنی بوٹ کو یہیں رکھیے۔ میں اس اسٹیمر کو واپس لاتا ہوں......''

خاموشی سے وہ پانی میں کود پڑا۔ اندھیرے میں تیرتا ہوا وہ مڑے ہوئے اسٹیمر کی طرف گیا۔ اسٹیمر کے برابر پہنچ کر اندھیرے میں ایک رسی کا سہارا لے کر اوپر چڑھا۔

اسٹیمر اندھیرے میں آگے بڑھا۔

سیٹھ خوش ہوا اور مالتی کو ایک کیبن میں دھکیل کر سیلروں سے بولا، ''شاباش بہادرو — پیو — اب ہم خطرے سے باہر نکل آئے۔

سب نے شراب پینی شروع کر دی۔

موقعے سے فائدہ اٹھا کر گوپال اسٹیمر کے ڈیک پر آ گیا۔

اسٹیرنگ وہیل کے قریب نگرانی کرتے ہوئے ایک سیلر کو اس نے شراب کے نشے میں دھت پایا۔

گوپال نے اس کو ایک مکا رسید کیا۔ سیلر گرا۔ پھر اس نے سیلر کا کوٹ پہن لیا۔

بیہوش سیلر کو تارپولین کے ایک ٹکڑے سے ڈھک دیا اور خود وہیل کے پاس کھڑا ہو گیا۔ آہستہ سے اس کو پلٹایا کہ کوئی دیکھ نہ سکے۔

ایک بار سیٹھ بھی، جو نشے میں تھا، اس راستے سے گزرا۔

اس سیلر کو دیکھا جو وہیل کے پاس ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

اس سے بولا، ''شاباش— سیدھے چلائے چلو بہت جلد ہم ہندوستان کی سمندری سرحد کو پار کر جائیں گے۔''

اپنے کیبن میں مالتی مایوس ہوتی جارہی تھی۔

دروازہ بند تھا۔

اس نے پورٹ ہول کھولا۔

دب دبا کر اس میں سے باہر نکل گئی اور ڈیک کے کنارے پر گئی۔ اچھلتے ہوئے گہرے پانی کو دیکھا۔

وہ اس میں کود کر اپنی زندگی کو ختم کر دینا چاہتی تھی مگر ایک طاقتور ہاتھ نے اس کو پکڑ لیا۔

اس نے اپنے محافظ کو دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔

یہ گوپال تھا— انگلی کے اشارے سے اس نے مالتی سے کہا کہ وہ خاموش رہے۔

اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ سوچتی ہے کہ کہیں نظر کا دھوکا تو نہیں۔ جب اسے یقین ہوا کہ یہ حقیقت ہے تو وہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کی بے چینی ختم ہوگئی۔

''یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے گوپال!''

''تم مجھے مل گئیں اب میں مرنے کو تیار ہوں۔''

پھر اس نے مالتی کے کانوں میں کانا پھوسی کے انداز میں کہا اور آگے کی طرف اشارہ کر کے بتایا جہاں سویرے کی ایک ہلکی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی۔

''تیرنا آتا ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔

سیٹھ بابو بھائی نشے میں دھت ابھی تک سو رہا تھا۔ ایک سیلر دوڑ کر اس کے پاس آیا۔

''پولیس! پولیس!'' وہ چلایا۔

سیٹھ باہر آیا اور اسٹیمر کو پولیس کی کئی لنچوں سے گھرا ہوا دیکھا۔

''سیٹھ بابو بھائی''، انسپکٹر کی آواز آئی، ''اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔''

سیٹھ اب بالکل پاگل ہو گیا۔

وہ چلایا،'' قانون! کون سا قانون؟ جس کے پاس سونا ہوتا ہے وہ ہر قانون سے بڑا ہوتا ہے۔ میرے پاس اتنا سونا ہے کہ میں تم سب کو خرید سکتا ہوں۔''

پھر وہ سیلر لوگوں سے کہتا ہے۔''جس کو بھاگنا ہے بھاگ جائے۔ جس کو اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنا ہو کر دے۔ میں اس اسٹیمر کو ڈائنامائٹ سے اڑانے والا ہوں۔ مجھے میرے سونے سے کوئی الگ نہیں کر سکے گا۔

سیلرس پانی میں کود پڑتے ہیں۔ پانی میں تیرنا شروع کر دیتے ہیں۔

سیٹھ چلایا،''مگر میں اکیلا نہیں مروں گا، گوپال۔ مالتی بھی میرے ساتھ جا رہی ہے!''

''نہیں کاکا جی!'' لانچ پر نمودار ہوتے ہوئے مالتی چلائی،'' میں یہاں ہوں۔ اپنی جان مت دیجیے۔''

''سیٹھ بابو بھائی''، گوپال چلایا،'' سونا جان سے زیادہ پیارا نہیں ہے۔''

''سونا میری جان سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ سونا ایمان ہے۔ سونا میرا دھرم ہے۔''

اسی وقت ایک دھماکہ ہوا! اسٹیمر آگ کی لپٹوں سے جل کر راکھ ہو گیا۔

ہاتھ میں ہاتھ دیے۔ پھولوں کے ہاروں سے لدے۔ نئے شادی شدہ گوپال اور مالتی مزدوروں کی بستی میں آئے تو ڈوک مزدوروں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔

O

جوالا مکھی

(نامکمل جاسوسی ناول)

پہلا باب

ایک عجیب خط:

بمبئی میں ہوٹل اور چائے کی دوکانیں تو ہزاروں ہیں لیکن ان میں ''ہندوستانی ہوٹل'' ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ صرف دو سال کا عرصہ ہوا اس کو ایک تعلیم یافتہ نوجوان احمد بیگ نے جاری کیا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی مدت میں عمدہ چائے، لذیذ کھانوں اور احمد بیگ کے اخلاق کی بدولت گاہکوں کی اتنی افراط ہوئی کہ نیچے کی دوکان کی اوپر والی منزل پر چند کمرے لے کر وہاں بھی نشست کا انتظام کرنا پڑا۔ جو لوگ چائے نوشی کے ساتھ اطمینان سے باتیں کرنا چاہتے تھے وہ اوپر ہی بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ احمد بیگ کے دوست بھی اگر آتے تو وہ ان کو بھی لے کر اوپر چلا جاتا اور گھنٹہ دو گھنٹہ گپ شپ میں گزارتا۔

اس کے دوست بھی ہر قسم کے تھے۔ بعض فقط بازاری دوست جن سے کاروبار کے سلسلے میں ملاقات رہتی تھی۔ بعض اس کے کالج کے پرانے ساتھی جو مفت کی چائے پینے اکثر آجاتے تھے۔ حالانکہ جب بی اے کرنے کے بعد احمد بیگ نے چائے کی دوکان کھولی تھی تو ان سب نے

اس کا مذاق اڑایا تھا۔ بعض نے تو اس کا نام "بیگ بھٹیارا" رکھ دیا تھا۔ مگر احمد بیگ نے ان کی پھبتیوں کی پروا نہ کی اور اپنے کام سے کام رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال میں وہ ایک نہایت کامیاب ہوٹل کا مالک تھا اور وہ لوگ اب تک اخباروں کی "ضرورت ہے" کے اشتہارات کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان اوچھے مفت خوروں کے علاوہ صرف دو نوجوان ایسے تھے جن کو احمد بیگ واقعی اپنا سمجھتا تھا۔ ایک رام لال۔ دوسرا انور۔ آج یہ کئی دن کے بعد نظر آئے تو احمد بیگ فوراً ان کو ساتھ لے کر اوپر چلا گیا۔ یہ دونوں بھی آپس میں گہرے دوست تھے۔ انور نے ڈاکٹری کی تعلیم پائی تھی۔ اول درجہ میں ایم بی بی ایس پاس کیا تھا۔ لیکن باوجود دو سال کی کوشش کے اس کا مطب کامیاب نہ ہو سکا۔ مریض تو بہت آئے اور اس کی تشخیص اور علاج کی بدولت ہزاروں نے شفا پائی مگر اس کا مطب کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ جس جگہ اس کا مطب تھا وہ غریبوں کا محلّہ تھا۔ ان بیچاروں کے پاس اتنا پیسہ کہاں کہ ڈاکٹر کی فیس دے سکیں۔ وہ لوگ زیادہ تر ملوں میں کام کرتے تھے۔ دس بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد آٹھ آنے مزدوری ملتی۔ اس میں سے مکان کا کرایہ دیں، بیوی بچوں کا پیٹ بھریں یا ڈاکٹر کی فیس دیں۔ انور کا مطب کھلنے سے پہلے ان کا علاج کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سرکاری اسپتال وہاں سے دور تھا اور نزدیک کے ڈاکٹر بغیر چار روپے رکھوائے نبض پر ہاتھ نہ رکھتے تھے۔ انور ان کا علاج کرتا، اپنے پاس سے دوا دیتا۔ اگر کوئی مریض بیماری کی وجہ سے کام پر نہ جا سکتا تو حتیٰ المقدور اس کی مالی امداد بھی کرتا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انور مزدوروں میں ہر دل عزیز ہو گیا لیکن آمدنی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ امیر، اول تو اس محلے میں رہتے ہی نہ تھے۔ یہ اندھیرے، بدبودار، شکستہ مکان جن میں ہوا کا گزر نہ روشنی کا۔ یہاں بھلا امیروں کا کہاں گزر۔ یہ تو ان بدقسمتوں کی رہائش کے لیے تھے جو دن بھر خون پسینہ ایک کر کے مالا بار ہل پر رہنے والے سیٹھوں کی عیاشی کے لیے دولت پیدا کرتے تھے۔ انور کے کامیاب علاج کا شہرہ سن کر آس پاس کے چند متوسط درجہ کے لوگ ضرور آئے مگر بعض تو اس کے مطب میں مفلس اور بدحال مزدوروں کی بھیڑ دیکھ کر واپس چلے گئے۔ کسی کو یہ ناگوار گزرا کہ ان کو آتا دیکھ کر ڈاکٹر کرسی سے کیوں کھڑا نہ ہوا، کوئی یہ دیکھ کر واپس چلا گیا کہ مفت علاج کرنے والے مزدوروں کو چھوڑ کر انور نے فوراً ان کی طرف توجہ کیوں نہ کی۔ ایک صاحب جن کا پیشہ سٹہ سے

روپیہ کمانا اور اپنی فرضی بیماریوں کا حال ہر شخص کو سنانا تھا، ایک روز انور کے پاس آئے اور کہنے لگے ''ڈاکٹر صاحب ہم کو معدے کی شکایت ہے کھانا ٹھیک ہضم نہیں ہوتا۔ ہم کو کوئی اچھی دوائی دو''۔ انور نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد ان سے کہہ دیا آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ مرغن کھانے چھوڑ دیجیے اور صبح کو دو میل دوڑا کیجیے''۔ پھر کیا تھا سیٹھ صاحب کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا اور چیخ کر بولے ''ہمارے پاس موٹر کار ہے، تم ہم کو پیدل چلانا مانگتا ہے۔ تم کیسا ڈاکٹر ہے؟'' انور نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے اور پاؤں پٹخ کر چلے گئے۔ کلب میں جا کر سب دوستوں سے ''مزدوروں والے ڈاکٹر'' کی خوب برائی کی۔ ایک دوسرے ڈاکٹر سے ستائیس روپے کی دوا خرید لائے اور رات کو چار سو روپے سٹہ میں ہار گئے۔

اسی زمانے میں انور کی ملاقات رام لال سے ہوگئی، جو اس سے علاج کرانے آیا تھا۔ رام لال بھی انور کی طرح شمالی ہندوستان کا رہنے والا تھا۔ دونوں کو مدت کے بعد ایک صاف اردو بولنے والا ملا تھا۔ اکثر ملاقات رہنے لگی۔ رام لال بمبئی میں نقاشی اور مصوری سیکھنے آیا تھا۔ آرٹ اسکول سے اعزاز کے ساتھ ڈپلوما حاصل کیا۔ پھر اس خیال سے کہ اپنے قصبے سے زیادہ مواقع بمبئی میں ہیں، یہیں کام شروع کیا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں اور نقش نمائشوں میں انعام پاچکے تھے۔ آرٹ کے نقادوں نے ان کی تعریف کی تھی۔ اس بنا پر اس کو امید تھی کہ اس کی تصویریں بک جایا کریں گی۔ لیکن سال بھر میں معلوم ہو گیا کہ فن کا خریدار کوئی نہیں۔ اس کے پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر امیر اور رئیس اس کی تصویروں کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے۔ ایک لکھ پتی سیٹھ نے اپنی تصویر بنوائی۔ رام لال نے نہایت محنت سے تصویر تیار کی، لیکن سیٹھ صاحب کی شکل جس قدر بھیانک اور خوف ناک تھی ہو بہو ویسی ہی تصویر میں بنا دی۔ سیٹھ صاحب نے تصویر اٹھا کر پھینک دی اور رام لال کو ایک کوڑی دینے سے بھی انکار کر دیا اور پانچ سو روپے میں ایک انگریز مصور سے تصویر بنوائی جو ان کی شکل سے تو مشابہ نہ تھی مگر اس میں وہ بالکل بیس برس کے خوبرو نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ رئیسوں سے تنگ آ کر رام لال نے اخباروں کی طرف توجہ کی۔ انگریز مالکوں کے اخباروں میں وہ کام نہ کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستانی اخباروں نے ہاتھوں ہاتھ اس کی تصویروں اور کارٹونوں کو لیا اور انھیں نہایت اہتمام سے شائع کرنا شروع کیا لیکن کئی ہزار روپے ماہوار منافع

کمانے والے مالکوں اور ہزار بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے ایڈیٹروں نے اس کو معاوضے میں ایک پائی بھی دینے سے انکار کر دیا۔ جب اس نے معاوضہ مانگا تو اس سے کہا گیا کہ قومی اخباروں کی حالت ابھی اس قابل نہیں ہے کہ اپنے معاونین کو معاوضہ دے سکیں اور ساتھ ہی اس کو قوم پرستی اور حریت کا واسطہ دے کر امید ظاہر کی کہ وہ آئندہ بھی ایک قومی اخبار کے لیے مفت تصویریں اور کارٹون بناتا رہے گا۔ رام لال نے ایک دوسطری جواب میں اس امید کا خاتمہ کر دیا۔ اخبار کے منیجر کو اس نے لکھا، ''مکرمی! اگر فقط ہوا پھانک کر زندہ رہنے کا نسخہ آپ کو معلوم ہو تو مجھے بھی عنایت کیجیے۔ قومی اخباروں کے لیے کام کرنے والوں کو اس نسخہ کی اکثر ضرورت رہتی ہے۔''

انور اور رام لال دونوں مفلسی کی وجہ سے اپنے اپنے پیشے سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ شام کے وقت اکثر ٹہلنے نکل جاتے اور مستقبل کے لیے منصوبے باندھا کرتے۔ کفایت کے لیے دونوں نے ایک ہی کمرہ میں رہنا شروع کر دیا اور فیصلہ کیا کہ کوئی مشترک کام کیا جائے، جس سے دونوں کے لیے آمدنی کی صورت ہو۔ درجنوں تجاویز پر بحث کی گئی۔ مگر کوئی بات طے نہ پائی۔ ایک دن رام لال نے کہا ''یار، انور تم نے سراغ رسانی کی کتابیں تو پڑھی ہوں گی۔'' انور نے کانن ڈائل، ایڈگر والس اور مارس لبلانک کی درجنوں کتابوں کے نام لے ڈالے۔

''لیکن یہ پوچھنے کا مطلب!'' انور نے سوال کیا۔ ''مطلب یہ ہے کہ ہم تم پیسہ کمانے کے لیے سراغرساں کیوں نہ بن جائیں؟''

''لیکن چند جاسوسی ناول پڑھ لینے سے تو ہم مکمل سراغرساں نہیں بن سکتے، تجربہ بھی تو ہونا چاہیے۔

''تو یہ بتاؤ کہ دنیا کے تمام کے تمام سراغرساں کیا تجربہ کے ساتھ پیدا ہوئے تھے؟ تجربہ بھی آہستہ آہستہ ہو جائے گا۔ اصل ضرورت تو تھوڑی بہت بدھی کی ہے۔ سو تھوڑی سی مجھ میں ہے اور بہت سی تم میں۔''

انور یہ سن کر ہنس پڑا۔ ''دوست، کہتے تو ٹھیک ہو۔ ڈاکٹری میں کونسی آمدنی ہو رہی ہے جو سراغ رسانی میں نہ ہوگی۔ چلو یہی تجربہ کر کے دیکھیں۔ میری طبی تعلیم بھی تھوڑی بہت کام آئے

گی اور تمھارا مشاہدہ تو مصوری کی تعلیم سے پہلے ہی تیز ہو گیا ہے۔''

طے یہ پایا کہ احمد بیگ سے بھی مشورہ کیا جائے اور اس کے بعد اخباروں میں اشتہار دیا جائے۔

اس مشورہ کے لیے یہ دونوں دوست آج شام ہندوستان ہوٹل آئے تھے۔ احمد بیگ نے زور شور سے اس تجویز کی تائید کی۔

''ہندوستان میں اس پیشے کی طرف کسی نے آج تک توجہ ہی نہیں کی ہے۔ تم دونوں اس ملک کے پہلے غیر سرکاری سراغ رساں ہو گے۔''

تینوں نے اسی وقت اشتہار کا مسودہ بنایا اور اگلے دن بمبئی کے مشہور اخبار ''اجمل'' میں یہ اعلان شائع ہوا:

خوش خبری

''جو حضرات کسی پیچیدہ مسئلہ یا پر اسرار معاملہ کی تفتیش غیر سرکاری ذرائع سے کرانا چاہتے ہیں وہ ہماری خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔'' ''دو سراغ رساں معرفت ہندوستان ہوٹل''۔

تیسرے دن انور اور رام لال سویرے ہی ڈاک دیکھنے کے لیے ہندوستان ہوٹل پہنچے تو ایک لفافہ ملا۔ تینوں دوست فوراً اوپر جا کر ایک علاحدہ کمرے میں بیٹھے اور خط کو کھولا۔ عجب پر اسرار خط تھا۔ نہایت نفیس کاغذ پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا۔ لکھنے والے کا پتہ ندارد۔ اور لفافہ پر بڑے ڈاک خانے کی مہر تھی۔ مضمون خط کا یہ تھا۔

میں ایک نہایت پر اسرار اور اہم واقعہ کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ میری جان خطرے میں ہے۔ یہ خونی بدمعاش میرے ساتھ سایہ کی طرح لگے ہیں۔ کل (یعنی جس روز آپ کو خط ملے گا) شام کے پانچ بجے میں ہندوستان ہوٹل کے بالائی کمرے میں ملوں گا۔ مجھے پہچاننے میں آپ کو دقت نہ ہو گی۔ میں نیلے رنگ کی شیروانی پر سبز راجپوتی وضع کی پگڑی باندھے ہوں گا۔

خط کے آخر میں ایک سطر بعد میں بڑھائی گئی تھی جس نے تینوں دوستوں کو اور بھی حیرت میں ڈال دیا۔ بظاہر اس کا کوئی مطلب ہی نہ تھا، فقط یہ لکھا تھا۔

''اگر آپ کو جوالا مکھی کے متعلق کچھ معلومات مل سکیں تو ان کو حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔''

''لیجیے۔ پہلا ہی گاہک اس قدر پر اسرار ملا''۔ احمد بیگ نے ہنستے ہوئے کہا۔''ایسا عجب خط تو ایک دفعہ شرلاک ہومز کو بھی حیرت میں ڈال دیتا۔''

دونوں مبتدی سراغ رسانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''جوالہ مکھی تو آتش فشاں پہاڑ کو کہتے ہیں جو ہندوستان میں ہوتے ہی نہیں''۔ رام لال نے کہا۔''مگر یہ سبز پگڑی والے حضرت ہم کو سمجھتے کیا ہیں سراغ رساں یا ماہر جغرافیہ''۔

''ہاں یار! یہ جوالا مکھی کیا بلا ہے اور اس کے متعلق یہ صاحب کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟'' انور نے کہا۔

''یہ اب شام کے پانچ بجے معلوم ہوگا''احمد بیگ نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔ چلو اب تمھارے پہلے گاہک کے اعزاز میں کچھ چائے اڑے''۔

(جوالا مکھی کیا ہے؟ اس پر اسرار خط کا لکھنے والا کون ہے؟ اس کی جان کیوں خطرے میں ہے؟ دو سراغ رساں اس راز کو کیسے حل کرتے ہیں؟ یہ معلوم کرنے کے لیے اس سنسنی خیز ناول کی اگلی قسطوں کا انتظار کیجیے۔) (ادارہ)

نوٹ: مطبوعہ ''طبی دنیا'' دہلی ستمبر 1936

خواجہ احمد عباس (جون 1914 - یکم جون 1987) اردو کے متنوع منفرد ادیب ودانشور تھے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے ومضامین بھی لکھے اور فلم بھی، فلموں کے لیے مکالمے بھی لکھے اور ہدایت بھی دی، سفرنامے وسوانح بھی تحریر کیے اور اخبارات کے کالم بھی۔ وہ ایک نابغہ ادیب تھے اور تصنیف وتالیف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دی ہے۔ 8 جلدوں پر مشتمل اس کلیات میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈرامہ ''لال گلاب کی واپسی'' جو بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا، ایک ساتھ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی شخصیات پر ان کے شائع شدہ مضامین کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ یعنی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نہایت عرق ریزی سے خواجہ احمد عباس کے جملہ کام کو یکجا کرنے کا نہایت معرکۃ الآرا فریضہ انجام دے دیا ہے تا کہ موجودہ اور آنے والی نسل یہ جان سکے کہ ہمارے اکابرین نے سرمایۂ ادبِ اردو کے بیش بہا خزانوں کو کتنی عرق ریزی سے ہمارے لیے خلق کیا ہے تا کہ ہم اس تخلیقی میراث سے نہ یہ کہ صرف اخذ واستفادہ کریں بلکہ اس کو اور بیش بہا بنانے کی سعی بھی کریں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو دنیائے ادب میں فکشن کے ناقد کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے انھیں کلاسیکی ادب سے خاص شغف ہے۔ کمیاب ونایاب متون کی تلاش اور اسے اہتمام کے ساتھ ادبی دستاویز بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اردو دنیا موصوف کے جملہ مقالات وکتب سے بخوبی واقف ہے اور وہ داد وتحسین سے بھی نوازے جاتے رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

ISBN 978-93-87510-29-6
ISBN 938751029-8
9 789387 510296
NCPUL
New Delhi

قیمت -/200 ₹
قیمت سیٹ -/1935 ₹